بسم الله الرحمن الرحيم

فَمَن يُرِدِ ٱللَّهُ أَن يَهْدِيَهُۥ يَشْرَحْ صَدْرَهُۥ لِلْإِسْلَـٰمِ ۖ

وَمَن يُرِدْ أَن يُضِلَّهُۥ يَجْعَلْ صَدْرَهُۥ ضَيِّقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِى ٱلسَّمَآءِ ۚ

كَذَٰلِكَ يَجْعَلُ ٱللَّهُ ٱلرِّجْسَ عَلَى ٱلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ

وَهَـٰذَا صِرَٰطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيمًا ۗ قَدْ فَصَّلْنَا ٱلْـَٔايَـٰتِ لِقَوْمٍ يَذَّكَّرُونَ

قرآن کریم، سوره انعام، آیات ۱۲۵، ۱۲۶

اسلامی علوم ومعارف اور علمی وثقافتی افکار وعقائد کا ترجمان

شمارہ ۲۰۰-۱۹۹، جنوری تا جون ۲۰۰۶

آزادی بیان

خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران

۱۸، تلک مارگ، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۱

فون: ۳۴، ۳۳، ۲۳۳۸۳۲۳۲، فیکس: ۲۳۳۸۷۵۴۷

http://www.iranhouseindia.com

director@iranhouseindia.com

شمارہ ۲۰۰ ـ ۱۹۹، جنوری تا جون ۲۰۰۶

چیف ایڈیٹر: ڈاکٹر محمد حسین مظفری

ایڈیٹر: ڈاکٹر سید اختر مہدی رضوی

مشاورین علمی

پروفیسر سید امیر حسن عابدی، پروفیسر اوصاف علی، پروفیسر شاہ محمد وسیم،
پروفیسر عبد الودود اظہر دہلوی، پروفیسر سید عزیز الدین حسین ہمدانی،
ڈاکٹر سید علی محمد نقوی

مدیر اجرائی: علی غفاری

تزئین جلد: مجید احمدی، عائشہ فوزیہ

صفحہ آرائی: حارث منصور   کمپوزنگ: قاری محمد یاسین

راہ اسلام میں شائع ہونے والے ہر مضمون کے لئے مقالہ نگار خود ذمہ دار ہے۔
مقالہ نویس کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا لازمی نہیں ہے۔
راہ اسلام مقالات و مضامین کے انتخاب و اصلاح وایڈیٹنگ اشاعت کے سلسلے میں پوری طرح آزاد ہے۔
اور اس سلسلے میں ایڈیٹوریل بورڈ کا فیصلہ آخری ہوگا۔
اشاعت کی غرض سے ارسال شدہ مقالہ کا خوشخط ہونا لازمی ہے۔ عبارت کاغذ کے ایک طرف ہی لکھی جائے
اور کاغذ A-4 سائز کا ہو تو بہتر ہے۔
صرف غیر مطبوعہ مقالات ہی ارسال کئے جائیں۔
تحقیقی مقالات کی آمادگی میں جن مآخذ ومدارک کا استعمال کیا گیا ہو۔ ان کا ذکر لازمی ہے۔
مقالہ کے ساتھ اس کا خلاصہ بھی ضرور ارسال کیا جائے۔
راہ اسلام میں شائع شدہ مقالات کی نقل یا ان کے ترجمہ واقتباس کی اشاعت پر کوئی پابندی نہیں ہے
بشرطیکہ مآخذ کا ذکر کردیا جائے۔

پرنٹرس: اے۔ ایس۔ ٹائپ سیٹر، چاندنی چوک، دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۶

فہرست

اداریہ :	ڈاکٹر محمد حسین مظفری	۷
پیغام : عالمی فلسطین کانفرنس سے خطاب	آیت اللہ خامنہ ای	۱۱
گفتگو :		
آزادی بیان کی فکری ونظریاتی بنیادیں	ڈاکٹر محمد حسین مظفری	۲۱
آزادی بیان گول میز مذاکرہ	انڈیا انٹرنیشنل سینٹر، دہلی	۳۳
آزادی بیان : قانونی حق یا مذہبی فرض	مولانا علی محمد نقوی	۶۹
اکبر اور آزادی بیان	پروفیسر عزیز الدین حسین	۸۳
آزادی بیان بحوالہ منشور حقوق بشر و نہج البلاغہ	پروفیسر شاہ محمد وسیم	۸۷
عقاید شناسی :		
امام کی معرفت	علامہ سید محمد حسین طباطبائی	۹۷
عدل الٰہی کے متعلق اسلامی نظریہ	ڈاکٹر سید محمد حسین بہشتی	۱۱۷
تاریخ اسلام :		
ہجرت کے چھٹے سال کے واقعات : باغیان بنی المصطلق	علامہ سید جعفر سبحانی	۱۲۷
حدیث شناسی :		
امام خمینیؒ اور شرح چہل حدیث	ڈاکٹر سید حسین اختر شاہوار	۱۳۵
شعر و ادب :		
شاہ ہمدان کی فارسی غزلیات	پروفیسر شریف حسین قاسمی	۱۵۹

کتابوں کا تعارف : نقد وتبصرہ	تبصرہ نگار	
جدید تفسیر قرآن کا ایک تنقیدی جائزہ	رضا عباس علوی	۱۶۷
Regionalizing Pan-Islamism	پروفیسر شریف حسین قاسمی	۱۷۵
دہلی مدارس و مکاتب اکیسویں صدی کے اوائل میں	ڈاکٹر محمد اختر صدیقی	۱۷۷
مدرسہ کا تعلیمی نظام۔ اس کا استحکام اور کمزوریاں	پروفیسر سیّد محمد عزیز الدین حسین	۱۷۹

ثقافتی سرگرمیاں:

بین الاقوامی سمینار ''صلح در ادبیات فارسی''	دانشگاہ کلکتہ	۱۸۳
طب یونانی میں مہارت وفروغ کے لئے فارسی زبان میں	دانشگاہ عثمانیہ، حیدرآباد	۱۸۵
بین الاقوامی سمینار ''حضرت امیر خسرو دہلوی''	جامیہ ملّیہ اسلامیہ	۱۸۹
بین الاقوامی سمینار ''طنز در ادبیات فارسی''	دانشگاہ دہلی	۱۹۵
بین الاقوامی سمینار'' حدیث ہند در ادبیات فارسی''	دانشگاہ علیگڑہ	۲۰۱
عید میلاد النبی کے موقع پر حجت الاسلام محمود محمدی عراقی کا پیغام		۲۰۵

اقوام عالم کے درمیان دوستانہ تعلقات اور آزادئ بیان

۲۰۰۵ء کے آخری مہینوں کے دوران بعض مغربی ملکوں میں اخباروں اور نشریاتی اداروں نے آزادی بیان کے نام پر مسلمانوں کے مقدسات کی توہین اور ان کے جذبات کو مجروح کرنے کی ایسی شرانگیز اور دل آزار سرگرمیوں کا مظاہرہ کیا کہ ہمیں ''راہ اسلام'' کے موجودہ شمارہ میں آزادئ بیان جیسے عنوان کی صحیح معنویت کو اجاگر کرنے کے لیے ایک مخصوص گوشہ قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ اس اہم موضوع کے مختلف پہلوؤں کا بھرپور مطالعہ اور تجزیہ کیا جاسکے۔ درحقیقت آزادی بیان گذشتہ چند دہائیوں کے دوران نہایت بحث انگیز موضوع رہا ہے۔ اس موضوع پر ہونے والے عالمی مباحثات عالم اسلام اور مغربی دنیا کے درمیان موجود تعلقات پر پوری طرح اثرانداز رہے ہیں۔ اس معرکہ آرائی میں بعض مغربی اداروں کا موقف یہ رہا ہے کہ وہ آزادئ بیان کی آڑ میں اسلامی مقدسات کی بےحرمتی اور الٰہی پیغمبروں کی برہانیت کا سلسلہ جاری رکھیں گے۔ دوسری طرف مسلمان اقوام ہیں جو ان مغربی ممالک کی اور ان نشریاتی اداروں کی اس مذموم حرکت کی تردید کرتی ہیں۔ دنیا کی ان مسلمان قوموں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ اہانت آمیز اقدامات نہ صرف یہ کہ اتفاقی نہیں ہیں بلکہ آزادئ بیان کے نام پر یہ ایک منظّم اور منصوبہ بند سازش ہے جس کو ایک خاص مقصد کے لئے چلایا جارہا ہے تاکہ مسلمانوں کے مجروح جذبات کو برانگیختہ کرکے ان کے ردعمل کو اپنے مخصوص سیاسی اغراض ومقاصد کے لئے استعمال کیا جاسکے۔

ظالم آن قومی کہ چشمان دوختند
زان سخن ھا عالمی را سوختند

یعنی وہ قوم ظالم ہے جس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور اپنی باتوں سے پوری دنیا میں آگ لگادی۔

عدل وانصاف کی طالب مسلمان قومیں ان اسلام دشمن طاقتوں پر جو اعتراضات کررہی ہیں انہیں

مختصر لفظوں میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

پہلا اعتراض یہ ہے کہ اسلامی مقدسات کی اہانت میں سرگرم یہ اسلام دشمن طاقتیں اپنے دعوے میں سچی نہیں ہیں۔ کیونکہ ایک طرف آزادئ بیان کی آڑ میں یہ مسلمانوں کے مذہبی مقدسات کی توہین کو جائز قرار دیتی ہیں اور دوسری طرف ایک نامور مصنف ، مورخ اور مفکر کو ایک علمی و تحقیقی کتاب لکھنے کے جرم میں تین سال کی سزائے قید سناتی ہیں ۔ اس تضاد کو کیسے قبول کیا جا سکتا ہے ؟ ایک محقق اور دانشمند کی سرکوبی کے اس واقعہ کے بعد نہ صرف یہ کہ آزادئ بیان کی حمایت میں ان کا زوردار نعرہ اور مظاہرہ محض ایک جھوٹا اور نمایشی دعویٰ ثابت ہوتا ہے بلکہ ان کی نیت او رصداقت پوری طرح مخدوش ہوجاتی ہے اور ان کی کسی بات پر ایک لحہ کے لئے بھی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ مغربی طاقتیں عالمی سطح پر انسانوں کے درمیان مساوات اور برابری کا بھرپور مظاہرہ کرتی ہیں جبکہ ان ممالک کے داخلی قوانین میں مذہبی امتیاز نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ صرف سرکاری مذہب کے دینی مقدسات کو ہی قانونی حمایت فراہم کی گئی ہے۔ ان میں سے بعض ممالک کے داخلی قوانین میں ممکن ہے کہ کہی گئی بات کے ایک حصہ کو جرم قرار دیدیا جائے۔ ان ممالک کی عدالتوں کے رویہ سے بھی یہ ظاہر ہوچکا ہے کہ بعض شہریوں کے مقدسات کی توہین جرم کے دائرہ میں آتی ہے جبکہ دوسرے شہریوں کے مقدسات کی توہین انعام واکرام کی حامل ہے۔ بات کسی ایک یوروپی ملک کی نہیں بلکہ انسانی حقوق کی یوروپی عدالت ایک مخصوص مقدمہ میں اس مذہبی امتیاز کوتسلیم کرتے ہوئے اس پر اپنی مہر تائید ثبت کرچکی ہے۔

ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ ہم لوگوں کو اس حقیقت کا بخوبی علم ہے کہ آزادئ بیان درحقیقت آزادئ مطلق نہیں ہے بلکہ بہت سے شرائط اور حدود و قیود کی حامل ہے۔ یہ محدودیت دوسرے لوگوں کی آزادی اوران کے حقوق کی حفاظت سے وابستہ ہوسکتی ہے یا اس میں وہ پابندیاں بھی شامل ہوسکتی ہیں جو قانون وروایت کے ذریعہ عائد کی گئی ہوں۔ ادب بیان درحقیقت ادب خاموشی بھی ہے۔ جو شخص آزادئ بیان کے حق کا استعمال کرتا ہے لیکن حق خاموشی کی طرف توجہ نہیں کرتا ہے وہ محض نصف حقیقت سے بہرہ مند ہوتا ہے کیونکہ حکماء کا قول ہے۔

دو چیز طیرہ عقل است دم فروبستن بہ وقت گفتن وگفتن بہ وقت خاموشی

یعنی دو چیزیں عقل کی تیرگی کا باعث ہواکرتی ہیں ۔ ایک کہنے کے وقت خاموش ہوجانا اور

دوسرے خاموشی اختیار کرنے کے وقت گفتگو کرنا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے خاموشی کے موقع پر خاموش رہنا اور گفتگو کے موقع پر گفتگو کرنا ہی عقل کا تقاضا ہے۔

چنانچہ دوسرے بنیادی حقوق کی طرح حق آزادیٔ بیان بھی مختلف بندشوں اور پابندیوں کی تابع ہے۔ اس آزادی سے فائدہ حاصل کرنے والے ہر شخص پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ متعلقہ قانون کے دائرہ میں رہ کر ہی حرکت کرے۔ انسانی حقوق کے جملہ بین الاقوامی ماہرین نے ان پابندیوں پر بڑی تاکید کی ہے اور انسانی حقوق کے بین الاقوامی اعلامیہ کی دفعہ ۲۹ کے بند۔۲ میں یہ بات بڑی وضاحت کے ساتھ موجود ہے جس کا انداز بیان یہ ہے کہ ابتدائی مرحلہ میں جملہ حقوق اور آزادیوں کا ذکر کیا گیا ہے اور آخر میں ایک مجموعی پابندی کا ذکر کیا گیا ہے جس کا اطلاق ان میں سے ہر ایک پر ہوتا ہے۔

" اپنی آزادیوں اور اپنے حقوق کا استعمال کرتے وقت ہر شخص کو ان حدود کا پابند ہونا پڑے گا جو دوسرے لوگوں کے حقوق اور آزادیوں کے احترام کی خاطر نیز جمہوری معاشرہ میں عوامی فلاح و بہبود، عمومی نظم وضبط اور اخلاقی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے قانون کے ذریعہ متعین کی جائیں گی۔"

اسی طرح سیاسی اور سماجی حقوق کی بین الاقوامی قرارداد کی ۱۹ ویں دفعہ میں، جس کو یوروپی ممالک کے ساتھ ہی دنیا کے اکثر ممالک تسلیم کرتے ہیں، آزادیٔ بیان کے ذیل میں انسان کو وسیع حقوق سے مالا مال کیا گیا ہے لیکن اس قرارداد میں آزادیٔ بیان کے حق کے ساتھ لازمی پابندیوں کا ذکر بھی موجود ہے۔

اس قرارداد میں پہلے جملہ حقوق اور آزادیوں کا تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اسی دفعہ میں لازمی پابندیوں کو بھی پیش کردیا گیا ہے۔ سماجی اور سیاسی حقوق کی عالمی قرارداد میں دفعہ ۱۹ کے ذیل میں جو باتیں پیش کی گئی ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ ہر شخص کو کسی قسم کی مداخلت کے بغیر اپنی رائے قائم رکھنے کا حق حاصل ہوگا۔

۲۔ ہر شخص کو آزادی بیان کا حق حاصل ہوگا جس میں افکار وعقائد کی تلاش وتحصیل اور اپنے خیالات کو زبانی، تحریری، اشاعتی، فنی اور دیگر پسندیدہ وسائل ابلاغ عامہ کے ذریعہ دنیا بھر میں پہونچانے کا حق حاصل ہوگا۔

۳۔ اس دفعہ مذکورہ بالا عبارت میں جن حقوق کی بات کہی گئی ہے ان کے ساتھ فرائض اور

ذمہ داریوں کی نشاندہی بھی موجود ہے۔ چنانچہ ان حقوق کا استعمال کرتے وقت ان پابندیوں کی پیروی بھی لازمی ہوگی اور یہ پابندیاں قانونی ہوں گی۔

الف: اپنے حق کا استعمال کرتے وقت دوسروں کے حقوق اور ان کی حیثیت عرفی کا احترام لازمی ہوگا۔

ب: اپنے حق کے استعمال کے ساتھ قومی سلامتی، سماجی امن وامان اور فلاح وبہبود عامہ کی حفاظت کا خیال لازمی ہوگا۔

اسی قرارداد کی دفعہ ۲۰ میں کہا گیا ہے کہ ''جنگ کے لئے کسی قسم کا کوئی بھی پروپگنڈہ قانوناً قطعی ممنوع ہوگا''۔ اس کے علاوہ وہ تمام چیزیں قانونی اعتبار سے ممنوع ہوں گی جن کے ذریعہ قومی، نسلی اور لسانی منافرت کی وکالت کا امکان ہو یا جن سے کسی قسم کے امتیاز، کشمکش، تناؤ اور تشدد کو فروغ حاصل ہو۔

بہرحال اس موضوع کی اہمیت وافادیت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران کی جانب سے انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں ۳۰ ؍اپریل کو ایک ''گول میز مذاکرہ'' کا اہتمام کیا گیا جس میں ہندوستان کے نامور ماہرین قانون، مفکرین اور دانشوروں نے شرکت فرمائی اور اپنے افکار عالیہ سے اس اہم موضوع کی بھرپور وضاحت فرمائی جو خصوصی رپورٹ کی شکل میں اسی شمارہ میں پیش کی جارہی ہے۔

چیف ایڈیٹر
ڈاکٹر محمد حسین مظفری

عالمی فلسطین کانفرنس سے

آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای کا خطاب

بسم الله الرحمن الرحيم

" الحمد للّٰه ربّ العالمين والصّلاة و السّلام على الرّسول الاعظم الامين وعلى اله الطاهرين وصحبه المنتجبين۔"

میں آپ سبھی علماء، مفکرین، سیاسی ماہرین ، اسلام کے اعتقادی اور عملی محاذوں اور سرحدوں کے مجاہدین ومحافظین اور اس عالمی اجتماع کے عزیز مہمانوں کو خوش آمدید کہتا ہوں ۔ آپ لوگ سامراجی سازشوں کے سایہ میں امت اسلامیہ پر ڈھائی گئی عصری تاریخ کی سب سے بڑی مصیبت یعنی فلسطین اور قدس شریف پر غاصبانہ تسلط کے سلسلہ میں غوروفکر اور لازمی چارہ جوئی کے لئے ایک جگہ جمع ہوئے ہیں۔ پیغمبر اکرم حضرت محمّد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلّم کی تاریخ ولادت کے موقع پر اس اجلاس کا انعقاد ہم لوگوں کے لئے اتحاد و وعدۂ الٰہی پر اٹل اعتماد اور آہنی ارادہ کا باعث ہونا چاہیئے اور اس مبارک موقع پر رحمت خداوندی اور نصرت الٰہی کی زمین ہموار ہوجانی چاہئے۔ واضح رہے کہ ملت اسلامیہ ایران موجودہ سال کو" سال پیغمبر اسلام" کے نام سے منسوب کر چکی ہے۔

درحقیقت یہ دور اسلامی بیداری کا دور ہے اور اس اسلامی بیداری میں فلسطین کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔فلسطین پر غاصبانہ تسلط کو تقریباً ۶۰ سال کا عرصہ گزر چکا ہے اور اس طویل مدت میں فلسطینی مظلومین طرح طرح کے مصائب اور آزمائشی مراحل سے گزر چکے ہیں جس میں ابتدائی مرحلہ کی مظلومانہ ومایوسانہ جدوجہد، اجباری مسافرت وآوارہ وطنی، اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے خانہ وکاشانہ کی نابودی، اپنے عزیزوں کا بیرحمانہ قتل عام، اس کے بعد عالمی اور بین الاقوامی تنظیموں کے سایہ میں پناہ گیری ، لاحاصل سیاسی معاملہ بندیوں کی یلغار، غاصبوں کے ساتھ مسلسل خسارہ وشکست پر مبنی مذاکرات اور ان طاقتوں کو واسطہ قرار دینا شامل ہے جو اس سانحۂ عظیم کی تخلیق اور اس کے دوام میں بنیادی کردار ادا کرتی چلی آرہی ہیں۔ ان تاریخی تجربوں کا یہ نتیجہ بر آمد ہوا کہ شجاعت و

شہامت سے مالا مال ملت اسلامیہ فلسطین کی نئی اور ابھرتی ہوئی نسل بیداری و آزادی خواہی کی بلند ترین چوٹی پر پہنچ گئی اور اس نے انتفاضہ کا آتش فشاں رونما کر دیا۔

مخالف محاذ میں بھی مختلف مراحل طے ہوئے ۔ بے لگام اور بے رحمانہ مظالم، نسل کشی، غیر معمولی تباہی و بربادی ، پڑوسیوں پر فوجی حملات ، نیل سے فرات تک کی دعویداری ، دنیائے اسلام کے بعض سیاسی ماہرین کی خیانت و کمزوری سے فائدہ حاصل کرتے ہوئے علاقہ میں سیاسی اور اقتصادی دست درازی، اچانک فلسطین کے خوابیدہ شیر کی بیداری اور انتفاضہ کے سایہ میں اسلامی و انقلابی بیداری سے مالامال وحوصلہ مند وجوشیلی قوم سے ٹکرا گئی۔ جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ امریکی و برطانوی دولت پر منحصر اور ان کی شرمناک حمایت و سرپرستی پر ٹکی ہوئی صیہونی حکومت آج غیر معمولی طور پر متزلزل ومایوسی سے دوچار ہے۔ آج غاصب اسرائیلی حکمرانوں کا مقابلہ اسلامی بیداری سے مالامال جوشیلے فلسطینی نوجوانوں سے ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آج بھی فلسطین غاصب و بیگانہ صیہونی جلادوں کے بے رحمانہ مظالم کا نشانہ بنا ہوا ہے اور حقیقی فلسطینی باشندوں پر وحشیانہ مظالم کی بھرمار ہے۔ صیہونی حکومت نہایت فخر ومباہات کے ساتھ فلسطینی مظلوموں پر اعلانیہ ظلم ڈھا رہی ہے لیکن اگر اس ۶۰ سالہ حادثہ کے طول وعرض پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو حیرت انگیز اور لرزہ براندام کر دینے والے حقائق کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اور وہ دو محاذوں کے مرکز اقتدار میں پھیر بدل اور تبدیلی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ ایک خود فلسطین میں اور دوسرے مشرق وسطی اور دنیائے اسلام میں کیونکہ فلسطین پر غاصبانہ تسلط کا یہ منصوبہ بنیادی طور پر مغربی ماہرین سیاست نے اسی مقصد کے لئے تیار کیا تھا کہ صرف فلسطین ہی نہیں بلکہ اس پورے علاقہ پر ان کا طولانی قبضہ قائم ہو جائے۔

ذرا ۱۹۴۰ء کی دہائی کے دوران فلسطین کے مجموعی حالات کا جائزہ لیجئے ۔ عرب دنیا کے قلب میں واقع یہ سرزمین ایک فقیر ملک کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس ملک کی حکومت بالکل کمزور تھی، عوام بالکل بے خبر اور پڑوسی ملکوں پر سامراجی گماشتوں کی حکومت قائم تھی۔ ایسے ناگفتہ بہ حالات میں اس دور کی انتہائی طاقتور ، دولتمند اور غیر معمولی طور پر مسلح مغربی سامراجی صیہونیوں کی تحریک کا سایہ اس علاقہ کو مسلمانوں سے چھین لیتا ہے اور ایک نسل پرست ، خونخوار اور مکمل دہشت گرد جماعت کے حوالہ کر دیتا ہے۔ اس کے بعد تمام مغربی حکومتیں ہی نہیں بلکہ دنیا کے دو بڑے متخاصم قطب بھی اس جماعت کی حمایت و سرپرستی میں لگ جاتے ہیں اور ایران کی پہلوی حکومت کی طرح علاقہ کی دیگر سامراج غلام

حکومتیں بھی عرب اور اسلام کی طرف سے روگردانی اختیار کرتے ہوئے، اس اسلام دشمن ونسل پرست صیہونی حکومت کی خدمت میں سرگرم ہوجاتی ہیں۔ چاروں طرف سے دولت، اسلحہ اورعلم وصنعت کا ایک بڑا انبار صیہونی حکومت کے سپرد کردیا جاتا ہے۔ امریکہ ایک ماہر وکیل دفاع کی حیثیت سے ہر محاذ پر اس کی بھرپور وکالت میں سرگرم ہو جاتا ہے اور صرف یہی ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے سلسلہ میں سوویت یونین بھی امریکہ کی بالکل مخالفت نہیں کرتا ہے۔جعلی اور لٹیری خصلتوں کی حامل صیہونی حکومت کی طرف سے اقوام متحدہ کے اجلاس میں پیش کی جانے والی قرار دادوں کی طرف سے مکمل لاپرواہی اختیار کی جاتی ہے اور امریکی ویوروپی حکومتوں کی حمایت وسرپرستی میں یہ نوتشکیل شدہ صیہونی حکومت مصر وشام اور جارڈن ولبنان پر فوجی حملہ کردیتی ہے اور ان ملکوں کے کچھ حصوں کو دائمی قبضہ کی نیت سے غصب کرلیتی ہے اور نہایت دیدہ دلیری و بےشرمی کے ساتھ قتل وغارتگری اور لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم رکھتے ہوئے علاقہ کی تمام حکومتوں سے دھمکی آمیز انداز میں گفتگو کرتی ہے اور حکومت کی باگ ڈور یکے بعد دیگرے اس زمانہ کے خوفناک دہشت گردوں کے سپرد کردی جاتی ہے اور ان میں سے آخری ظالم صبر وشتیلا میں ہونے والے وحشیانہ قتل عام کا موجد ہے جس نے ایک دہائی سے بھی زیادہ عرصہ تک فلسطین میں حکومت کی ہے اور اپنے خوفناک اور بے رحمانہ اعمال کے ذریعہ خوف و دہشت کا ماحول قائم رکھا ہے۔

دوسری طرف فلسطینی محاذ پر کمزوری کے ساتھ ابتدائی مرحلہ میں ناکامی اور بے سود ولاحاصل کوششوں کا سلسلہ دکھائی دیتا ہے۔ اور ان میں ہر گروہ اپنی کوششوں کو آزماتا ہے ۔ یہ لوگ قومیت پرستی یامارکسی نظریات اور لائحہ عمل کو بروے کار لاتے ہیں۔لیکن ان میں سے ہر ایک کومکمل ناکامی سے ہمکنار ہونا پڑتا ہے ۔آہستہ آہستہ صبروتحمل اور مجاہدانہ صفات سے مالامال دین مبین اسلام کی پیرو ملت فلسطین کو اپنی سیاہ وغم آلودہ افق پر قدرے روشنی دکھائی دیتی ہے۔ اس روشنی کی وجہ سے اس مظلوم وستم رسیدہ قوم میں کچھ امید پیدا ہوجاتی ہے اور اسی دوران مشرق کی طرف سے اسلامی انقلاب کا سورج نمودار ہوجاتا ہے اور اس الٰہی انقلاب کے بلند پرچم پر خدا اور اسلامی شریعت کے نام کے ساتھ ہی فلسطین کا نام بھی ابھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

اس کے بعد حوادث کے رخ میں غیر معمولی تبدیلی پیداہوجاتی ہے اور غاصب حکومت کے ساتھ ہی ساتھ اس علاقہ میں امریکی تسلط کی راہ وروش روبہ زوال نظر آنے لگتی ہے ۔ واضح رہے کہ گذشتہ

جارحیتوں کے دوران علاقہ پر ہونے والے وحشیانہ مظالم میں امریکہ برابر کا شریک رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے فلسطین اور لبنان میں اسلام پر مکمل عقیدہ وایمان رکھنے والے فلسطینی مجاہدوں کا قافلہ پوری طرح آمادہ دکھائی دینے لگتا ہے ۔ جہاد وشہادت کے فلسفہ کو نئی زندگی حاصل ہوجاتی ہے اور مقابلہ وقربانی کے عزم سے مالامال حقیقی قومی طاقت ابھر کر سامنے آجاتی ہے اور لوگوں میں دشمن کے خلاف جدوجہد اور اس راہ میں ہر ممکن فداکاری کا احساس غلبہ حاصل کرلیتا ہے۔شہادت طلب جوانوں کا مقدس خون اور اپنے جان کی پرواہ نہ کرنے والوں کی میدان جنگ میں بھرپور موجودگی لذت پسند ومادیت پرست دنیا داروں کے تمام محاسبات کو باطل وبے بنیاد ثابت کردیتی ہے۔ ایک ایسا نیا میدان جنگ نظر آنے لگتا ہے جہاں تلوار پر خون کی کامیابی کا منظر صاف دکھائی دینے لگتا ہے، چنانچہ اس غم انگیز حادثہ کے ۶۰ سال بعد آج محاذ حق نئی امیدوں کا حامل دکھائی دیتا ہے اور اس محاذ پر ایمانی طاقت کا بول بالا ہے اور نئی نسل روز بروز اس اسلامی اور ایمانی محاذ کی طرف پہلے سے زیادہ راغب نظر آتی ہے ۔ میدان فلسطین میں تازہ دم اور حوصلہ مند نوجوانوں کی کثرت دکھائی دیتی ہے اور فلسطینی محاذ ہر روز پہلے سے زیادہ طاقتور ہورہا ہے۔ اسی وجہ سے لبنان اور فلسطین میں ان شہادت طلب مجاہدوں کی بدولت دشمن کو لگاتار شرمناک شکست کا منہ دیکھنا پڑ رہا ہے اور مجاہدوں کی یہ جماعت اپنی معرکہ آرائیوں کے سایہ میں فتح مبین کی طرف بڑھتی چلی جارہی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے اپنے اس کلام صادق کے ذریعہ انہیں لوگوں کو خطاب فرمایا ہے" وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغٰانِمَ كَثِيرَةً تَاْخُذُونَهَا فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهِ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ وَلِتَكُونَ اٰيَةً لِلْمُؤْمِنِينَ وَيَهْدِيَكُمْ صِرَاطاً مُّسْتَقِيماً۔"(سورہ فتح۔۲۰)وَاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوا عَلَيْهٰا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهٰا وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرًا(سورہ فتح ۲۱)

دوسری طرف محاذ باطل لگاتار عقب نشینی کے بعد ابتدائی جھوٹی امیدوں سے محرومی کے ساتھ ہی ساتھ غیر معمولی اختلاف وتفرقہ ودیوالیہ پن کا شکار ہے اور اس کی حمایت کرنے والا امریکہ مشرق وسطیٰ میں ناقابل حل پریشانیوں کے دلدل میں پھنسا ہوا ہے اور سردست امریکہ صرف اس علاقے کے لوگوں کی ہی نہیں بلکہ عالمی نفرت وبیزاری کا نشانہ بنا ہوا ہے۔

نیل سے فرات تک کا نعرہ اب نعرہ امنیت وسلامتی میں تبدیل ہو چکا ہے اور سلامتی سے اس دیوار کے اندر کی سلامتی مقصود ہے جو غاصب حکومت نے اپنے اردگرد بنارکھی ہے۔ اور اب فلسطین کی

انقلابی قوم سے مقابلہ کے لئے ٹینک ، بم، دہشت گردی اور قیدوزندان کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ یہ وہی اسلحے ہیں جو گذشتہ دہائیوں میں بھی فلسطینی مظلوموں کے خلاف استعمال کئے جارہے ہیں اور جن اسلحوں کی وجہ سے یہ قوم فولادی شکل اختیار کرچکی ہے اور جن کے آئندہ استعمال کے نتیجہ میں فلسطینی قوم کے ثبات قدم میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

میرے بھائیو ! اور میری بہنو!

آج ملت فلسطین ایک دشوار اور طولانی جہاد کے میدان کے درمیان کھڑی ہوئی ہے۔ یہ فقط جہاد فلسطین نہیں ہے بلکہ اسلامی دنیا کے وسیع جہاد کا نمایاں حصہ ہے جو حملہ آور، ظالم اور غارتگر طاقت کے خلاف ایک لمبی مدت سے جاری ہے ۔ آج اسلامی دنیا پوری طرح بیدار ہوچکی ہے ہر اسلامی ملک میں اسلامی حکومت کی تشکیل کا مطالبہ ملک کے نوجوانوں، دانشوروں ، مفکروں اور یونیورسٹی سے وابستہ طلبا واساتذہ کے درمیان غیر معمولی مقبولیت حاصل کرتا جارہا ہے۔ اسلامی جمہوریۂ ایران ، جو مذہبی عوام کی علمبرداری وسرداری جیسے خیال کا موجودحامی ہے، روز بروز ترقی کی منزلیں طے کرتا جارہا ہے اور اس کی طاقت وتوانائی میں بھی اضافہ ہورہا ہے ۔ حقیقی اسلام جس کو امام خمینیؒ نے انحراف وجمود واجنبیت سے پیراستہ متعارف فرمایا تھا، آج اکثر ممالک کے سیاسی میدان تک دست رس حاصل کرچکا ہے اوراس کی جڑیں اسلامی دنیا کے مشرقی ومغربی علاقوں تک پھیل چکی ہیں۔لبرل مغربی جمہوریت کی تلخ وزہر آلود غذا نے ، جس کو امریکی پروپگنڈہ کے سایہ میں حیات بخش وشفافراہم کرنے والی دوا کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا تھا ، امت اسلامیہ کو غیر معمولی اذیت پہونچائی اور ان کے دلوں کو کافی حدتک مجروح بنادیا۔ ہماری قوم عراق، افغانستان، لبنان، گوانتا ناموء ابوغریب ودیگر علاقوں کے علاوہ سب سے پہلے غازہ اور جارڈن کے مغربی ساحلوں پر مغربی انسانی حقوق اور آزادی جیسی اصطلاح سے بخوبی واقف ہوچکی ہے کیونکہ امریکہ انتہائی بے شرمی وبے رحمی کے ساتھ ان اصطلاحات کی تبلیغ واشاعت میں ہمہ تن سرگرم تھا۔آج اسلامی دنیا میں آزاد خیال جمہوریت اسی طرح منفور اور رسوا ہے جیسے کل مشرقی اشتراکیت اور کمیونزم کونفرت انگیز اور ذلت آمیز نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ آج دنیا کی تمام مسلمان قومیں اسلام کے سایہ میں آزادی ، کرامت اور عزت وترقی حاصل کرنا چاہتی ہیں ۔ یہ مسلمان گذشتہ دوصدیوں کی سامراج غلامی سے تنگ آچکی ہیں اورفقر و ذلت اور مسلط کردہ پسماندگی کی وجہ سے بالکل کمرخمیدہ ہوگئے ہیں۔ ہم لوگوں کو یہ حق حاصل ہے کہ ہم مغربی طاقتوں کی حقارت

اورعظمت پسندی کو انہیں واپس کردیں۔ ہماری قومیں ایسی ہی صادق فکر کی حامل ہیں۔اسلامی دنیا سے تعلق رکھنے والی ہماری موجودہ نسل مشرقی ایشیا سے لیکر قلب افریقہ تک اسی احساس کی حامل ہے اور یہ پیچیدہ رنگا رنگ دشوار اور طولانی جہاد کا میدان ہے اور اگر ہم فلسطین کو اس جہاد کا پرچم کہیں تو ہرگز مبالغہ آرائی نہ ہوگی۔ درحقیقت آج پوری اسلامی دنیا کو چاہیے کہ وہ مسئلہ فلسطین کو اپنا مسئلہ خیال کرے یہ ایسی رمز آلود کلید ہے جو امت اسلامیہ کے لئے کامیابی کے دروازوں کو پوری طرح کھول دیتی ہے۔ فلسطین کو درحقیقت فلسطینی قوم کے حوالہ کردینا چاہئے اور ملک کے تمام فلسطینی باشندوں کے ذریعہ ایک ایسی جمہوری حکومت کی تشکیل عمل میں آنی چاہئیے جو پورے ملک پر حکومت کرے۔ برطانیہ، امریکہ اورصیہونی حکمرانوں نے گذشتہ ۵۰ سال کے دوران اس بات کی بھرپور کوشش کی کہ دنیا کے نقشہ سے فلسطین کا نام نیست ونابود ہوجائے اور فلسطینی قوم دنیا کی دیگر قوموں میں اس طرح گھل مل جائے کہ اس کا کوئی ظاہری وجود باقی نہ رہ جائے۔لیکن ان کی یہ کوشش پوری طرح ناکام ہوکر رہ گئی اور ان کے ظالمانہ دباؤ، ظلم وستم اور قساوت وبے رحمی کا الٹا نتیجہ برآمد ہوا۔ آج ملت فلسطین ٦٠ سال میں پہلے سے کہیں زیادہ زندہ بہادر وطاقتور اور زیادہ کارآمد بن چکی ہے اور یہ صورت حال افتخار آمیز انتفاضہ کے جہاد وایمان کے سایہ میں رونما ہوئی ہے جس کو پوری طرح جاری رہنا چاہئے تاکہ خداوند عالم کا وعدہ پورا ہوسکے۔ ارشاد خداوندی ہوتا ہے۔

”وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰالِحٰاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِی ارْتَضیٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُونَنِی لَايُشْرِكُونَ بِی شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْفٰاسِقُونَ۔“ (نور۔۵۵)

وسیع تر دائرہ یعنی اسلامی دنیا میں بھی اس عظیم مقصد میں کامیابی کا حصول یعنی پرچم اسلام کے سایہ میں سامراجی دخالت، طاقت اور تسلط سے نجات ممکن تو ہے لیکن اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے قسم کا جہاد لازمی ہے اور یہ جہاد علمی ،سیاسی اور اخلاقی جہاد ہے۔ ملت ایران گذشتہ ۲۷ برسوں کے دوران اس جہاد کو بخوبی آزما چکی ہے اور اس کے ذریعہ حاصل ہونے والے شیریں پھلوں سے لطف اندوز بھی ہوچکی ہے۔ اس مقدس جہاد کی بنیاد علم وایمان سے رغبت اور گہرا لگاؤ ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس راہ میں اٹھنے والا ہر مضبوط قدم اپنے بعد اٹھنے والے

قدم کو اور زیادہ استوار اور مستحکم بنا دیتا ہے اور اس کا ہر مرحلہ بعد میں آنے والے مرحلہ کو پہلے سے زیادہ ممکن بنا دیتا ہے۔ جہاد فلسطین ہو یا جہاد عالم اسلام دونوں میں کامیابی کی بنیادی شرط اپنے اصول اور اپنے موقف پر ثابت قدم رہنا ہے۔ دشمن کی ہمیشہ یہی کوشش رہی ہے کہ وہ ہمارے اصول کو ہم سے چھین لے اور ہمیں اپنے حقیقی موقف سے منحرف کردے۔ وہ مکرو فریب ، وعدہ اور دھمکی کے ذریعہ ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ہم اپنے بنیادی اصول سے چشم پوشی اختیار کرلیں۔ اصول سے دوری یا اس میں واقع ہونے والی کمرنگی کی وجہ سے عالم اسلام قائد ورہنما کی امتیازی صفت کو بھول جاتا ہے۔ اس کی بعد وہ آہستہ آہستہ ان اصول وقواعد کا پابند ہوجاتا ہے جو دشمن کے ذریعہ تیار کئے گئے ہیں۔ چنانچہ نتیجہ بخوبی واضح ہے۔ غالباً ہماری قوم کے درمیان ہم میں سے بعض ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو ہمارے اپنے تو ہیں لیکن دشمن کے اصول کی پیروی کی وجہ سے وہ ہم لوگوں سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ان کی طرح ہم لوگ بھی اپنے حقیقی اصول کو ترک کردیں۔ یہ لوگ اپنی اس سفارش کومخصوص تدبیر اور حکمت عملی کا نام دیتے ہیں۔ ان کی نیت کمزوری، غفلت ناسمجھی ، لالچ اور خیانت جس چیز پر بھی منحصر ہو خداوند عالم انہیں اپنے اس کلام کا مصداق قرار دیتا ہے۔

''فَتَرَى الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ يُسَارِعُونَ فِيهِمْ يَقُولُونَ نَخْشَى أَنْ تُصِيبَنَا دَائِرَةٌ فَعَسَى اللَّهُ أَنْ يَأْتِيَ بِالْفَتْحِ أَوْ أَمْرٍ مِنْ عِنْدِهِ فَيُصْبِحُوا عَلَى مَا أَسَرُّوا فِي أَنْفُسِهِمْ نَادِمِينَ۔''(مائدہ ۵۲)

ان لوگوں کو دشمن کی مدد کرنے سے بھی کوئی فائدہ نہیں حاصل ہوتا ہے۔ امریکہ اور مغربی ممالک متعدد بار یہ بات ثابت کرچکے ہیں کہ یہ ان لوگوں پر بھی رحم کرنے والے نہیں ہیں جو ان کے سامنے ہتھیار ڈال چکے ہیں۔ جیسے ان کے ساتھ تعاون کرنے والوں کی تاریخ ختم ہوتی ہے، یہ ان لوگوں کو دور پھینک دیتے ہیں۔

بعض لوگ دشمن کی طاقت کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں اور حق طلب جماعت کو ان لوگوں کے مقابلہ سے خوفزدہ کرتے رہتے ہیں۔ اس بات میں خطرناک مغالطہ پوشیدہ ہے۔ اولاً جس دشمن کے مقابلہ سے عقلمند انسان پرہیز کرتا ہے، وہ ایسا دشمن نہیں ہوا کرتا جو اس کی شناخت، اس کے اہم اور بنیادی مفاد ومصالح اور اس کے وجود کو نشانہ بنائے ہوئے ہو۔ ایسے دشمن کے سلسلہ میں انسانی عقل کا واضح فیصلہ یہ ہے کہ اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے۔ کیونکہ یہ بات بخوبی واضح ہے کہ اس کے سامنے

سرتسلیم خم کردینے کے بعد بھی وہی خسارہ ہونیوالا ہے جس کا احتمال اس کے مقابلہ کی صورت میں ہے۔ البتہ دھمکی سے خوفزدہ ہوکر سرتسلیم خم کردینے میں زیادہ ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آج وہ عالمی سامراج، جس کی ترجمانی امریکی صدر کررہا ہے، عالم اسلام کو اعلانیہ دھمکی دے رہا ہے اور صلیبی جنگ کی بات کرتا ہے۔ دوسری طرف صیہونی سامراجی تبلیغاتی ادارے اور اسلام دشمن جاسوسی میں سرگرم امریکی اور برطانوی تنظیمیں پورے عالم اسلام میں فتنہ انگیزی میں لگی ہوئی ہیں۔ امریکی اور برطانوی دولت اور حوصلہ افزائی کے سایہ میں ابلاغ عامہ کے ذریعہ اسلامی مقدسات کی اعلانیہ توہین کی جارہی ہے۔ اور اب صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ جیسی شخصیت بھی ان لوگوں کے جسارت آمیز پروپگنڈے سے محفوظ نہیں رہ گئی ہے۔ ہزاروں سنیما فلمیں اور کمپیوٹر کھیل منظر عام پر لائے جا چکے ہیں جن کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کے چہرہ کو بدنما اور داغدار دکھایا جاسکے۔ یہ اسلام دشمن فلمیں اور کمپیوٹر کھیل عالمی بازاروں میں موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اسلامی ملکوں پر ان کے ظالمانہ تجاوز، فلسطین وعراق اور افغانستان میں بیگناہ مسلمانوں کا قتل عام اور دنیا کے دیگر اسلامی ملکوں میں اپنے ناجائز سیاسی واقتصادی منافع و مفاد کی حفاظت کی خاطر ان کی مداخلت کا سلسلہ جاری ہے۔

ایسے دشمن کے مقابلہ میں سرتسلیم خم کردینا، عقل کے فیصلہ کی خلاف ورزی ہے۔ درحقیقت عقل وشرع کا فطری فیصلہ یہ ہے کہ ایسے دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے۔ دوسری طرف دشمن کی طاقت میں مبالغہ اس کے اہم ہتھکنڈوں میں سے ایک ہے۔ دولت ، سیاسی اور فوجی طاقت اور جدید ترین اسلحوں کی فراوانی درحقیقت ان حکومتوں کو خوفزدہ کرسکتی ہے جو اپنے عوام کی حمایت وپشت پناہی سے محروم ہیں۔ صدام جیسی حکومتوں پر فوجی حملہ وغلبہ، جس کو نہ اپنے عوام کی حمایت حاصل تھی اور نہ جس کی فوج نے ایمان و جہاد کی خوشبو بھی سونگھی تھی، عظیم طاقت کی دلیل نہیں ہے۔ اس کے باوجود امریکہ عراقی عوام پر غلبہ حاصل کرنے میں پوری طرح ناکام رہا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ عراق نے امریکہ کی جمہوریت پسندی کو آزمائش کی کسوٹی پر لاکر کھڑا کردیا ہے اور عالمی سطح پر اسے ذلت ورسوائی سے ہمکنار کردیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس دعویٰ کی پول کھول دی ہے کہ امریکی طاقت کو شکست نہیں دی جاسکتی ہے ۔ دنیا کی وہ قومیں اور وہ حکومتیں جو اپنے عوام کی حمایت پر منحصر اور اپنے خدا پر اعتقاد وایمان کے سرمایہ سے مالامال رہتے ہوئے ٹھوس اور آہنی ارادہ کے ساتھ دشمن کا مقابلہ

کرتی ہیں وہ کبھی شکست سے ہمکنار نہ ہوں گی۔ جہاد کی دشواریوں کے بعد انہیں کامیابی کا تحفہ یقیناً حاصل ہوگا اور وہ حملہ آور دشمن کے اس جھوٹے افسانہ کو بڑی آسانی سے باطل ثابت کردیں گی کہ اسے کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ فی الوقت اور ماضی قریب میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے اور آنیوالے وقت میں بھی یہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی۔

ایران، عراق، شام اور لبنان کے بارے میں یکے بعد دیگرے امریکی سازشوں کا یہ سلسلہ، جس کا مقصد مشرق وسطیٰ میں صیہونی حکومت کی بالادستی قائم کرنا ہے، ہرگز کامیاب نہ ہوگا، بلکہ اسکی وجہ سے امریکی حکمرانوں کو مہلک نقصانات کا بوجھ اٹھانا پڑے گا۔ اگر امریکی حکومت عقل وخرد اور ضمیر و وجدان کی پیروی کے لئے آمادہ ہوجائے تو اسے عراقی عوام کے مقابلہ میں ہٹ دھرمی سے باز آجانا چاہئے اور ان کی منتخب کردہ حکومت کو ہی معتبر تسلیم کرنا چاہیے، اور فلسطینی عوام نے جو حکومت منتخب کی ہے اس کا باقاعدہ احترام کرنا چاہئیے، اور اپنے ہم معاہدہ باغی وشرپسند یعنی غاصب صیہونی حکومت کو قابو میں رکھنا چاہئیے، گوانتا نامو، ابوغریب ودیگر خفیہ قید خانوں میں رکھے گئے مظلوم قیدیوں کو فوری طور پر آزاد کردینا چاہئیے، شام، لبنان اور اسلامی جمہوریۂ ایران کے خلاف سازشوں سے کنارہ کشی اختیار کرلینی چاہئے اور اپنی نادانی کی وجہ سے خلیج فارس اور مشرق وسطیٰ کے حساس علاقہ کو آگ کے شعلوں کے حوالے کرنے سے اجتناب کرنا چاہئیے۔

آخر کلام میں میں فلسطینی بہادروں اور مجاہدوں سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ تم لوگوں نے جہاد وصبر اور دشمن کے خلاف اپنی مثالی اور درخشاں جدوجہد کے ذریعہ عالم اسلام کو سربلند بنادیا ہے اور تم ایک مثالی قوم کی حیثیت رکھتے ہو۔ مہلک وسنگین مصائب کا یہ بھاری بھرکم بوجھ تمہیں کمر خمیدہ نہیں کرسکا اور تمہارے شہیدوں کے مقدس خون نے تمہارے ثبات قدم کو مزید مستحکم کردیا۔ تمہارا دشمن اپنی سفاکی وبے رحمی، قتل وغارتگری واغواکاری ووحشی گری کے ذریعہ تمہیں اپنے محاذ سے پیچھے ہٹنے پر مجبور نہ کرسکا اور آج تم پہلے سے کہیں زیادہ طاقتور ہو۔ شیخ احمد یاسین، فتحی شقاقی اور رنتیسی جیسے تمہارے عظیم شہیدوں اور شہادت طلب نوجوانوں کا خون اب تک دشمن کی شمشیر پر کامیاب رہا ہے اور انشاءاللہ آئندہ خداوند عالم کی لایزالی طاقت کے سایہ میں اور زیادہ کامیاب رہے گا۔

ہم اسلامی جمہوریہ ایران اور ساری دنیا کے مسلمان اور آزادی پسند انسانوں کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اے آزادی وانسانیت کے پرستارو! ہم لوگ تمہارے شہیدوں کو اپنا شہید اور تمہارے

رنج وغم اور آلام ومصائب کو اپنا رنج وغم اور تمہاری کامیابی کو اپنی کامیابی خیال کرتے ہیں۔ امت اسلامیہ مغربی دنیا کی طرح تمہارے اوپر ڈھائے گئے مظالم کو دیکھنے کے بعد خاموش نہیں رہ سکتی ہے اور نہ تمہارے دشمنوں کے ساتھ دوستی کا ہاتھ بڑھا سکتی ہے۔ جو کوئی ایسا کرتا ہے وہ درحقیقت تمہاری دشمنی کے برابر ہے اور مکمل اعتماد و اطمینان کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ملّت اسلامیہ اس گناہ عظیم سے بہت دور ہے۔ امت اسلامیہ کا یہ فریضہ ہے کہ وہ حتی الامکان تمہاری مدد کرے تاکہ تم اس راہ حق پر آگے بڑھتے رہو اور وعدہ الٰہی پر بھروسہ رکھو۔ اپنے جان لیوا رنج ومصائب جس میں بے گناہوں کا خون ناحق اور ہر روز ڈھائے جانے والے وحشیانہ مظالم شامل ہیں، خداوند عالم کے حساب میں لکھے جاؤ اور سید الشہداء حضرت حسین بن علی علیہما السلام کی طرح جن کی گود میں ان کے شیرخوار بچہ کو زہر آلود تیر سے شہید کردیا گیا تھا، تم بھی اپنی زبان سے یہ کہتے رہو" انما یھون الخطب علی انه بعین الله۔"

اور اچھی طرح سمجھ لو کہ خداوند عالم نے صابر اور مجاہد مومنوں کی کامیابی کی ضمانت دے رکھی ہے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

آزادی بیان کی فکری اور نظریاتی بنیادیں

ڈاکٹر محمد حسین مظفری

ایسا لگتا ہے کہ عصر حاضر میں اور خصوصاً موجودہ حالات میں اب یہ ممکن نہیں رہ گیا ہے کہ گذشتہ افکار و مفاہیم پر مبنی آزادی بیان سے وابستہ اصولوں اور معیاروں کے سایہ میں آزادی بیان کی ضمانت فراہم کی جاسکے۔ حیرت انگیز اقتصادی ترقی، فنی ترقی و وسعت اور وسائل ارتباطات کے غیر معمولی پھیلاؤ کے سامنے انسانی حقوق کے بین الاقوامی چارٹر میں مذکور وموجود اصول وقوانین اور ضمانتیں اب فرسودگی اور کہنگی کا شکار ہوچکی ہیں، اور اب ان میں کوئی خاص اثر باقی نہیں رہ گیا ہے۔

ان مفاہیم کا تعلق اس دور سے ہے جب سیاسی افکار وعقائد کو بیان کرنے کے لئے شہر کے بڑے میدانوں اور مقدس مذہبی مقامات پر منعقد عام اجتماعات میں ہونے والی تقریروں سے کام لیا جاتا تھا۔ مصنوعی سیاروں کی سہولتوں (Sattelite Facility) کے غیر معمولی فروغ اور انٹرنیٹ کے عام ہوجانے کے بعد براہ راست تعلقات اور روبرو گفتگو کی اہمیت گھٹ گئی ہے۔ واضح رہے کہ اجتماعی ارتباط کے وسائل وامکانات تمام شہریوں کو یکساں طور پر حاصل نہ ہوں گے اور ارتباطی تکنیک بھی محض کچھ کمپنیوں پر منحصر دکھائی دے گی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آزادی بیان اپنے گذشتہ معنی ومفہوم کے ساتھ سبھی لوگوں کے لئے فراہم نہ ہوگی۔

یہ صورت حال فقط کسی مخصوص ملت ومملکت کے رہنے والوں تک محدود نہیں رہ جاتی بلکہ بین الاقوامی سطح پر بڑی بڑی مواصلاتی اور اطلاعاتی کمپنیاں عالمی ارتباطات کو چنگل میں لیکر اپنے جادوئی وسائل اور سحر آمیز طریقوں سے اپنے نظریات اور مطالبات کو دنیا کے دورترین علاقوں تک منتقل کرسکتی ہیں اور عالمی رائے عامہ کو اپنے مفاد ومصالح کے لئے ہموار کرسکتی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوجاتا ہے کہ مصرف پسندی (Consumerism) پر مبنی موجودہ ثقافت میں عام شہری جمہوری ذہنیت کے حامل نہیں ہیں لہٰذا ایسی صورت میں یہ کیسے امید کی جاسکتی ہے کہ آزادی بیان معیاری کیفیت کی حامل ہوگی ؟

پس آزادی بیان کے روایتی اصولوں کی بنیاد پر وہ عمومی افکار اور رائے عامہ جن کو مختلف افکار

وعقائد کے درمیان موجود رقابت کے سایہ میں پروان چڑھنا چاہیئے، ایسی تنظیموں اور اداروں کے چنگل میں گرفتار دکھائی دیتی ہے جن کے پاس یہ جادو کی ٹوکری موجود ہے۔ پس لوگ افکار وعقائد کے بازار میں مختلف النوع خیالات سے روبرو نہیں ہیں کہ ان کے درمیان موجود آزادانہ رقابت کے ذریعہ درست اور حق پر مبنی خیالات پر دسترس حاصل کرتے ہوئے اس کا تجزیہ کرسکیں۔ افکار وعقائد کے درمیان آزادانہ رقابت اور افکار کی پیشکش کا حقیقی مفہوم اسی وقت ذہن میں آسکتا ہے جب تمام لوگوں کو اپنے افکار وعقائد کے بیان کے لئے یکساں مواقعہ حاصل ہوں اور جدید مواقعہ دے کر انہیں بھی دیگر لوگوں کی طرح مساوی دسترس فراہم کی گئی ہوتا کہ بوقت ضرورت یہ لوگ بھی اپنے خیالات کا اظہار کرسکیں۔

لیکن ایسے حالات میں جبکہ لوگوں کے اقوال وبیانات کو ساری دنیا تک پہونچانے والی تنظیمیں جملہ وسائل وامکانات پر اپنا قبضہ جمائے ہوئے ہیں اور ان وسائل کے ذریعہ ان اداروں نے عالمی رائے عامہ کو بھی اپنے مفاد میں ہموار کرلیا ہے، مختلف آزاد افکار وعقائد کے درمیان رقابت کی بات بالکل بے معنی وبے مفہوم ہوکر رہ جاتی ہے۔ لہٰذا روایتی مفاہیم کی بنیاد پر تشکیل شدہ آزادی بیان سے جڑے ہوئے اصول وقوانین عام شہریوں کے لئے آزادی بیان کی سہولت کی ضمانت نہیں فراہم کرسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ قوانین ابلاغ عامہ سے وابستہ تنظیموں اور اداروں کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور عام لوگوں کے لئے یہ ایک امر محال ہے کہ وہ ان عظیم اداروں تک رسائی حاصل کرسکیں یا ان عظیم تنظیموں کی رقابت میں اپنے افکار وعقائد پیش کرسکیں۔

اس مقالہ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ آزادی بیان کے سلسلہ میں موجود روایتی اصول وقوانین موجودہ حالات میں کارآمد نہیں ہوسکتے اور ان حالات میں جن ضمانتوں کی پیشین گوئی کی گئی ہے وہ فقط ابلاغ عامہ سے جڑی ہوئی عظیم تنظیموں کے حق میں مفید وموثر ثابت ہوں گی، جبکہ زیادہ تر عام شہریوں کو یہ توفیق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے حقوق کو حاصل کرسکیں۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان روایتی قوانین میں ان لوگوں کے حقوق کی حمایت میں کسی چیز کی طرف ہلکا سا کوئی اشارہ بھی موجود نہیں ہے اور حملہ آور امواج نے ان کی زندگی کی مکمل سلامتی اور فکری وروحانی سکون کو اپنا نشانہ بنارکھا ہے۔

دوسری طرف دیگر اہم مسائل پر غور وفکر لازمی معلوم ہوتا ہے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ہر شخص اپنے

خیالات کا اظہار کرے؟ یا یہ بہتر ہے کہ لغو وبیہودہ خیال کے حامل افراد خاموش رہیں اور فقط اہم پیغام والوں کو اظہار خیال کا موقع فراہم کیا جائے؟ کیا یہ ضروری ہے کہ حکومت جس طرح اقتصادی امور میں آزادانہ مداخلت کرتی ہے اسی طرح افکار وعقائد کے اس بازار میں بھی اسے مکمل مداخلت کی آزادی حاصل ہو؟

آزادی بیان کی جدید توجیہ:

دور جدید سے قبل آزادی بیان کے سلسلہ میں حکام نے سنجیدہ پابندیاں عائد کررکھی تھیں اور ان پابندیوں کی یہ توجیہ بیان کی جاتی تھی کہ جھوٹی اور بے بنیاد اطلاع عوام کی گمراہی کا باعث ہوسکتی ہے وہ حق وحقیقت تک رسائی حاصل نہ کرنے سے محروم ہوجاتے ہیں۔ چرچ نے اس مقصد کے لئے ایک مستقل عدالتی ادارہ قائم کردیا جس کی ذمہ داری تھی کہ وہ تحقیقاتی اور احتسابی کارروائی کے ذریعہ اس قسم کی باتوں کوفوری طور پر ختم کردے اور اسے ہرگز فروغ حاصل نہ ہونے پائے۔ یہ ادارہ مختلف یورپی ممالک میں پوری طرح سرگرم عمل رہا اور خصوصی طور پر ان ملکوں میں اس ادارہ کی کارکردگی اچھی رہی جہاں سماجی حکمراں طبقہ کی طرف سے اس ادارہ کی خاطر خواہ حمایت کی گئی۔ اکثر کہاجاتا ہے کہ Giordano Bruno وہ آخری شخص تھا جس کو ۱۶۰۰ء میں روم سے حاصل شدہ احکام کے بموجب بدعتی یا مسلمہ عقائد کے خلاف کوپرنیکانیسکی افکار وعقائد رکھنے کی وجہ سے زندہ جلا دیا گیا تھا۔ اسی زمانہ میں پرنٹنگ پریس کی ایجاد ہوئی اور دیکھتے دیکھتے اسے غیرمعمولی فروغ بھی حاصل ہوگیا اور پریس کی ترقی کی وجہ سے چرچ اختلاف واحتجاج کی آواز کو دبانے میں پوری طرح کامیاب نہ ہوسکا۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ مارٹن لوتھر نے اس نظام کے خلاف کامیاب جدوجہد کی اور Protestant نامی اصلاحی جماعت کی تشکیل میں کامیاب ہوگئے۔

مغربی یورپ میں سیاسی آزادی کی جدوجہد میں ''آزادی بیان کی جدوجہد'' کو مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ انگریزی زبان کے مشہور شاعر جان ملٹن نے پریس کی آزادی کا دفاع کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ پریس کی آزادی انسانی زندگی کے لئے اتنی ہی لازمی ہے جتنی ملک وملت کی ترقی اورحق کی تلاش وجستجو۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ کسی کوحق کی رسائی اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک وہ تمام افکاروعقائد کا باقاعدہ تجزیہ نہیں کرتا۔ اس کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ تجزیہ کے دوران اسے

حق کے انتخاب و اختیار کی مکمل آزادی حاصل ہو۔ اس کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ سچائی کھلے مقابلہ میں جھوٹ پر مکمل غلبہ حاصل کرے گی۔

آزادی بیان کو ایک لمبی مدت سے ایک بنیادی حق کی حیثیت حاصل رہی ہے اور دیگر حقوق کے حصول واستعمال کا دارومدار بھی اسی حق پر رہا ہے۔ تاریخی بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے اوائل میں جیمس مِل (James Mill) اور ان کے فرزند جان اسٹوارٹ مل (John Stuart Mill) دونوں نے آزاد پریس اور رعایہ یا عوام الناس کے سلسلہ میں حکومت کو متوجہ رکھنے میں اس کی اہمیت وافادیت اور ظلم وناانصافی کی روک تھام میں پریس کے اہم اور موثر کردار کے سلسلہ میں اپنے مقالات لکھے۔ بعد میں لکھے گئے اپنے ایک مقالہ میں جس کا عنوان''آزادی'' تھا ، جان نے آزادی کے سوال پر تفصیلی بحث کی اور اپنی گفتگو کو محض پریس کی آزادی تک ہی محدود نہیں رکھا۔ انہوں نے ہر طرح کی اطلاع اور ہر قسم کے مخالف وموافق بیانات اور مخالف افکار وعقائد حتی جھوٹے بیانات پر بھی توجہ دینے کی بات کہی۔

جان ایس مل نے''خیالات کے بازار'' کا تصور پیش کرتے ہوئے لوگوں کی انفرادی آزادی فکر پر کم سے کم پابندی کی بات کہی۔ بازاری اقتصاد میں مختلف النوع چیزیں خریداروں کے سامنے پیش کی جاتی ہیں اور لوگوں کو سب سے اچھے سامان کی خریداری کی سہولت فراہم ہوا کرتی ہے اور کم اچھا اور گھٹیا قسم کا سامان بازار خود ہی رد کردیا کرتا ہے۔ اسی طرح افکارو خیالات کے بازار میں بھی خیالات کے درمیان مقابلہ کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہئے۔ آخر کار سچائی کو تمام جھوٹے اور بے بنیاد خیالات پر فاتح کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آنا ہے۔ لوگ خود بخود برے یا معیاری اعتبار سے کمتر خیالات کو رد کردیں گے۔ دنیائے بشریت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ صحت مند ، انسانیت دوست اور حقیقی تخلیقی افکار وعقائد کو اپنی آئندہ نسل کے حوالے کرے۔

انہوں نے آزادی فکر کی حمایت میں اپنے بیان کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے فرمایا: اب ہم لوگوں کو اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہوگیا ہے کہ انسان کے لئے ذہنی صحت وسلامتی کتنی ضروری ہے اور انسان کی جملہ فلاح وبہبود کا انحصار ذہنی سلامتی پر ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح آزادی فکر اور فکر کے بیان کی آزادی کا مسئلہ ہے جس کی تشریح درج ذیل چار مختلف بنیادوں پر کی جاسکتی ہے:

سب سے پہلی اور اہم بات یہ ہے کہ اگر کسی آزاد خیال کو زبردستی خاموش کردیا جاتا ہے تو اس میں اس بات کا امکان بھی ہوتا ہے کہ کچھ باتیں حق وحقیقت پر مبنی ہوں اور اگر ہم اس خیال کی تردید کرتے ہیں تو ہمیں اپنی معصومیت کا اعتراف کرلینا چاہئے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ہوسکتا ہے کہ جس آزاد خیال کو خاموش کردیا گیا ہے، وہ غلط تو ہوسکتا ہے لیکن ایسا بھی ممکن ہے اور اکثر دیکھا بھی گیا ہے کہ اس پورے بیان کا کچھ حصہ حق وصداقت پر مبنی ہو۔ اور بالعموم یہی ہوتا ہے کہ کوئی بھی عام بیان چاہے وہ کسی موضوع پر ہو، ہمیشہ صددرصد سچائی کا حامل نہیں ہوتا ہے۔ درحقیقت برے افکار وعقائد کے درمیان ٹکراؤ کی صورت میں جو چیز باقی رہ جاتی ہے وہ کبھی کبھی ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ حاصل شدہ فکر کو سچی ہی نہیں بلکہ بالکل سچی ہوکہنے دیجئے۔ جب تک اس بیان کی مکمل تصدیق نہ ہوجائے زیادہ تر لوگ اس کو بینش داوری کا نام دیں گے اور اس کے حقیقی مفہوم میں بھی شک وتردید سے کام لیں گے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ چوتھی بات یہ ہے کہ بنیادی اصول کا مفہوم بھی خطرہ میں پڑجائے گا۔ دوسرے لفظوں میں یہ سمجھ لیجئے کہ یا تو بنیادی اصول کا اصل مفہوم پوری طرح نابود ہوجائے گا اور اگر ایسا نہ ہوا تو اس میں کمزوری کا پیدا ہوجانا یقینی ہے۔ جس کے نتیجے میں لوگوں کے کردارو اخلاق پر اس کا جواثر مرتب ہونے والا ہے وہ بالکل ختم ہوجائے گا۔ کلیسا کے مقررہ عقائد صرف پیشہ ورانہ، نیک امور میں بالکل غیر موثر ہوجائیں گے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اسکی وجہ سے دل کی گہرائیوں سے نکلنے والے اور ذاتی تجربہ ومنطقی دلائل کے نتیجہ میں ابھر نے والے حقیقی افکار وعقائد کے فروغ میں بھی رکاوٹ کا پیدا ہونا کسی حدتک یقینی ہے۔[1]

موجودہ حکومت کا مشن:

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ موجودہ حکومت ماورائی حقیقت اور اپنے شہریوں کی نجات وبہبودی کے سلسلہ میں کوئی جدوجہد نہیں کرتی ہے۔ اکثر غیر جانبداری کے بہانہ وہ ایسے امور ومعاملات کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہوتی جس کا تعلق انسانی وجود، اصل مقصد اور اخلاق سے ہوا کرتا ہے۔

1.Asian Age, International News, New Delhi, May 3,2006, page.8.

درحقیقت آزادی کے حق کے استعمال کے سلسلہ میں پہلی اور اہم پابندی دوسرے لوگوں کی مختلف النوع آزادی اور حقوق ہیں۔ اس موقع پر یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ آزادی کا عدل وانصاف سے گہرا تعلق ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ دونوں کے درمیان ایک منطقی توازن قائم رکھنے میں غیر معمولی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جدید نظریہ بعض سیاسی اور مدنی حقوق کے سلسلہ میں حکومتی مشن کے دائرہ اختیار میں کمی پیدا کردیتا ہے۔

آزادی کی یہ تعریف بیان کی گئی ہے کہ ہر فرد کو اپنی خواہش کے مطابق کسی کام کو انجام دینے یا انجام نہ دینے میں اپنی صلاحیت کے استعمال کا حق حاصل ہو بشرطیکہ اس کے عمل سے دوسرے کے حقوق پامال نہ ہو رہے ہوں اور قانون نے جو حدود قائم کی ہیں ان کی خلاف ورزی بھی نہ ہوتی ہو۔ نامور فلاسفہ اور ماہرین علم ودانش نے آزادی کے مثبت اور منفی پہلوؤں کی مکمل نشاندہی کردی ہے۔ مثبت آزادی کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ فرد کو اپنی صلاحیت کو عملی جامہ پہنانے کا مکمل حق حاصل ہونا چاہئے۔ بالکل اسی طرح منفی آزادی کی تعریف میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی فرد یا شخص کی راہ میں کوئی کسی قسم کی رکاوٹ نہ پائی جاتی ہو۔ بعنوان مثال تھومس ہوبس (Thomas Hobbes) کے مطابق فرد واحد اس کام کو کرنے کے لئے آزاد ہو جس کو انجام دینے میں کوئی قانونی خلاف ورزی نہ پائی جاتی ہو۔ اس کے علاوہ وہ دیگر مسائل کے سلسلہ میں پوری طرح خاموش دکھائی دیتے ہیں۔ منفی آزادی کے سلسلہ میں موجود فلسفیانہ خیال فرد واحد کی اس انفرادی آزادی کی طرف اشارہ کرتا ہے، جس پر دوسروں کی حاکمیت پائی جاتی ہو۔ اس منفی خیال کے بموجب ایک شخص اس حد تک آزاد تسلیم کیا جاتا ہے جس حد تک کوئی شخص اس کے کام میں مداخلت نہیں کرتا۔

''منفی آزادی'' اور مثبت آزادی'' کے درمیان Isaiah Berlin نے اپنے'' آزادی کے دو بنیادی خیالات'' نامی مقالہ میں باقاعدہ خط فاصل قائم کردیا ہے۔ انکا خیال ہے کہ سیاسی روایت میں یہ فرق وامتیاز کافی گہرا ہے۔ منفی آزادی کا تصور درحقیقت برطانیہ کے سیاسی فلاسفہ مثلاً Locke، Hobbes اور Mill سے وابستہ رہا ہے جبکہ مثبت آزادی کے تصور کی وابستگی ہیگل، روسو، ہرڈر اور مارکس جیسے یوروپی دانشوروں سے تھی۔

مابعد جدیدیت راہ وروش:

درحقیقت ''بازارچۂ افکار'' کا تصور پیش کرنے والے دانشوروں کا سب سے اہم خدشہ یہ رہا ہے کہ گمراہی پھیلانے والے افکار وعقائد کی ترویج کی وجہ سے لوگ بڑی تعداد میں اس گمراہی میں پھنس کر رہ جائیں گے۔ دوسری عبارت میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ گذشتہ زمانہ میں سماج کے سیاسی مفکرین اور رہنما وں کو صرف حق وباطل کی شناخت کا خطرہ تھا اور ان کی نگاہوں میں دنیا کے تمام مسائل نوروظلمت ، سعادت وشقاوت یا سفید وسیاہ کے درمیان تقسیم شدہ تھے۔لیکن آج جو چیز موضوع بحث اور باعث تشویش ہے وہ انسانی زندگی کے ماحول اور اس کے اردگرد موجودہ فضا ہے جو سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں رنگ کی حامل نظر آتی ہے۔

پس بازارچہ افکار سے وابستہ استدلال اپنے جملہ مثبت پہلوؤں کے ساتھ Post Modern دور کے تقاضوں کو پورا نہیں کرسکتا ہے اور آزادی بیان کے بنیادی نظریہ کا مسئلہ پہلے کی طرح اپنی جگہ پر باقی رہ جاتا ہے اور اس سے جڑے ہوئے قانون کی بات بھی باقی رہ جاتی ہے۔ کیونکہ تکنیکی ترقیوں اور شعبۂ اطلاع رسانی میں رونما ہونے والی غیر معمولی کامیابیوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے اب اس نظریہ کو پہلے سے تسلیم نہیں کیا جاسکتا ہے کہ شہر کے تمام باشندوں کو اپنے افکاروعقائد کے اظہار کے جملہ امکانات فراہم ہیں اور انہیں مساوی طور پر آزادی بیان کا حق حاصل ہے۔ یہ مفروضہ اب بالکل ختم اور پوری طرح بے معنی ہوچکا ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ارتباطی امکانات اب ابلاغ عامہ سے جڑی ہوئی بعض تنظیموں پر منحصر ہوچکے ہیں ۔ چنانچہ ایسا مفکر جس کے پاس دولت وثروت کی کمی ہے یا کسی پارٹی میں بلند مقام ومرتبہ کا حامل نہیں ہے، اپنی بات کو دوسرے لوگوں تک نہیں پہونچا سکتا ہے چاہے اس کی بات استدلال کے قوی ترین اصولوں کے مطابق ہی کیوں نہ ہو اور اس میں ہر ممکن خوبیاں بھی پائی جاتی ہوں!

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ابلاغ عامہ سے جڑی ہوئی ان نشریاتی تنظیموں نے آزادی بیان کو سیاسی بیان اور اس کے مختلف مباحث کے دائرہ سے باہر نکال کر تجارت کے میدان میں داخل کرچکی ہیں جس کی وجہ سے یہ موثر اور سودمند تجارت میں تبدیل ہوگئی ہے، جس کا فطری نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ آزادی بیان سے مربوط رزمیہ اور روایتی مفاہیم روبہ زوال ہوگئے ہیں اور لوگوں کا ذہن ان جدید

ترین جادوگروں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے اور صورتحال یہ ہوگئی ہے کہ اس وقت ہم لوگ جو کچھ پڑھتے، سنتے، دیکھتے اور بحث وتجزیہ کرتے ہیں وہ سب کچھ ان تنظیموں کی ہدایت اور کنٹرول میں انجام پاتا ہے۔ آج ہم لوگ اس مال اور سازوسامان کے مصرفی کی حیثیت رکھتے ہیں جو ان نشریاتی اداروں سے شائع ہونے والے پروگراموں کے دوران پیش کئے جاتے ہیں۔ اگر ٹیلیویژن یا انٹرنیٹ پر پیش کئے گئے پروگراموں کے خلاف کوئی چیز لکھی یا پیش کی جاتی ہے تو اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی ہے۔

بازاری نظام ایسے مطالبات کی ایجاد کرتا ہے جو آمادہ مال وساز وسامان پر منحصر ہو۔ ان چیزوں کے زیادہ سے زیادہ استعمال اور ان سے حاصل ہونے والے فائدہ کی طرف خصوصی توجہ دی جاتی ہے اور فائدہ کمانا ہی اس کا بنیادی مقصد ہوا کرتا ہے ۔ دوسرے لفظوں میں ہم لوگوں کے افکار وعقائد ''نظام تضارب آراء'' کی بنیاد پر افکار وعقائد کے بازار میں تشکیل نہیں پاتے ہیں بلکہ یہ ان موضوعات پر مشتمل ہوا کرتے ہیں جو بازار کی طرف سے ہم لوگوں کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں جن کا استعمال یقینی ہوا کرتا ہے۔ ہم لوگوں کو یہ امید ہرگز نہ کرنی چاہئے کہ یہ نشریاتی تنظیمیں اس سود مند تجارت سے دستبردار ہوکر ایسے شعبوں میں داخل ہوجائیں گی جہاں معدودے چند روشن فکر اور حاکم نظام کے سیاسی مخالفین کا خطرہ لگا ہوتا ہے جو یہ نہیں چاہتے کہ لوگ فطری راہ وروش پر گامزن رہیں۔

روبرٹ اور ماک چسنی نے اپنی کتاب ''دولتمند نشریاتی ادارے اور فقیر جمہوریت'' میں پیداوار سے جڑے ہوئے بازاری نظام کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ سابقہ زمانہ میں شہروں میں متعدد رسائل اخبارات شائع ہوا کرتے تھے اور ان اخباروں کے کچھ کالم نوکری اور کاریگری میں دلچسپی رکھنے والے لوگوں کے لئے مخصوص ہوا کرتے تھے۔ لیکن آج صورت حال بالکل تبدیل ہوچکی ہے۔ آج اخبار اور تجارت دونوں ایک دوسرے کے مترادف مفہوم کے حامل بن چکے ہیں اور تجارتی خبر کو آج سب سے زیادہ اہم اور حقیقی خبر کا درجہ حاصل ہوچکا ہے ۔ وہ موجودہ اخباری روش سے عدم اطمینان ظاہر کرتے ہوئے سوالیہ انداز میں لکھتے ہیں کہ آخر اس قسم کے اخبار سے کتنے فیصد لوگ متاثر ہونے والے ہیں؟

پس جیسے جیسے آزادی بیان کی حمایت میں قانونی ضمانتوں میں اضافہ ہوتا رہے گا، ان تجارتی

کمپنیوں کے اختیارات اور اقتدار میں بھی اضافہ ہوتا چلا جائے گا اوراس کا فطری نتیجہ یہ ہوگا کہ آزادی بیان کے سلسلہ میں جو روایتی قوانین پائے جاتے ہیں ان کا فائدہ بھی انھیں کمپنیوں کو ہوگا۔ پس غور سے دیکھا جائے تو بظاہر یہ قوانین تمام لوگوں اور شہریوں کے لئے وضع کئے جاتے ہیں اور قانونی اعتبار سے دیکھا جائے تو ان قوانین سے تمام لوگوں کو مساوی فائدہ حاصل کرنے کا حق دیا گیا ہے۔ اب اگر زیادہ تر لوگ اپنے اس حق سے فائدہ نہیں اٹھاتے تو ان کی آواز خود بخود خاموش ہوکر رہ جاتی ہے۔ اگر سماج کے کچھ لوگ بھی اپنے اس حق سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آزادی بیان سے کام لیں تو بھی ٹھیک ہے لیکن اگر کوئی سننے والا موجود نہ ہوتو پھر اس بات کے کہنے کا کیا فائدہ ہوسکتا ہے؟

نظریۂ بازارچۂ افکار کا دوسرا مسلمہ یہ ہے کہ مدنی معاشرہ میں مختلف النوع افکار وعقائد کی وجہ سے معاشرہ کی عظمت وبلندی میں اضافہ کے امکانات فراہم ہوجاتے ہیں اور لوگوں کے افکار وعقائد کے درمیان موجود اختلافات اور ٹکراؤ کی وجہ سے جموریت کے بنیادی اصولوں کی تقویت بھی ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اطلاع رسانی کی تکنیک میں حاصل شدہ غیر معمولی ترقی کی وجہ سے سماج کے جملہ معاملات میں سب لوگوں کی شرکت کے بجائے متمدن معاشرہ کے زوا ل کے اسباب فراہم ہونے لگے ہیں۔ اس سماج کے مختلف افراد کے درمیان براہ راست اور روبرو تعلقات کے امکانات مفقود ہوکر رہ گئے ہیں۔ ایسے حالات میں افکار وعقائد کے بازار میں مختلف خیالات پیش کرنے کی نوبت ہی نہیں آنے والی ہے۔

اقتصادی وسعت وترقی بھی ان اسباب وعوامل میں سے ایک ہے جن کی وجہ سے ہماری سیاسی باتوں کی اہمیت گھٹتی چلی گئی۔ فقط یہی نہیں بلکہ اقتصادی ترقی کی وجہ سے لوگ اجتماعی شرکت کے بجائے انفرادی اور خصوصی شرکت کو ترجیح دینے لگے۔ جب لوگوں کا زیادہ تر خالی وقت جادوئی پٹارہ کے سامنے ختم ہونے لگتا ہے تو پھر مصرف پسندی کی تبلیغ واشاعت اور وقت گزاری انکا اہم ترین فریضہ بن جاتا ہے ۔ اس کے بعد ان لوگوں کو انٹرنیٹ کی عنکبوتی بارگاہ میں بھی حاضری دینی ہے اوراس 'عبادت خانہ' میں مختلف قسم کے نئے نئے 'معبودوں' کا جلوہ دیکھنا ہے۔ پھر اس کے بعد اتنا بھی وقت باقی نہ رہ جائے گا کہ وہ کسی کی بات سن سکیں۔ ایسے میں معاشرہ کے مختلف معاملات میں ان لوگوں کی عملی شرکت تو محض خواب خیال کی بات بن کر رہ جاتی ہے۔

ان نشریاتی تنظیموں نے عام شہریوں کو سماجی امور میں شرکت سے پوری طرح محروم کررکھا ہے۔ ٹیلی ویژن سیریل اور تجارتی تبلیغات نے مصرف پسندی کی خوفناک لہروں سے ہم آہنگ ہوکر لوگوں کو عام مباحثات میں شریک ہونے سے محروم کردیا ہے۔ یہاں تک کہ خود ہمارے ملک میں مساجد اور دیگر مذہبی پروگراموں کی عمومی نوعیت بالکل تبدیل ہوکر رہ گئی ہے اور جماعتی صورت میں انجام پانے والے امور خصوصی صورت میں انجام پارہے ہیں اور گھریلو ماحول میں ایسی تبدیلی آگئی ہے کہ خاندان کے مختلف افراد کو ایک دوسرے سے گفتگو کا موقع کم ہی حاصل ہوتا ہے۔

درحقیقت اس طرح کی تفریحات سے اس خطرہ کا احساس ہونے لگا ہے جس کی طرف سماجی علوم کے ماہرین مفکرین نیم صدی پہلے سے برابر اشارہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ مثلاً آلدوس ہاکسلی نے ''نئی اور نڈر دنیا'' عنوان سے ایک ایسا کابوس (Nightmare) آمادہ کیا ہے جس میں حکومتوں کو اس بات کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی کہ وہ اپنے مخالفین کی باتوں پر پابندی عائد کریں یا اسے اس بات میں کوئی دلیل نہیں دکھائی دیتی ہے کہ وہ حقیقت کو پوشیدہ رکھیں اور لوگوں پر عام مذاکرات ومباحثات منعقد کرنے پر پابندی لگادیں کیونکہ لوگ مختلف قسم کے پروگراموں میں اس قدر سرگرم ہوگئے ہیں کہ ان میں ان مباحثات کو سننے اور اس میں شرکت کرنے کا حوصلہ ہی باقی نہیں رہ گیا ہے۔

ہاکسلی کی دنیا میں موجودہ الیکٹرانیکی سرگرمیوں کے درمیان ٹیلی ویژن نے خواہش، لذت اور لطف اندوزی کی ایک دنیا پیدا کردی ہے۔ اس دنیا میں حکومت کو صرف اس بات کی فکر و تجسس ہے کہ ہر آدمی کے لئے خصوصی سرگرمی کا اہتمام ہو تاکہ تمام لوگوں کے لئے شادمندی وخوشحالی کا احساس پیدا کیا جاسکے۔ زندگی حیرت اور مسائل کی الجھی ہوئی گتھی کی طرح ہوگئی ہے اور سماج کے بنیادی مسائل کی طرف سے غفلت اور غیر معمولی لاپرواہی برتی جارہی ہے۔ افکار وعقائد کے بازار کا منصوبہ بنانے والے اس بات کی پیشین گوئی ہرگز نہیں کرسکتے تھے کہ ایک دن آزادی بیان پر مبنی ان کا خیال بیکار اور بے سود ہوکر رہ جائے گا۔ آزادی بیان کی قدر وقیمت اس وقت محسوس کی جاسکتی ہے جبکہ سماج میں آزادی فکر پائی جاتی ہو۔ موجودہ زندگی میں لوگ مختلف قسم کی سرگرمیوں میں لگے ہوئے ہیں اور ایسی مصرفی زندگی میں مشغول ہوگئے ہیں کہ انہیں فکر کرنے کی فرصت ہی نہیں مل رہی ہے۔ بلکہ آج ان کی زندگی، کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا بلکہ یہ کہا جائے کہ خوراک ہو یا لباس یا دیگر امور زندگی کے ہر شعبہ

میں وہ لوگ مغرب کی بڑی بڑی سرمایہ دارانہ کمپنیوں کی ہدایت ورہنمائی کے سایہ میں جی رہے ہیں۔

آزادی مطبوعات کی حمایت کرنیوالے فقط دو احتمالوں کے سلسلہ میں پیشین گوئی کیا کرتے تھے۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ تبلیغ یا پروپگنڈہ یاتو حقیقت پر مبنی ہوگا یا جھوٹ اور بے بنیاد ہوگا۔ یہ لوگ اس بات کی پیشین گوئی نہیں کرسکے جو واقع ہونے والی تھی۔ وسائل ابلاغ عامہ کے میدان میں رونما ہونے والی غیر معمولی ترقی بالخصوص مغربی سرمایہ داری پر مشتمل جمہوریتوں میں نشریاتی وسائل کی پیشرفت میں پیغام کے حق وباطل ہونے سے کوئی سروکار نہ تھا بلکہ غیر واقعی یا کم وبیش غیر مربوط چیزوں سے ربط دے دیا جاتا تھا۔ مختصر لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے والے لوگوں کو اس بات کا صحیح اندازہ ہوسکتا تھا کہ بیہودہ کاموں میں انسان تقریبا لامحدود حد تک بھوکا ہوا کرتا ہے۔

واشنگٹن میں کیئے گئے ایک تحقیقی جائزہ کی رپورٹ کی روشنی میں یہ بات اور زیادہ واضح ہوجائے گی۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ امریکہ گذشتہ تین برسوں سے عراق میں جنگ لڑ رہا ہے لیکن دس امریکی نوجوانوں سے جب یہ سوال کیا گیا کہ کیا دنیا کے نقشہ میں وہ عراق کی نشاندہی کرسکتے ہیں تو ان میں سے چھ لوگ عالمی نقشہ میں عراق کی نشاندہی نہیں کرسکے۔

ان امریکی باشندوں کو اپنے ملک کے بارے میں تو بہتر اطلاعات ہیں لیکن ان لوگوں کو کسٹرینا طوفان کے دوران ہونے والے نقصانات کا صحیح اندازہ بھی نہیں ہے۔ ایک سروے کے دوران ایک تہائی امریکی لوگ جن کی عمر ۱۸سال سے ۲۴ سال کے درمیان تھی، Lousiana نامی جگہ کی نشاندہی نہیں کرپائے جبکہ آدھے سے زیادہ امریکی Mississippi کی شناخت نہیں کرسکے۔ یہ سروے قومی جغرافیائی خواندگی مشن کی جانب سے کیئے گئے۔ روزنامہ Asian Age کے جناب Rondolph E. schmid کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ اس سروے پروگرام کے تحت دسمبر اور جنوری میں ۵۱۰ لوگوں کا انٹرویو لیا گیا۔ ان میں سے ایک تہائی افراد Lousinia کو امریکی نقشہ میں نہیں ڈھونڈ پائے۔ ۴۸% فیصد لوگ Mississppi کی نشاندہی سے عاجز رہے۔ دس میں سے تین لوگوں نے یہ کہا کہ خبروں میں جن علاقوں کے نام لئے گئے ہیں ان کے بارے میں معلومات ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح دوتہائی امریکی لوگوں کو یہ نہیں معلوم کہ اکتوبر ۲۰۰۵ عیسوی میں پاکستان میں رونما ہونے والے زلزلہ میں ۷۰ ہزار لوگوں کی موت واقع ہوگئی اور دس میں سے ۶ لوگ مغربی ایشیا کے نقشہ میں عراق کی نشاندہی نہیں کرسکے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ لاعلمی وناواقفیت کا

یہ عالم ہے کہ اسرائیل فلسطین تنازعہ کا ذکر گذشتہ نصف صدی کے دوران سبھی لوگ سنتے چلے آرہے ہیں، لیکن ۷۵ فیصد امریکی انھیں وسطی ایشیا کے نقشہ پر اسے نہیں تلاش کرسکے۔[۱]

اس رپورٹ کی روشنی میں آزادی بیان کی قلعی کھل جاتی ہے۔ درحقیقت اس سے پہلے بھی عرض کیا جاچکا ہے کہ آزادی بیان کے لئے آزادی فکر ایک لازمی عنصر کی حیثیت رکھتا ہے ۔ آزاد و پرسکون ماحول میں غوروفکر کے بعد جو بیان سامنے آئے گا اس میں یقیناً انسانی فلاح وبہبود کا خاص خیال رکھاجائے گا۔ لیکن اگر انسان کی فکر دیگر معاملات میں مشغول ہو اور اس کے پاس لازمی علمی معلومات بھی موجود نہ ہوتو پھر آزادی بیان کا راگ الاپنا بالکل غیر موثر اور بے سود ہوگا۔

نتیجہ کے طور پر یہ بات بالکل واضح ہے کہ بذات خود آزادی بیان کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور یہ مقصود بھی نہیں ہے بلکہ اسے آزاد معاشرہ کی تشکیل کے لئے ایک وسیلہ کی حیثیت حاصل ہے۔ مقصد یہ نہیں کہ جو شخص بات کرنا جانتا ہے وہ کوئی بات کہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ وہ بات کہی جائے جس کا کہنا اہمیت کا حامل ہو۔

چونکہ آزادی افکار وعقائد کو یکساں وسائل اور طریقوں پر مساوی دسترس حاصل نہیں ہے لہٰذا عصری مفکرین اور دانشوروں نے جو ماڈل تیار کیا ہے وہ قابل قبول نہیں ہے کیونکہ وہ بازارچۂ افکار ومعاشرہ کی ترقی وخوشحالی اور کارآمد جمہوریت کے پھلنے پھولنے میں کوئی مدد نہیں کرسکتا ہے۔اس لئے بھی ہمارا موجودہ سماج درحقیقت ہمارا پسندیدہ سماج نہیں رہ گیا ہے بلکہ یہ ایک صرفی سماج (Consumer's Society) میں بدل چکا ہے جو تولیدات اور ایجادات کے ذوق اور مطالبات کی بنیاد پر تشکیل پاتا ہے، اس میں سیاسی افکار وعقائد کا کوئی خاص کردار نہیں ہے۔

پس آزادی بیان کی حمایت کے لئے قانونی ضمانتیں جس قدر وسیع ہوں گی بالکل اسی اندازہ سے نشریاتی اداروں کے اختیارات اور اقتدار میں بھی پھیلاؤ پیدا ہوتا چلا جائے گا۔لہٰذا ان وسیع اختیارات کے مقابلہ میں ایسی موثر اور کارآمد فکر کی جستجو کرنی چاہیے جو عام شہریوں کو احتمالی نقصانات سے محفوظ رکھ سکے اور وہ نامطلوب کلام کی زد میں نہ آسکیں۔

مختصر لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ حالات میں صرف بات کہنے والے کی حمایت کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ایسی ضمانتوں کی اہم ضرورت محسوس کی جارہی ہے جن کی رو سے نقصان آمیز بیان کے سننے کے بعد جو نقصانات متوقع ہیں ان سے تمام مخاطبین کو محفوظ رکھا جاسکے۔

انڈیا انٹرنیشنل سینٹر دہلی میں

آزادیٔ بیان گول میز مذاکرہ

قارئین کرام اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ ڈنمارک میں شائع ہونے والے توہین آمیز کارٹون اور اس قسم کے دیگر مضامین اور نام نہاد فنی نمونوں کے ذریعہ عالمی سطح پر ایسا ماحول پیدا کردیا گیا ہے کہ باہمی تناؤ اور آپسی نفرتوں میں روز بروز اضافہ ہوتا رہے اور عالمی سامراجی طاقتیں اپنے خصوصی ہتھکنڈوں کے ذریعہ لوگوں کے مذہبی جذبات کو بھڑکا کر اپنا الوسیدھا کرتی رہیں۔ واضح رہے کہ سارا کاروبار آزادیٔ بیان کی آڑ میں انجام دیا جارہا ہے ۔موضوع کی اہمیت وافادیت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران نے ۳۰/اپریل کو اس موضوع پر ایک اہم مذاکرہ کا اہتمام کیا جس میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی، جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے سابق ریکٹر پروفیسر رحمت اللہ خان، پروفیسر آر پی سنگھ اور یونیورسٹیوں نیز قانونی اداروں سے وابستہ لوگوں نے شرکت فرمائی اور اپنے عالمانہ خیالات سے آگاہ کیا۔ ذیل میں اس مذاکرہ کی تفصیلی رپورٹ پیش کی جارہی ہے۔

محمد حسین مظفری:

خداوند قادر و متعال کے نام سے اس مذاکرہ کا آغاز کرتے ہوئے ایران کلچر ہاؤس کے ڈائریکٹر محمد حسین مظفری نے معزز مہمان پروفیسر رحمت اللہ خان، جناب شاہد مہدی ، پروفیسر آر۔پی۔سنگھ اور دیگر حاضرین مجلس کا استقبال کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ لوگوں کو بخوبی اندازہ ہے کہ انواع و اقسام کی ثقافتوں کے درمیان سماجی ہم آہنگی اور آزادی بیان جیسے موضوعات یقیناً غیرمعمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ شاید اسی اہمیت کو نگاہ میں رکھتے ہوئے Executive Board of UNESCO نے اپنے حالیہ اجلاس کے دوران باوقار آزادی بیان، محترم مذہبی عقائد اور لائق احترام مذہبی علائم (Symbols) کے سلسلے میں ایک قرارداد پاس کی ہے۔

خواتین وحضرات !ڈنمارک کے اخباروں میں اہانت آمیز کارٹوں کی اشاعت کے بعد عالمی سطح پر

رونما ہونے والے ردعمل کے نتیجہ میں جو حوادث سامنے آئے ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس شرمناک حرکت کی وجہ سے اقوام عالم کے درمیان موجود تعلقات غیر معمولی طور پر متاثر ہوئے ہیں اور ۵۰ سے زیادہ افراد کے جانی نقصان کے ساتھ ساتھ اس تنازعہ کی وجہ سے یورپی ممالک کے درمیان بھی باہمی تعلقات میں تناؤ آگیا ہے اور خود یورپی ممالک نیز اسلامی ملکوں میں زندگی بسر کرنے والے لوگوں پر بھی اس تنازعہ کا گہرا اثر مرتب ہوا ہے۔ ڈنمارک کے وزیر اعظم نے کارٹون تنازعہ کو دوسری جنگ عظیم کے بعد کا بدترین عالمی حادثہ قرار دیا ہے۔ دوسری طرف UNESCO کے ڈائریکٹر جنرل اور اس عالمی ثقافتی تنظیم سے وابستہ تمام ممبر ملکوں نے تنظیم کی حالیہ قرار دادوں کی بھرپور حمایت کی ہے جس میں باوقار آزادی بیان، محترم مذہبی عقائد اور لائق احترام مذہبی علائم کی عظمت واہمیت پر زور دیا گیا ہے۔

خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران کی جانب سے منعقد اس گول میز کانفرنس کا بنیادی مقصد اس مسئلہ کی ان تمام پیچیدگیوں اور پریشانیوں کی نشاندہی کرنا ہے جس نے اقوام عالم کے درمیان موجود خلاء کو پہلے سے زیادہ وسیع کر دیا ہے اور ان کے درمیان بدگمانی اور غلط فہمیوں کا بازار گرم کر دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مذاکرہ میں شریک دانشمند مفکرین اس مسئلہ سے جڑے ہوئے تمام پیچیدہ مسائل پر روشنی ڈالیں گے اور ایسی تجاویز پیش کریں گے جن کے ذریعہ نہ صرف اس مسئلہ کا حل نکل سکے بلکہ عالمی انسانی برادری کے درمیان باہمی تفاہم کا ماحول پیدا ہو سکے اور یورپی دنیا میں صلح وسلامتی کی تشکیل عمل میں آسکے۔ ان افتتاحیہ کلمات کے ساتھ میں پروفیسر رحمت اللہ خان سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ مذاکرہ کی صدارت قبول فرمائیں۔

پروفیسر رحمت اللہ خان:

میں مظفری صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے ایسے اہم مذاکرہ کی صدارت کی ذمہ داری میرے سپرد کی ہے جس میں نامور اور صاحب امتیاز دانشور حضرات کے علاوہ ملک کے ہر شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والے صاحبان فکر حضرات شریک ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے بھی یہ مذاکرہ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ دنیائے بشریت ایک لمبے عرصہ سے اس مسئلہ میں بری طرح الجھی ہوئی ہے۔ موضوع کا خیال آتے ہی طرح طرح کے سوال ابھرنے لگتے ہیں۔ آزادی بیان کیا ہے؟ اس کی حدود

کیا ہیں؟ آزادی بیان کا مطلب کسی کو گالی دینا یا برا بھلا کہنا ، نازیبا کلمات کہنا، دل آزاری کرنا یا کسی کی کردار کشی کرنا تو نہیں ہے؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب ہم سبھی لوگوں کو معلوم ہے اور ہم اس حقیقت سے بھی بخوبی آشنا ہیں کہ آزادی بیان کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں قانونی پابندیوں پر بھی نگاہ رکھنی ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود آئے دن ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں جن میں آزادی بیان کے بنیادی اصولوں اور قانونی پابندیوں کی خلاف ورزی دکھائی دیتی ہے اور افراد عدالتوں میں اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی میں سرگرم نظر آتے ہیں دوسری طرف سماج میں زندگی بسر کرنے والی مختلف النوع برادری کے درمیان تناؤ پیدا ہوجاتا ہے اور کبھی کبھی یہ تناؤ اتنا شدید ہوجاتا ہے کہ قاتلانہ حملہ اور قتل وغارتگری کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے جیسا کہ مظفری صاحب نے اپنے افتتاحیہ کلمات میں اشارہ کیا ہے۔ درحقیقت میرا کام نہ اس مذاکرہ کا لب ولہجہ طے کرنا ہے اور نہ ہی کسی ثالث کا کردار ادا کرنا ہے ۔ میں ابتدائی مرحلہ میں کچھ مشورے پیش کرنا چاہتاہوں تاکہ یہ مفید مذاکرہ صحیح سمت کی طرف بڑھ سکے لیکن اس سے قبل میں اس عالمی سیاسی ماحول کی طرف اشارہ کرنا چاہتاہوں جو موجودہ امریکی صدر جارج ڈبلوبش کی کوششوں سے بین الاقوامی سطح پر رونما ہوچکا ہے۔ صدر جمہوریہٗ امریکہ اپنی آزادانہ گفتگو کے لئے ساری دنیا میں مشہور ہیں اور ان کا اخلاق اپنے مخصوص ذہنی ڈھانچہ کے ساتھ وہ خود ساختہ مظاہروں اور تشدد آمیز حرکتوں کے ذریعہ اپنے سیاسی اقتدار کی بھرپور حفاظت میں غیر معمولی مہارت کو بخوبی ثابت کرچکے ہیں اور انہیں اپنے مشن میں ڈیک چینی، رمس فورڈ اور دیگر ہم خیال امریکی رہنماؤں کی حمایت حاصل رہی ہے جنہیں Neo-conservative کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ اس جگہ میں امریکی صدر بش کی ذاتی زندگی پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا بلکہ میرا بنیادی مقصد آپ لوگوں کو اس سیاسی ماحول وصورتحال سے آگاہ کرنا ہے جس کی وجہ سے آزادی بیان کی اہمیت میں اضافہ ہوجاتا ہے جس کی آڑ میں اس نے دیگر لیڈران کی مذمت کی ہے اور اپنے منتخب شکار پر حملہ کے دوران اپنے استحصالانہ مفادومصالح کو پوری طرح نگاہ میں رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے تجاوز کا رانہ ماحول میں آزادی مذہب اور آزادی بیان کی اہمیت بہر حال بڑھ جاتی ہے۔ دراصل میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایسے عالمی ماحول میں سیاسی مستکبرین نے صورتحال کا ڈٹ کر استحصال کیا۔ یہ بات صرف امریکی صدر بش کی ذات تک ہی محدود نہ رہی بلکہ پاکستان اور دیگر ملکوں کی سیاسی قیادت

نے بھی اس ماحول کا ڈٹ کر استحصال کیا۔ چین میں بھی صاف نظر آئے گا کہ اس ملک کی سیاسی قیادت ہمیشہ اپنے مخصوص سیاسی ایجنڈے پر عمل پیرا رہی ہے تاکہ اس کی طاقت میں روز بروز اضافہ ہوتا رہے۔ ظاہر ہے کہ اقتدار کے سایہ میں جب اس قسم کے منصوبوں کو عملی رنگ روپ دیا جاتا ہے تو آزادی بیان کی ضرورت واہمیت دونوں بڑھ جاتی ہے۔ اپنی بات کو مختصر کرتے ہوئے اب میں محترم شاہد مہدی صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔

سید شاہد مہدی:

(..............) میں اس مذاکرہ میں شرکت سے بیحد خوش ہوں کیونکہ ایسے ملک کا رہنے والا ہوں جہاں آزادی بیان مطلق نہیں بلکہ اس پر قانونی پابندیاں بھی لگائی گئی ہیں جس کا ذکر جسٹس قریشی صاحب اور مذاکرہ میں شریک دیگر حضرات بہتر ڈھنگ سے کرسکیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس مذاکرہ کا مقصد فقط آزادی بیان پر تبصرہ کرنا نہیں ہے بلکہ اس کو مختلف تناظر مثلاً مشرق ومغرب، نوآبادیاتی اور غیرنوآبادیاتی دور اور تہذیبوں کے درمیان ٹکراؤ جیسی جدید ترین فکر کے تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ حکومتوں کے خفیہ ایجنڈہ کو نگاہ میں رکھتے ہوئے بھی اس موضوع پر بحث کی جاسکتی ہے۔ درحقیقت دوسری جنگ عظیم کے بعد دوبڑی طاقتوں کے درمیان سرد جنگ ان میں سے ایک بڑی طاقت کے خاتمہ پر اختتام پذیر ہوئی۔ چنانچہ باقی ماندہ تنہا بڑی طاقت کا شدت پسندی سے کچھ آگے بڑھ جانا کوئی غیر یقینی امر نہیں ہے۔ اس اکلوتی بڑی طاقت کو نئے دشمن کی تلاش تھی اور اس نے غلط یا صحیح اسلام اور اسلامی دنیا کو اپنا نیا دشمن چن لیا۔ سچ بات تو یہ ہے کہ سردست اسلام کو جس طرح خوفناک بناکر پیش کیا جارہا ہے اس میں کوئی صداقت نہیں ہے کیونکہ اگر ہم ۱۹۴۵ء سے پہلے کا یورپ دیکھیں تو ہمیں اس قسم کا کوئی مسئلہ ہی نظر نہ آئے گا۔ لیکن ۲۱ ویں صدی کے یورپ میں تو تقریبا ایک کروڑ مسلمانوں کی آبادی دکھائی دیتی ہے اور یورپ کے لئے یہ پہلا اور نہایت اہم تجربہ ہے۔ یہ آزادی بیان، جمہوریت اور دوسری چیزوں کا گھر رہا ہے۔ لیکن اس کے سامنے کثیر جہت اور مختلف برادریوں پر مشتمل سماجی قدروں کا کوئی نمونہ موجود نہیں رہا ہے۔ جبکہ ہندوستان صدیوں سے مختلف النوع مذہبی جماعتوں پر مشتمل سماج کا حامل رہا ہے جو بذات خود ایک اہم مسئلہ ہے۔ بہرحال یہ وہ اہم مسائل ہیں جو آزادی بیان اور اس کے مدمقابل غیر آزادی بیان کے مطلق اصول کی شکل میں

ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ان کے پیچھے کسی نہ کسی خفیہ عوامل کی کارکردگی یقینی ہے۔ اب کارٹون تنازعہ کا مسئلہ ہی دیکھ لیجئے۔ یہ ایک تہذیب اور مذہب کی اعلانیہ اور منصوبہ بند توہین ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں امریکی بھوک کی بات نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ امریکی بحریہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ جہاں تک امریکہ کے سلسلہ میں میری معلومات اور میرا تجربہ ہے، اس میں گنجائش زیادہ ہے۔ بلکہ امریکہ میں موجود کثیر جہتی ثقافتی روایات کے پیش نظر اس کو ایسی سرائے کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے جہاں ہر چیز دستیاب ہے ۔ ساتھ ہی ساتھ کچھ لوگوں کی نظر میں یہ پگھلتے ہوئے برتن کی مانند ہے جس میں اس بات کا قوی امکان ہے کہ تم اپنی شناخت کھو بیٹھو۔ بہرحال وجہ کچھ بھی ہوسکتی ہے لیکن امریکہ نے آزادی بیان اور عدم آزادی بیان کے سلسلہ میں مطلقیت کا روپ اختیار کرلیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ لڑائی آزادی بیان اور عدم آزادی بیان کی نہیں ہے۔ بلکہ بات صبر و تحمل، تفاہم اور باہمی سوجھ بوجھ، اچھے باہمی روابط اور آپسی ادب و احترام کی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ دوہرے رویہ سے اجتناب بھی ضروری ہے۔

غور طلب بات ہے کہ فرانس اور ڈنمارک کارٹون تنازعہ کے سلسلہ میں آزادی بیان کے سب سے بڑے علمبردار دکھائی دیتے ہیں۔ ان ممالک کے دانشوروں کی ایک جماعت آزادی بیان کی آڑ میں کارٹونوں کی اشاعت کو جائز قرار دیتی ہے اور دوسری طرف آسٹریلیا کے ایک ماہر تاریخ اور نامور دانشمند کو ہٹلر پر لکھی گئی اس کی کتاب کو جرم قرار دیتے ہوئے اسے تین سال کی قید بامشقت کی سزا کا مستحق قرار دیا جاتا ہے کیونکہ اس نے HOLO CAUST یہود کشی کے سلسلہ میں کچھ صحیح یا غلط سوالات پیش کئے ہیں جواب تک تسلیم شدہ حقائق پر سوالیہ نشان کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ڈیوڈ اروین DAVID IRVIN کی متنازعہ کتاب پر آسٹریلیائی عدالت میں مقدمہ قائم کیا گیا اور عدالت نے اس مورخ کے لیے تین سال کی سزا کا اعلان کیا۔ یہ سب کچھ ایسے وقت میں کیا جارہا ہے جب کہ کارٹون تنازعہ میں آزادی بیان کے سایہ میں کارٹون بنانے والے کی حمایت میں فلک شگاف نعروں کی آواز عالمی فضا میں گونج رہی ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مختلف یورپی ممالک میں ایسے مخصوص قوانین موجود ہیں جس کی روشنی میں اس کو ایک جرم کی حیثیت حاصل ہے۔ اسی طرح Blasphemy کلمہ کفر یا تکفیر کے سلسلہ میں بھی ایک قانون موجود ہے۔ لیکن اس کا اطلاق ایک مخصوص مذہب کے لئے ہوتا

ہے۔ اور دنیا کے دیگر مذاہب اس قانون کے دائرہ اختیار سے باہر ہیں۔ اس طرح یہ بحث جاری رہے گی اور میں اس بات سے بھی اتفاق کرتا ہوں کہ حکومتوں کا ایک خفیہ ایجنڈا بھی ہوتا ہے۔ لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ مجرمانہ عمل کی مذمت Jonathan Steve جیسے صحافی اور Karan Armstrong جیسے ماہر عالم نے بھی کی۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جن ملکوں میں یہ مجرمانہ حرکت کی گئی ہے وہاں کے سنجیدہ اور صاحب عقل وفہم افراد نے اس کی مذمت بھی کی ہے۔ میرے خیال میں ردّ عمل کے طور پر تشدد سے ان لوگوں کو کوئی فائدہ ہونے والا نہیں ہے جو اس مجرمانہ عمل کے خلاف احتجاج ظاہر کرنا چاہتے ہیں بلکہ اس کا فائدہ انھیں لوگوں کو ہوگا جو اس مجرمانہ سازش کی ایجاد میں سرگرم رہے ہیں۔ ہم لوگوں کو اپنے ہاتھ سے اپنے پیروں پر کلہاڑی نہیں مارنی چاہئے اور دونوں جماعت کے شدت پسند عناصر سے دور رہنا چاہئے۔ صاحبان عقل وشعور مجرمانہ اعمال کو بہرحال ناپسند کرتے ہیں اور اس سے اپنی علیحدگی ناپسندیدگی اور نفرت و بیزاری کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔ لیکن ان کے رویہ میں شدت پسندی نہیں ہوا کرتی۔ گذشتہ سال ستمبر کے مہینہ میں اس سلسلہ میں میری گفتگو اسپین کے سفیر سے ہوئی۔ پھر ہم نے دیکھا کہ اسپین کے وزیراعظم نے جنرل اسمبلی میں ایک قرارداد پیش کی جس کی تائید ترکی کے وزیراعظم نے کی۔ اس قرارداد میں ہر طرح کی شدت پسندی کے خلاف تہذیبوں کے درمیان اتحاد کی بات کہی گئی ہے۔ درحقیقت ایران کے سابق صدر جمہوریہ خاتمی صاحب کی طرف سے تہذیبوں کے درمیان گفتگو کے سلسلہ میں جو مستحسن قدم اٹھایا گیا تھا اس کی حمایت وتائید میں اسی مقصد کی تکمیل کی خاطر یہ دوسرا موثر اقدام ہے جس میں گفتگو سے آگے بڑھتے ہوئے تہذیبوں کے درمیان اتحاد کی بات کہی گئی ہے تاکہ شدت پسندی کو دور کیا جاسکے۔ اس کے فوراً بعد ہی اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل نے ایک اعلیٰ رتبہ گروپ کی تشکیل کردی جس میں دنیا کے مختلف ممالک کے نامور لوگوں جیسے ایران سے سید محمد خاتمی، مصر سے شیخ اسمٰعیل سراج الدین، جنوبی افریقہ سے آرکیشوپ ٹیٹو، پاکستان سے نفیس صادق، ہندوستان سے شوبھنا مالوا وغیرہ شامل ہیں۔ یہ لوگ اسی سال ستمبر تک اپنی رپورٹ اور لازمی سفارشات پیش کردیں گے۔ اس رپورٹ میں ان عملی راستوں کی نشاندہی کی جائے گی جس کے ذریعہ مختلف لوگوں، ثقافتوں اور تہذیبوں کے درمیان تفاہم، باہمی احترام اور مشترکہ قدروں کو فروغ دیا جائے گا تاکہ شدت پسندی کے انسانیت سوز آتش فشاں کی روک تھام ہوسکے اور

ان لوگوں کو بالکل الگ تھلگ رکھا جاسکے جو عالمی افکار وعقائد کی طرف سے بالکل لاپرواہ ہیں۔خود ہمارے ملک میں بھی ایسی طاقتیں کام کررہی ہیں جو عالمی سلامتی کی حفاظت کے لئے خصوصی طریقہ کار کی پیروہیں۔ ان طاقتوں کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ وہ عالمی شدت پسندی کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کچھ ایسے اصول وقوانین ہوا کرتے ہیں جو سب کی نگاہوں میں محترم ہوا کرتے ہیں۔ جان اسپازیٹو نے اس بات کو نہایت دلکش انداز میں بیان کیا ہے ۔ انھوں نے اپنے ایک مقالہ میں لکھا ہے کہ ایک Pluralistic سماج میں آزادی مذہب کا مطلب یہ ہے کہ سماج میں کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو سب کی نگاہوں میں لائق احترام ہوا کرتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ شدت پسند عناصر کو ان کے حال پر چھوڑتے ہوئے ہم لوگوں کو تہذیبوں کے درمیان اتحاد کی بھرپور تائید وحمایت کرنی چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ نیک نیت کے حامل افراد کو شدت پسندی کے خلاف اپنی جدوجہد جاری رکھنی چاہئے چاہے وہ مغرب سے وابستہ Neo-Conservatives ہوں یا دنیا کے کسی دوسرے علاقہ میں سرگرم عمل دیگر جماعتیں ۔ بہرحال خوشی کی بات ہے کہ Neo-Conservatives جماعت میں خود ہی اختلاف پیدا ہوگیا ہے۔ آپ لوگوں نے پڑھا ہوگا کہ اس جماعت سے پوری طرح وابستہ Fukuyama نامی دانشور نے اس گروہ کے بنیادی نظریات پر تنقید شروع کردی ہے۔ ہم لوگوں کو اپنی مصالحت آمیز اور متوازن راہ وروش پر قائم رہنا چاہئے اور منطقی ومدلل مباحث سے پیچھے نہ ہٹنا چاہئے۔

پروفیسر رحمت اللہ خان: بہت بہت شکریہ شاہد مہدی صاحب ! آپ نے ہم لوگوں کو نہایت مفید اور تعمیری مشورے فراہم کئے۔ تہذیبوں کے درمیان تفاہم اور ان کے درمیان آپسی اتحاد کی حمایت یقیناً بہت ضروری ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تہذیبوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا اور ان میں اتحاد پیدا کرنا ایک مشکل کام ہے کیونکہ ذاتی اور جماعتی مفاد کے متوالے اس راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ میں نے مذاکرہ کی ابتداء میں صرف سیاسی مفاد ومصالح کی طرف اشارہ کیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے تفاہم اور اتحاد کو ختم کرنے کے لئے بے شمار سر پھرے افراد کی متحدہ جماعتیں موجود ہیں۔ پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کو طرح طرح کے نام مثلاً انہیں (معاذاللہ) Pedophile بچہ باز کہنا کہاں تک درست ہے اگر ایسا ماحول ہے اور اگر حملہ کی یہ نوعیت ہے تو پھر ایسے لوگوں کے ساتھ کسی قسم کی مفاہمت یقیناً ایک دشوار امر ہے اور ایک دوسرے کی مخالفت پر کمربستہ

ایسی جماعتوں کو قریب لانا کیسے ممکن ہے بالخصوص تہذیبوں کے درمیان ٹکراؤ کے موجودہ ماحول میں یہ یقیناً ایک امر محال ہے۔ واضح رہے کہ ہم لوگ اس بات کو پسند کریں یا ناپسند تہذیبوں کے درمیان ٹکراؤ اور مسلح ٹکراؤ ہے جس کا عالمی سطح پر مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ میں آپ لوگوں کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا اور اپنی محدود نگاہوں سے اس وسیع منظر نامہ کی عکاسی کوئی آسان کام نہیں۔ بہرحال اب میں پروفیسر آر پی سنگھ صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ آزادی بیان کے سلسلہ میں اپنے افکار و خیال کا اظہار کریں۔ کیا آزادی بیان مذہب وعقیدہ رکھنے کا حق نہیں دیتی ہے؟ یعنی کیا قانونِ حق آزادی مذہب کی تردید کرتا ہے؟

پروفیسر ایم۔ پی۔ سنگھ

شکریہ پروفیسر خان! درحقیقت میں نے اس موضوع کا انتخاب اس وجہ سے کیا تھا کہ شاید میں آخر مقرر کی حیثیت سے اپنی بات پیش کروں گا لیکن یہ آپ کی عنایت ونوازش ہے کہ آپ نے شروع ہی میں مجھے اپنی بات پیش کرنے کا موقع فراہم کردیا۔ درحقیقت ایک لمبی مدت سے قانون کا طالب علم ہونے کی وجہ سے میری تقریر بھی قانونی سرحدوں کے دائرہ میں ہی محدود رہے گی اور موضوع سے وابستہ مسائل کو عمومی اور وسیع انداز بیان کے ساتھ نہ پیش کرسکوں گا بالخصوص مذہب اور عقیدہ کا جھگڑا۔ اس ضمن میں وضاحت طلب بات یہ ہے کہ کیا واقعی آزادی بیان کو حق مطلق کا درجہ حاصل ہے یا فقط امریکیوں کا یہ خیال ہے کہ اظہار خیال کی آزادی انسان کا مطلق حق ہے اور اس پر کسی قسم کی پابندی یا محدودیت عائد کرنا قطعی درست نہیں ہے۔ واضح رہے کہ حق ایسا لفظ ہے جو کسی غلط یا ناحق کے لئے استعمال ہی نہیں کیا جاسکتا ہے پس لفظ حق اسی وقت تک اپنے حقیقی معنی ومفہوم کا حامل ہے جب تک وہ حق کے ساتھ ہے اور یہ حق اسی وقت تک حق کا حامل ہے جب تک یہ دوسروں کے حق کو نقصان نہیں پہونچا رہا ہے۔ جیسے ہی کوئی شخص اپنے حق کا استعمال کرتے ہوئے کوئی ایسا عمل انجام دیتا ہے جس سے دوسرے لوگوں کو اذیت محسوس ہونے لگے اس شخص کا عمل حق کے دائرہ سے باہر چلا جائے گا۔ اس بات کا امکان ہے کہ وہ لوگ اپنے مذہبی افکار وعقائد کی غلط ترجمانی کررہے ہوں۔ جیسا کہ شاہد مہدی صاحب اپنی تقریر کے دوران اشارہ کرچکے ہیں کہ بعض معمولی اسباب وعوامل کی وجہ سے بھی یورپی ممالک اور امریکہ میں بھی اکثر آزادی اظہار خیال وبیان پر پابندی لگادی جاتی ہے یا اس

حق میں قدرے کمی کردی جاتی ہے۔ اکثر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اشتراکیت یا مارکسزم کی حمایت میں اپنے خیالات کو تقریری شکل میں پیش کرنے والوں کو بھی سزائیں دی گئی ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے زمانہ میں امریکہ اور دیگر یورپی ملکوں میں لوگ ہمہ وقت خوفزدہ رہا کرتے تھے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ آزادی بیان ایسا حق مطلق ہے جس میں کسی قسم کی کمی ممکن نہیں بالکل غلط اور بے بنیاد بات ہے۔ امریکی آئین میں بھی ایسے حقوق کا ذکر موجود ہے جس کو تفصیلی یا ترجیحی حق کے نام سے یاد کیا گیا ہے اور ان لوگوں نے حق آزادی بیان اور حق آزادی مذہب کو ترجیحی حق کی فہرست میں درج کیا ہے۔ اور یہ اتفاق کی بات ہے کہ امریکی آئین میں ان دونوں حقوق کا ذکر ایک ہی دفعہ میں کیا گیا ہے۔ اس سے دونوں حقوق کی عظمت واہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک کو پہلے اور دوسرے کو بعد میں نقل کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پہلے کو دوسرے پر فضیلت حاصل ہے، ایسا نہیں ہے بلکہ دونوں کو یکساں اہمیت حاصل ہے۔ ترجیحی حق قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ حکومت اکثریت کے مفاد ومصالح کے بہانہ یا عوام الناس کے فائدہ کی بنیاد پر بھی لوگوں کے ان حقوق کو سلب نہیں کرسکتی ہے اور اگر ایسا کیا تو حکومت کو ان اسباب وعوامل یا اغراض ومقاصد کی وضاحت کرنی ہوگی جن کی وجہ سے حق آزادی بیان یا آزادی مذہب میں کمی کردی گئی۔ اس حد تک تو کہا جاسکتا ہے کہ یہ مطلق اور غیر مشروط حق ہے یعنی حکومت اس حق کے سلسلہ میں ہرگز تجاوز نہیں کرسکتی ہے۔ پتہ یہ چلا کہ حکومت کے مقابلہ میں تو اس حق کو مطلقیت حاصل ہے لیکن دوسرے لوگوں کے حقوق کے مقابلہ میں اسے آزادی مطلق کا درجہ حاصل نہیں ہے، بلکہ اپنے حق کا استعمال کرتے وقت اسے دوسرے لوگوں کے حقوق کا پورا خیال رکھنا ہوگا۔ پس واضح رہے کہ کسی کے حق آزادی بیان کی حمایت کرتے وقت یہ دیکھنا لازمی ہے کہ کسی دوسرے شخص کا حق آزادی مذہب وعقیدہ مجروح یا پامال نہ ہونے پائے۔ دونوں کے حقوق مساوی اور برابر ہیں لہٰذا دونوں کے درمیان توازن لازمی ہے اور اگر بیان اور مذہب کی آزادی کے درمیان توازن برقرار نہ رہے تو ایک کے ذریعہ دوسرے کے حق کا مجروح یا پامال ہونا یقینی ہے۔ جہاں تک ہندوستانی قانونی نظام کا سوال ہے اس میں اس بات کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ ہر اعتبار سے کامل ہے لیکن یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ اس قسم کے مسائل کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ سب سے پہلے آئین کی دفعہ ۱۹ کے بند IA میں آزادی بیان کی بات کہی گئی ہے اور اس کے سلسلہ میں لازمی پابندیوں کو دفعہ II 19 میں پیش کیا گیا ہے جن میں عمومی نظم ونسق،

اخلاقیات اور آداب شائستگی کو برقرار رکھنے کے لئے آزادی بیان میں کچھ کمی یا اس پر قدرے منطقی اور مناسب پابندی لگائی جاسکتی ہے۔ اسی طرح ہمارے ملک کے آئین کی دفعہ ۲۵ میں ہم لوگوں کو آزادی کا حق دیا گیا ہے اور یہ حق، حق مطلق نہیں بلکہ شرائط اور لازمی پابندیوں کا حامل ہے جس میں اخلاقیات، سماجی نظم وانتظام اور معاشرتی قوانین کی مکمل پیروی شامل ہے۔

پس ملحوظ خاطر رہے کہ مذہبی آزادی کے حق کے ساتھ جو پابندیاں بیان کی گئی ہیں ان کی پیروی بھی لازمی ہوگی۔ چنانچہ حکومت کو یہ احساس ہوا کہ لوگ آزادی بیان کی سہولت کو اس طرح بھی استعمال کرسکتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کے حق آزادی مذہب کے لئے خطرہ لاحق ہوجائے اور آخر کار ٹکراؤ کی صورت پیدا ہوجائے، تو آزادی کے بعد اس قانون میں ایسی دفعات کا اضافہ کیا کہ جس کے بموجب آزادی بیان کے مقابلہ میں آزادی مذہب کی حفاظت کی جاسکے۔ اس کام کے لئے خصوصی طور پر آزادی کے بعد تعزیرات ہند کی دفعہ 295-A کا اضافہ کیا گیا جس میں واضح عبارت میں ایسی تقریر کو پوری طرح ممنوع قرار دے دیا گیا ہے جس سے لوگوں کے مذہبی جذبات مجروح ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ایک شخص نے قرآن کے خلاف ایک کتاب تحریر کی جس کو صوبائی حکومت نے ممنوع قرار دیدیا۔ رام جی لال نامی شخص نے سپریم کورٹ میں مقدمہ دائر کردیا کہ صوبائی حکومت کی اس پابندی کی وجہ سے ہمارے آزادی بیان جیسے بنیادی حق کی پامالی ہورہی ہے۔ سپریم کورٹ نے حکومت اترپردیش سے جواب طلب کیا۔ حکومت نے جواب دیا کہ ہمیں ملک کے آئین اور تعزیرات ہند کی دفعہ 295.A کے بموجب جو قانونی اختیار دیا گیا ہے اس کی پیروی میں ہم نے متعلقہ تصنیف کو ممنوع قرار دیا ہے۔ سپریم کورٹ نے حکومتی اقدام کو درست قرار دیتے ہوئے اپنے فیصلہ میں یہ لکھا کہ قرآن کے بارے میں کتاب لکھنا یا اظہار خیال کرنا ممنوع نہیں ہے لیکن اگر آپ کی تحریر یا تقریر سے معاشرہ کے امن وامان میں خلل کا امکان ہے اور سماجی نظام کے درہم برہم ہونے کا اندیشہ ہے تو حکومت ایسے بیان یا ایسی تحریر پر پابندی لگانے میں پوری طرح حق بجانب ہے۔ اس کے بعد جب کبھی حکومت کو کسی تقریر یا تالیف، چاہے وہ سلمان رشدی کی شیطانی آیات ہو یا کارٹون کی اشاعت کا معاملہ، سماجی نظم وانتظام میں گڑبڑی کا اندیشہ ہوا تو اس نے فوراً اس قانون کا سہارا لیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کبھی کبھی ہندو جماعتوں نے عدالت سے یہ شکایت کی کہ انتظامیہ ان کے مذہبی آزادی کے حق کے دفاع میں اس قانون کو لاگو نہیں کرتی۔ عدالت نے فیصلہ کیا کہ یہ حکومت کا

حق ہے کہ وہ سماجی بدنظمی کا خطرہ محسوس کرکے ہی اس قانون کو نافذ کردے۔ اگر انتظامیہ کو بعض معاملات میں ایسی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تو یہ قانون کی خلاف ورزی ہرگز نہیں ہے۔ نیز ہندوستانی سماج میں یہ بات قدرے ممکن بھی نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں ایک اکثریتی مذہبی طبقہ ہے اور دوسرا اقلیتی مذہبی طبقہ۔ اور اکثریتی مذہبی طبقہ کی جانب سے اگر کوئی ایسی حرکت عمل میں آتی ہے، جس کی وجہ سے اقلیتی فرقہ کی دل آزاری ہورہی ہے تو اقلیتی جماعت بہت جلد غیر معمولی گھبراہٹ میں مبتلا ہوجاتی ہے، لیکن اکثریتی مذہبی طبقہ پر اقلیتی جماعت کا ایسا رعب نہیں قائم ہوتا ہے جس کی وجہ سے نظم وقانون میں کسی خلل کا امکان ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اسی طرح تبدیلی مذہب کے ضمن میں بھی آزادی بیان پر کچھ پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔مثال کے طور پر عیسائی قوم کا یہ دعویٰ ہے کہ ان لوگوں کو دوسرے غیرعیسائی لوگوں کو عیسائی بنانے کا حق حاصل ہے اور اس مشن میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے کوئی بھی ذریعہ استعمال کرسکتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے بعض صوبوں میں Styris Laws کی تشکیل بھی عمل میں آئی اور ۱۹۷۶ء میں سپریم کورٹ نے بھی اس کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ پھر بھی مدھیہ پردیش ہائی کورٹ نے قانون کی بالادستی اور ضابطگی کو برقرار رکھتے ہوئے تبدیلیٔ مذہب میں زور زبردستی اور ترغیب کوممنوع اور ناجائز قرار دیدیا۔ عدالت نے کہا کہ آپ چاہے آزادی بیان کے سایہ میں یہ کام کرنا چاہتے ہوں یا آزادی مذہب جیسی سہولت کے ضمن میں، لیکن یادرہے کہ آپ ایسا کوئی ذریعہ استعمال نہیں کرسکتے جس کی وجہ سے کوئی شخص اپنا مذہب تبدیل کرنے کیلئے آمادہ ہوجائے۔صرف اتنا ہی نہیں بلکہ عام چناؤ کے دوران مذہبی تقریروں کے سلسلہ میں بھی حکومت کا رویہ بالکل بدل جاتا ہے کیونکہ حکومت کو بہرحال اپنے سیکولر کردار کی حفاظت کرنی ہے۔حق مذہبی آزادی کے ذیل میں ایسی تقریریں تو کی جاسکتی ہیں جن میں کسی مذہب کی صفات عالیہ کو ایسے فکر انگیز انداز میں پیش کیا گیا ہو کہ سننے والے لوگ اپنے مذہب کی صفات سے اس کا تقابلی مطالعہ کرسکیں لیکن اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ مثلاً بخاری صاحب کی طرف سے یہ اعلان کیا جائے کہ میں ایک حقیقی مسلمان ہوں اور میرا مخالف امیدوار ہندو ہے لہٰذا مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ مجھے ووٹ دیں۔ سپریم کورٹ کا خیال ہے کہ یہ تقریر غیر قانونی ہے اور صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب کا غلط استعمال کیا گیاہے۔ پس ہندوستان میں عدالت گاہوں کو اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہے کہ کون سی تقریریں کس حدتک آزادی بیان کے دائرہ میں آسکتی ہیں۔ اگر کوئی تقریر کسی

دوسرے شخص کی مذہبی آزادی پر حملہ آور نظر آتی ہے تو ابتدائی مرحلہ میں انتظامی اداروں کی طرف سے ان پر پابندی لگادی جاتی ہے اور اگر حکومت کی طرف سے اقدام میں تاخیر ہوتی ہے تو عدالت گاہیں فوری طور پر ممنوعیت کا حکم صادر کردیتی ہیں اور عدالتی مداخلت کے بعد حکومتی ادارے فوراً حرکت میں آجاتے ہیں۔ اس طرح اقلیتی فرقوں کو ان کے مذہبی آزادی کے حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ اس معروضہ کے بعد میں اپنی تقریر کے آخری مرحلہ پر پہونچ چکا ہوں۔ در اصل اپنی تقریر کو ختم کرتے ہوئے میں اپنا ایک ذاتی تجربہ ومشاہدہ آپ لوگوں کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ آئینی دفعات ہوں یا قانونی دفعات نیز سماجی علوم ہوں یا تاریخی مباحث، جب کبھی ہم ان علوم کا مطالعہ کرتے ہیں تو اکثر ہماری نظر میں مغرب ایک معیار یا کسوٹی کی حیثیت رکھتا ہے اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایسے حالات میں وہ لوگ کیا کرتے ہیں؟ لیکن ایشائی ممالک کے سلسلہ میں میرا تجربہ بالکل مختلف رہا ہے۔ میں یہ دیکھ کر بے حد خوش ہوں کہ ہمارے پاس مختلف قسم کے نمونے موجود ہیں۔ بعنوان مثال گذشتہ سال کے آخری مہینوں میں میں سنگاپور میں تھا۔ میں نے اخبار میں پڑھا کہ ایک مسلم خاتون نے کسی اخبار یا رسالہ میں ایک ایسی تصویر دیکھی جس میں ایک کتا ٹیکسی میں سفر کر رہا تھا۔ اس مسلم خاتون نے اس تصویر پر اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ اچھا اب سنگاپور میں کتے بھی ٹیکسی سے سفر کریں گے جو عام لوگوں کی سواری ہے۔ دو چینی نوجوان لڑکوں نے اس مسلم خاتون کے تبصرہ پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا کہ مسلمان لوگ اتنا بھی صبر وتحمل نہیں کر سکتے کہ اتفاق سے کبھی کوئی کتا انسانوں کی سواری یعنی ٹیکسی پر سفر کرے۔ دوسرے ہی دن ان دونوں چینی نوجوانوں کو بغاوت اور سرکشی کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا۔ بعد میں عدالت میں اس موضوع پر طویل بحث عمل میں آئی کہ کیا بغاوت وسرکشی کے قانون کو آزادی بیان سے متعلق معاملہ میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال عدالتی مباحث ومذاکرات کے ساتھ ہی ساتھ Li Kuan Yu کا ایک بیان بھی جاری ہوا جس میں یہ کہا گیا کہ ان نوجوانوں کو اچھی طرح یاد رکھنا چاہئے کہ یہ ۱۹۶۵ء میں پیدا نہیں ہوئے تھے لیکن میں اس وقت موجود تھا اور میں نے اپنی آنکھوں سے جو فساد اور قتل وغارتگری دیکھی ہے اگر ان فسادات کی تصویر بھی ان نوجوانوں کو دکھادی جائے تو انہیں بخوبی اندازہ ہوجائے گا کہ ان کا یہ بیان بغاوت اور سرکشی کے دائرہ میں آتا ہے یا نہیں؟ ہم اپنے ملک میں مسلمان ہوں یا غیر مسلم ہر ایک کے ساتھ متوازن ماحول میں زندگی بسر کرنے کی خواہش رکھتے ہیں اور میری نظر میں انسان کی زندگی کتے کی زندگی سے زیادہ قیمتی

ہے۔ اگر عوامی سواری میں مسلمانوں کو کتوں کے سفر پر اعتراض ہے تو کتوں کو ٹیکسی پر سوار کرنا ممنوع ہے۔ بالکل اسی طرح سنگاپور یونیورسٹی ہاسٹل میں حلال گوشت اور غیر حلال گوشت کا مسئلہ دکھائی پڑا۔ اس یونیورسٹی کی کینٹین میں نہ صرف حلال اور غیر حلال گوشت کے کھانے کا کاؤنٹر الگ ہے بلکہ ان لوگوں کی کھانے کی پلیٹ وغیرہ بھی الگ تھی اور کھانے کے بعد بھی ان پلیٹوں کو الگ ہی رکھا جاتا تھا۔ میں نے اس کی وجہ معلوم کرنی چاہی تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ اقلیتی فرقہ کے جذبات کے احترام کی خاطر ایسا کرتے ہیں۔ بعد میں مسلم اکثریت والے ملک ملیشیا میں ہم نے چینی اقلیت کے ساتھ ان لوگوں کا یہ حسن اخلاق دیکھا کہ ان لوگوں کو اقلیتی فرقہ کے تمام حقوق بخوبی فراہم تھے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر امریکی اعتبار سے آزادی بیان کو کسی فرد کے مذہبی حقوق پر فضیلت حاصل ہونی چاہئے تو وہ اپنے معاشرہ میں ایسا کرنے کیلئے آزاد ہیں۔ ہم لوگوں کو اپنے ملک میں اپنے اعتبار ومعیار سے کام لینا چاہیے تاکہ ہمارے معاشرہ میں کسی قسم کی بدامنی رائج نہ ہوسکے۔ ہمارے معاشرہ میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے دیگر معاشروں میں بھی انسان کی زندگی لوگوں کی تقریر سے زیادہ اہم ہے۔ میرے کہنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ تقریروں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ تقریریں یقیناً اہم ہیں لیکن جن انسانوں کے لئے یہ تقریر کی جاتی ہے وہ کم اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔ پس دونوں کے درمیان توازن لازمی ہے تاکہ کوئی خرابی اور بدعنوانی پیدا نہ ہونے پائے اور سارا معاملہ حسن وخوبی کے ساتھ انجام پاجائے۔

پروفیسر رحمت اللہ خان: دنیا کے مختلف علاقوں میں آزادی بیان اور آزادی مذہب کے معیاروں کے درمیان موجود اختلاف کے سلسلہ میں مفید اطلاعات فراہم کرنے کیلئے شکریہ۔ ہندوستان اور اکثر ایشائی ممالک میں مذہبی آزادی کو امریکہ اور یورپ کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ حاضرین کو پروفیسر سنگھ کی ان مفید باتوں کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھنا چاہئے۔ اب میں پروفیسر اختر الواسع سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔

پروفیسر اختر الواسع صاحب: انسانی حقوق، اصول اور عمل کی کش مکش

اظہار کی آزادی کا حق انسان کے مسلمہ بنیادی حقوق میں شامل ہے۔ یہ حق آزادی کے حق کا لازمی جزو ہے۔ آزادی کا کوئی بھی تصور، رائے قائم کرنے اور اظہار رائے کی آزادی کے بغیر مکمل نہیں کہا

جاسکتا۔ درحقیقت کوئی بھی معاشرہ اسی حدتک مہذب کہا جاسکتا ہے جس حد تک وہ اپنے افراد کو اظہار کی آزادی کا حق اور اختیار دیتا ہے۔ اس لیے کہ اگر اور تمام آزادیاں حاصل ہوں مگر اظہار کی آزادی میسر نہ ہوتو فرد اور معاشرہ دونوں گونگے ہوکر رہ جائیں گے۔ یہی نہیں بلکہ اس آزادی کے بغیر ایک طرف تو فرد کی شخصیت آزادانہ نمو کی صلاحیت اور موقع سے محروم ہو جائے گی کیوں کہ اس کے افکار، احساسات اور جذبات، راہ اظہار نہ ہونے کے سبب گھٹ کر رہ جائیں گے، تو دوسری طرف معاشرہ مختلف آراء اور خیالات کی ناموجودگی میں یکسانیت کے ایک ایسے جبر کا شکار ہوجائے گا جس کا انجام صرف ذہنی وفکری اور جذباتی موت کے سوا اور کچھ نہیں۔

دنیا میں جمہوریت اور جمہوری نظام کی حکمرانی کے عام ہونے کے بعد مختلف ملکوں میں اظہار کے حق کو آئینی وقانونی تحفظ حاصل ہوا اور اسی کی بنیاد پر پریس اور ذرائع ابلاغ کی وہ مملکت قائم ہوئی جو آج جمہوریت کا ایک اہم ستون تصور کی جاتی ہے۔ ان چند ملکوں کو چھوڑ کر جہاں آج بھی شاہی یا آمرانہ نظام اقتدار قائم ہے یا جہاں سیاسی نظام ایک جماعتی جمہوریت پر مبنی ہے، باقی ساری دنیا میں اظہار رائے کے حق کو نہ صرف تسلیم کیا جاتا ہے بلکہ اسے اتنی طاقت حاصل ہوچکی ہے کہ کوئی بھی حکومت اس حق کو سلب کرنے یا اس میں تخفیف کی جرأت نہیں کرسکتی۔

یورپ میں جہاں جدید جمہوری نظام سب سے پہلے قائم ہوا تھا اظہار کے حق کو بقول شخصے ایک طرح کا تقدس حاصل ہے۔ اس حق کا استعمال کس حد تک کیا جاسکتا ہے اور اس تحفظ میں کس حد تک جایا جاسکتا ہے اس کا اظہار ابھی کچھ دن قبل ڈنمارک کے ایک اخبار میں رسولؐ اللہ سے متعلق اہانت آمیز کارٹونوں کی اشاعت اور ان کے خلاف دنیا بھر میں ہونے والے مظاہروں اور اس سب سے متعلق بحث مباحثے میں اپنی انتہائی صورت میں نظر آیا۔ کارٹون بنانے اور شائع کرنے والوں کی دلیل یہ تھی کہ وہ اپنے اظہار کا حق استعمال کررہے ہیں۔ جو ایک ناقابل شکست حق ہے اور ایسا کرتے ہوئے وہ اپنے ملک کے قانون کے دائرہ میں ہیں۔ دوسری جانب دنیا بھر کے مسلمانوں کا کہنا تھا کہ یہ کارٹون اظہار کی آزادی کے حق کا بدترین استعمال ہیں کیوں کہ ان کے ذریعہ مسلمانوں کی مقدس ترین مذہبی شخصیت، ان کے عقیدہ اور ایمان کے مرکز اور ان کی محبتوں اور جاں نثاریوں کے محور، ان کے نبیٔ برحق کی اہانت ہوئی ہے جس سے ان کے جذبات کو سخت صدمہ پہنچا ہے۔ مسلمانوں کی

جانب سے ڈینش اخباروں اور وہاں کی حکومت کی توجہ اس اہانت کی جانب مبذول کرائی گئی مگر انہوں نے مسلمانوں کے جذبات کو ناقابل اعتناء سمجھا اور اظہار کے حق کے ناقابل مداخلت ہونے کی دلیل پر قائم رہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کارٹونوں کے خلاف مسلم دنیا میں مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوا، جن میں بعض تشدد کی گرفت میں بھی آگئے اور ہلاکتوں کا باعث ہوئے، تو اس کے خلاف سارے یورپ نے ایک طرح کے انتقامی اتحاد کا مظاہرہ کیا اور بہت سے یورپی ملکوں کے اخباروں نے بھی یہی کارٹون دوبارہ شائع کیے۔

یورپ اور مسلمانوں کے درمیان اس تصادم سے تہذیبوں کے درمیان تصادم کی تھیوری کے ثبوت کے عکس نظر آتے ہیں تو اس کا ذمہ دار مسلمانوں کو صرف اس حد تک کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے غم وغصہ کے اظہار میں کئی جگہ اس اعتدال اور سنجیدگی کا دامن چھوڑ دیا جو رسولؐ اللہ کے نام پر کیے جانے والے کسی بھی احتجاج کے لئے لازمی شرط ہے۔ اس کی ذمہ داری یورپ کے ان ملکوں اور معاشروں کے ''سیکولر کٹر پن' پر زیادہ عائد ہوتی ہے جو اظہار کے حق کو انسانی اور معاشرتی خلا سے متعلق سمجھتے ہیں اور اپنے سوا دیگر انسانوں، معاشروں اور عقیدوں کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔ کارٹون بنانے والوں کا مبینہ طور پر یہ کہنا کہ انہیں اپنی اس فکاحیہ اور طنزیہ کوشش کے خلاف اس شدید ردعمل کا اندازہ نہیں تھا، اس بات کو مزید تقویت دیتا ہے کہ یہ لوگ اور ان کا معاشرہ اپنے سوا دوسرے لوگوں کی موجودگی سے کس قدر لاتعلق اور بے حس ہو چکے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایسے بہت سے ملکوں اور معاشروں میں حضرت عیسیٰ کی اہانت قانوناً قابل گرفت اور شاید قابل سزا بھی ہے۔

دوسری طرف ان کارٹونوں کی اشاعت اور اس کے خلاف مسلمانوں کے شدید ردعمل پر ہندوستان سمیت کئی ملکوں میں جو علمی اور علمی نما بحث اخباروں اور دیگر ذرائع ابلاغ میں چھیڑی گئی وہ اصلاً ہونی ہی نہیں چاہئے تھی کہ یہ اصول اظہار کی آزادی اس حد تک ہے جہاں وہ کسی اور کے عقیدہ یا جذبات پامال نہ کرے۔ آج سے نہیں، صدیوں سے مہذب معاشروں میں تسلیم شدہ رہا ہے۔ یہ درست ہے کہ اس بحث کو جواز مسلم ردعمل کی بے اعتدالیوں اور اس عام بدگمانی سے حاصل ہوا جو اس وقت دنیا بھر میں مسلمانوں کے خلاف پائی جاتی ہے مگر اس بحث میں شریک 'دانش وروں' کو یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہئے کہ کسی خاص وقت اور صورت حال میں کسی ایک طبقہ کے کسی خاص اقدام سے افکار

واقدار کی مسلمہ حیثیت متاثر نہیں ہوتی۔ اس کے باوجود اس بحث کا یہ ایک مثبت پہلو ضرور ہے کہ اس سے ساری دنیا میں اظہار کے حق اور اس کی حدود کے بارے میں ایک نئے سرے سے غور وفکر کو جنبش ملی ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ مسلم دنیا بھی اپنے اسلامی اصولوں اور تہذیبی اقدار کی روشنی میں اس غور وفکر کو بامعنی بنانے میں حصہ لے گی۔

پروفیسر رحمت اللہ خان: شکریہ پروفیسر اختر الواسع صاحب ! آپ نے اپنی تقریر میں نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ اس بات پر تاکید کی کہ بنیادی طور پر آزادی کی بات ہر مذہب میں موجود ہے اور مذہب اسلام میں اس کا خصوصی اہتمام کیا گیا ہے۔ آپ نے نہایت خوش اسلوبی سے یہ واضح کر دیا کہ کس جگہ آزادی بیان کی حد ختم ہوجاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس آزادی پر یہ پابندی بھی نظر آئے گی کہ آپ اپنی مذہبی آزادی کے ذریعہ دوسرے لوگوں کو اذیت نہیں پہونچا سکتے۔ اب میں محترم اقبال انصاری صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

پروفیسر اقبال انصاری صاحب:

شکریہ رحمت اللہ خان صاحب ! در اصل میری تقریر کا موضوع ''آزادی بیان کی حدود'' ہے : انسانی حقوق کے معیاروں کو عالمی تکفیر و بے حرمتی قوانین کی ضرورت ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ عام معافی فراہم کرنے والی عالمی تنظیم Amnesty international نے ، جو اہل یورپ کی آزاد خیالی کی نمائندگی کرتی ہے، ڈنمارک اخبار ''Jylland Pasten'' میں پیغمبر اکرمؐ کے سلسلہ میں توہین آمیز کارٹون کی اشاعت پر اپنے ردعمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے نفرت انگیز بیان سے تعبیر کرتے ہوئے، اس پر قانونی پابندی لگانے کا مطالبہ کیا تھا۔

آیئے یہ دیکھا جائے کہ ڈنمارک حکومت اور متعلقہ اخبار کا یہ دعویٰ کہاں تک صحیح ہے کہ اگرچہ متعلقہ اخبار دنیا کے لاکھوں مسلمانوں سے معذرت خواہی کر چکا ہے لیکن متعلقہ فنکار اور اخبار کو کسی قسم کی کوئی سزا اس وجہ سے نہیں دی جاسکی کہ ان لوگوں نے کوئی جرم نہیں کیا بلکہ اپنے حق آزادی بیان کا استعمال کیا ہے کیونکہ ICCPR نامی عالمی قرار داد کی ۱۹ ویں دفعہ میں ان لوگوں کو نہایت واضح لفظوں میں آزادی بیان کا حق دیا گیا ہے۔ حالانکہ اس میں یہ بھی صاف لکھا ہے کہ یہ حق، حق مطلق کی حیثیت نہیں رکھتا ہے۔ اس دفعہ کے بند ۳ میں لکھا ہے کہ حق رائے دہندگی اور حق آزادی اظہار خیال

کا استعمال کرتے وقت اس سے وابستہ خصوصی فرائض و ذمہ داریوں کا بھرپور خیال رکھنالازمی ہے۔ لہٰذا پابندیوں کو نگاہ میں رکھے بغیر ان حقوق کا استعمال نہ کیا جاناچاہیۓ کیونکہ یہ پابندیاں لازمی اور قانونی ہیں۔

الف: دوسروں کے حقوق اور ان شہریوں کا احترام کرتے ہوئے اس حق کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔

ب: قومی امن وسلامتی اور عوامی نظم وانتظام (Public Order) یعنی عوامی صحت وسلامتی اور اخلاقیات کی حفاظت کے ساتھ اس حق کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔

دفعہ ۲۰ کے بند ۲ میں حکومتی اداروں پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ قانونی اعتبار سے ایسی تمام چیزوں کوممنوع قرار دیدیں جن سے قومی ،نسلی یا مذہبی منافرت کی وکالت ہوتی ہو یا تفریق ، خصومت یا شدت پسندی کی حوصلہ افزائی کا امکان ہوتا ہو۔ اقوام متحدہ انسانی حقوق کمیٹی کے عام تبصرہ ۔ ۱۱ میں آزادی بیان پر مشتمل ان دفعات کے سلسلہ میں یہ دہرایا گیا ہے کہ حکومتی اداروں کا فریضہ ہے کہ وہ قومی، نسلی اور مذہبی منافرت پھیلانے والی حرکتوں کی ممنوعیت کے سلسلہ میں لازمی قانون وضع کریں۔

آیئے یہ دیکھا جائے کہ حکومتی اداروں نے قومی ،نسلی اور مذہبی منافرت پھیلانے والی حرکتوں کے خلاف قانون سازی کے فریضہ کوکس حد تک انجام دیا ہے ؟ مغرب میں جس مطلق آزادی بیان کادعویٰ کیا جارہا ہے اس کے برعکس یورپی اور امریکی ملکوں میں ایسےقوانین موجود ہیں جن کے ذریعہ ایسی چیزوں کوممنوع قرار دیا گیا ہے جس کو اکثریت سیاسی طورپر ناقابل اجازت خیال کرتی ہے یا جو اس کے نزدیک محترم ہے۔ مثلاً خود ڈنمارک میں کسی شناخت شدہ فقہ کے مذہبی عقائد کی توہین وبے احترامی کی ممنوعیت کا قانون موجود ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ اس ملک کے قانون میں مسلمانوں اور دیگر مذہبی عقیدہ کے حامل ہزاروں لوگوں کو شناخت شدہ مذہبی فرقہ کا درجہ حاصل نہیں ہے۔

نیدر لینڈ نامی ملک میں ''حقارت آمیز تکفیر'' قانونی اعتبار سے کاملاً ممنوع ہے لیکن فلم ڈائیرکٹر ''Theo van gogh'' کے خلاف اس قانون کا استعمال نہیں کیا گیا بلکہ اس کو اس بات کی بھرپور آزادی فراہم کی گئی کہ وہ مسلمانوں کی اعلانیہ بے احترامی اور مذمت کرے اور ان کے خلاف مخاصمت ودشمنی کوفروغ دے۔ کچھ مسلمانوں کے ذریعہ اس فلم ڈائریکٹر کےقتل کے بعد ان لوگوں نے متعلقہ قانون کو تمام لوگوں کے لئے یکساں طورپر نافذ کرنے کی بات شروع کردی ۔ اٹلی میں مذہب کی

اعلانیہ اور عوامی بے احترامی ممنوع قرار دی گئی ہے لیکن یہ طے نہیں ہے کہ اس فہرست میں اسلام کو شامل کیا گیا ہے کہ نہیں۔ جرمنی اور آسٹریا میں ''یہودی قتل عام'' کی تکذیب اور ہٹلر کی تعظیم ممنوع قرار دی گئی ہے۔ اس قانون کے بموجب David Irvin نامی نامور مورخ کو اسٹریا میں تین سال کی قید کی سزا دی گئی ہے کیونکہ اس نے یہودی قتل عام کو غیر مصدقہ ثابت کیا ہے۔ اسی طرح فرانس کے ایک اشتہار میں Leonardo Da Vinci کی Last Supper کی ہزلیہ تصویر کشی کو عدالتی حکم کے ذریعہ ممنوع قرار دیدیا گیا ہے کیونکہ اس سے لوگوں کے قلبی عقائد کو ٹھیس پہونچتی ہے۔ تصویر کشی کرنے والے نے اس فن پارہ میں ''یہودا'' کے علاوہ ہر ایک کو عورت کی شکل میں پیش کیا ہے۔

برطانیہ میں مسجدوں میں اپنی تقریر اور سرگرمیوں کے ذریعہ غیر مسلموں اور یہودیوں کے خلاف نسلی منافرت پھیلانے اور قتل وغارتگری کو فروغ دینے کے جرم میں حمزہ الماستری کو سات سال کی قید بامشقت کی سزادی گئی جبکہ اس سے قبل برطانیہ کی قومی سیاسی پارٹی کے دوممبروں کو چھوڑ دیا گیا جو اسلام کے خلاف لوگوں کے جذبات کو بھڑکانے میں لگے ہوئے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آزادی مطلق مغرب میں ہر جگہ واجب التعظیم نہیں ہے۔ کسی جرم کو بڑی آسانی سے سنگین جرم قرار دیا جاسکتا ہے، اگر اس کی وجہ سے اس کے پسندیدہ نظام کو خطرہ لاحق ہو۔ دوسری طرف یہ بڑی سے بڑی گڑبڑی اور لاموزونیت کو برداشت کرسکتی ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ جس فرد کو نشانہ بنایا گیا ہے اس کا تعلق چھوٹی اقلیتی جماعت سے ہو۔

ہندوستان میں آزادی بیان پر مناسب پابندیاں لگائی گئی ہیں جو تعزیرات ہند کی دفعہ 153-A کے ذیل میں درج ہیں جس میں مختلف نسلی، مذہبی، لسانی، علاقائی اور ذات برادریوں کے درمیان نفرت، عداوت، بدگمانی اور لاموزونیت کو فروغ دینا شامل ہے۔ دوسری طرف قانون کی دفعہ 295-A کے تحت ایسی تقریر اور عملی سرگرمیوں کو جرم قرار دیا گیا ہے جس کی وجہ سے معاشرہ کے دوسرے باشندوں کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگتی ہو اگر چہ اس میں مقرر کے کینہ توز اور دیدہ ودانستہ ارادہ کی شمولیت لازمی قرار دی گئی ہے۔ ہندوستان میں طریقہ یہی رہا ہے کہ اکثریتی طبقہ نے گنے چنے معاملوں میں اس قانون کا استعمال کیا ہے اور مسلمانوں اور اسلام کے خلاف نفرت پھیلانے والوں کو بالعموم سزا کے خوف سے نڈر ہوکر اپنے کام میں سرگرم رہنے کی سہولت حاصل رہی ہے۔ اس رویہ کی اعلیٰ عدالتی اداروں سے صادر ہونے والے احکام کی وجہ سے غیر معمولی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ مثلاً شدت

پسند ہندو قومی پارٹی کے سربراہ بال ٹھاکرے اپنے رسالہ ''سامنا'' کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہمہ تن سرگرم رہے ہیں چنانچہ جب بمبئی ہائی کورٹ اور اس کے بعد سپریم کورٹ سے ان کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی اجازت طلب کی گئی تو اس درخواست کو نامنظور کرتے ہوئے یہ کہا گیا کہ اس سے پرانے گھاؤ تازہ ہوجائیں گے۔

بہرحال جب نفرت پھیلانے والی تقریروں کے خلاف قانونی پابندیوں کا مختصر سا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ دنیا کے بہت سے ملکوں میں جہاں مسلمان اقلیت کی حیثیت سے زندگی بسر کررہے ہیں، مذہبی منافرت کے خلاف قوانین تو موجود ہیں لیکن یا تو ان قوانین کا باقاعدہ استعمال نہیں کیا جاتا ہے، یا لازمی شناخت کے فقدان کی وجہ سے اسلام اور مسلمانوں کے سلسلہ میں ان قوانین کا اطلاق نہیں ہوتا۔اسی طرح اکثریتی سیاسی وعدالتی ماحول کی وجہ سے اسلام کے خلاف زہر اگلنے والے مصنفین مقررین اور فنکاروں کو نڈر ہوکر کام کرنے کی عملی سہولتیں حاصل ہیں۔

ان حالات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے کثرت وجود کی تینوں سمتوں پر عملی اقدام کی ضرورت ہے :

۱۔موجودہ قوانین کی لازمی تقویت کے ساتھ عالمی سطح پر موثر نئے قوانین کی تشکیل۔

۲۔تعلیم اور وسائل ابلاغ عامہ کے ذریعہ سماجی ، ثقافتی اور سیاسی ماحول کی تبدیلی کے لئے لازمی کوشش۔

۳۔ مذاہب اور عقائد کے درمیان با مقصد مذاکرہ کے ذریعہ موجودہ مذہبی برادریوں کے منفی رجحانات کوختم کرنے کی کوشش، جن کو موجودہ سیاسی ماحول میں دوبارہ طاقتور بناکر پیش کیا جارہا ہے۔

اس سلسلہ میں ڈربن اعلانیہ اور ۲۰۰۱ء میں نسل پرستی کے خلاف منعقد عالمی کانفرنس میں بالعموم مذہبی غیر رواداری اور سیاست واسلام کے خلاف ہونے والی سرگرمیوں کا ذکر ہے جس میں یہودیوں مسلمانوں اور عرب برادریوں کے خلاف شدید اور مسلحانہ سرگرمیاں شامل ہیں۔ اس سلسلہ میں اس ماحول کی مکمل شناخت لازمی ہے جس میں نفرت انگیز تقریر پرورش پاتی ہے۔اس سلسلہ میں کئے جانے والے عملی اقدام کے تقاضہ ہیں کہ بین الاقوامی سطح کے تمام فنکار، عدالت ، مساوات، انسانی وقار اور مساوات ومختلف ثقافتی اقدار کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے اور حکومتوں سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ سیاست مخالف عرب دشمن اور اسلام کشی پر مبنی سرگرمیوں کی روک تھام کا باقاعدہ اہتمام کریں اور نسل پرستی کو فروغ نہ حاصل ہونے دیں۔

مساوی احترام ووقار ہر مذہبی برادری کا بنیادی حق ہے۔ ان کے مقدس عقائد ، شعائر اور مقامات

وعلامات پر حملہ درحقیقت اس بنیادی حق کی پامالی کے مترادف ہے بالخصوص جب ان اقلیتی فرقوں کو ہمیشہ غلام بنائے رکھنے کی غرض سے ان کے خلاف عمداً مذہبی نفرت پھیلانے کا کام کیا جاتا ہے اور اس نفرت انگیز پروپگنڈہ کو ایک سیاسی ایجنڈے کی شکل میں بروئے کار لایا جاتا ہے۔ یہ کوئی نئ بات نہیں ہے بلکہ انسانی تاریخ کے ہر دور میں اس قسم کی حرکتوں کا وجود نظر آتا ہے۔عہد قدیم میں بادشاہ اور حاکمان جنگ مفتوح قوموں کے دیوی دیوتاؤں اور ان کے مندروں کی بے حرمتی کیا کرتے تھے۔ یہ ان لوگوں کو محکوم بنائے رکھنے کا کھیل تھا اور موجودہ دور میں عالمی اطلاعاتی تکنیک کی غیر معمولی ترقی کی وجہ سے اس میں مغربی آزاد خیالی اور اونچے درجہ کی سیکولریت کا اضافہ ہوگیا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان قوم مجاہدہ نفس سے کام لیتے ہوئے یہ غوروفکر کرے کہ ایسی غیر سیاسی مضحکہ انگیز صورتحال کا مقابلہ کیسے کریں کہ جو چیزیں کل ان مصنفین اور ماہر فنکاروں کی نظر میں مقدس رہی ہوں آج وہ اس کے بارے میں آزادانہ طور پر اپنے ناپسندیدہ خیالات کا اظہار کریں، اگرچہ کسی کو تکلیف دینا ان کے ارادہ میں شامل نہ ہو۔ آخر ان کے درمیان خط فاصل کیسے قائم کی جائے؟ موجودہ صورتحال کا ایک تقاضہ یہ ہے کہ ایسے قوانین بنائے جائیں جن کے بموجب مقدسات مخالف آزادانہ تقریر کو تو جرم قرار نہ دیا جائے لیکن میڈیا کے ذریعہ اس تقریر کی تبلیغ واشاعت پر پابندی لگادی جائے۔ دوسرے لفظوں میں مصنف کے بجائے میڈیا اور نشریاتی اداروں پر پابندی عائد کی جائے۔ مثلاً مصنف کو ''خدا مرگیا'' لکھنے کی سزا نہ دی جائے لیکن ریڈیو اور ٹیلویژن کے ذریعہ اس کی اشاعت روک دی جائے تاکہ مسلمان اور دیگر خدا پرست اقوام کے مذہبی جذبات کو مجروح ہونے سے بچا لیا جائے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ اس منصوبہ بند بے احترامی اور توہین کے خلاف اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے مسلمانوں کو اپنے اعتراض آمیز مظاہروں کی نوعیت اور طریقۂ کار پر بھی کڑی نظر رکھنی ہوگی تاکہ ان کی کوئی بھی حرکت اخلاقیات اور قانون کی سرحدوں کو منہدم نہ کرسکے اور وہ جائز واخلاقی دائروں کے اندر اپنے غم وغصہ کا اظہار کرسکیں۔ مسلمانوں کو یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ انہوں نے اپنے غیر مسلم ہموطن قوموں کو کس حد تک آزادی اور برابری کا درجہ دے رکھا ہے اور مسلمانوں کے درمیان اقلیتی اسلامی جماعت کو یکساں آزادی و برابری کی سہولت حاصل ہے کہ نہیں؟ وہ اپنے ملک میں مذہبی اور ثقافتی تنوع اور اختلاف کو کس حد تک تسلیم کرنے اور فروغ دینے کیلئے آمادہ ہیں۔

مجھے اس بات سے غیر معمولی خوشی ہورہی ہے کہ انسانی حقوق کے سلسلہ میں ۱۹۸۱ء میں جو آفاقی اسلامی اعلامیہ شائع کیا گیا تھا اس کی XII-C دفعہ میں عقائد، فکر اور تقریر کی آزادی کا حق اس بات کی ضمانت فراہم کرتا ہے کہ کوئی کسی دوسرے کے مذہبی عقائد کی توہین و بے احترامی نہ کرے گا اور کوئی کسی کے خلاف عوامی مخاصمت کو فروغ نہ دے گا بلکہ دوسرے لوگوں کے مذہبی عقائد کا احترام ہر مسلمان کا ذاتی فریضہ ہوگا۔

پروفیسر رحمت اللہ خان : بہت بہت شکریہ پروفیسر اقبال انصاری صاحب۔ آپ نے علی گڑھ سے یہاں تک کا سفر اختیار کیا اور ہم لوگوں کو ان مفید وکار آمد مطالب کی طرف متوجہ کیا۔ اب میں اقبال حسین صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ زیر بحث موضوع کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔

پروفیسر اقبال حسین صاحب:

میں اپنے بیان کے ابتدائی مرحلہ میں خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران کے ڈائریکٹر ڈاکٹر مظفری صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے ہم لوگوں کو تبادلۂ خیال کا موقع فراہم کردیا۔ درحقیقت پروفیسر انصاری، آر۔ پی۔ سنگھ اور شاہد مہدی صاحب وغیرہ اپنے دانشورانہ خیالات کے ذریعہ موضوع کے اکثر پہلوؤں کو پوری طرح واضح کرچکے ہیں۔ ملیشیا اور سنگاپور کے واقعات تو آپ لوگوں نے سن لئے۔ میں سردست تنزانیہ کا اپنا ایک ذاتی تجربہ آپ لوگوں کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ تنزانیہ کے توزا زیبہ نامی علاقہ میں واقع ایک ہندو ہوٹل میں، میں اپنے دوستوں اور گھر والوں کے ساتھ داخل ہوا۔ اس ہوٹل میں صرف دال سبزی کا انتظام تھا اور گوشت والی غذائیں پوری طرح ممنوع تھیں۔ ہمارے دوست اپنے گھر سے گوشت پکوا کر لائے تھے۔ ہوٹل کے خدمت گزاروں نے مالک کو اطلاع دیدی کہ کچھ لوگ ہوٹل میں گوشت خوری کرنا چاہتے ہیں۔ مالک نے ہم لوگوں کا سارا کھانا ضبط کرلیا اور اپنی غیر معمولی ناراضگی بھی ظاہر کی۔ ہم لوگ ہوٹل مالک کے اس برتاؤ کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ہمیں اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ ہندوستان کے کسی بھی ہوٹل میں ہمارے ساتھ یہ سلوک نہ کیا جاتا جبکہ تنزانیہ مسلمانوں کا ملک ہے اور وہاں اقلیتوں کو مقام ومرتبہ حاصل ہے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ متنوع فرقوں والے ملک میں اکثریتی فرقہ اقلیتی فرقہ کا

با قاعدہ احترام کرتا ہے۔

پروفیسر انصاری وغیرہ نے اپنی تقریر کے دوران ''Islamphobia'' جیسی اصطلاح کے ذریعہ اسلام سے ترسیدہ اور خوفزدہ کرنے کی بات کہی ہے۔ میں دوبارہ ان خیالات کی تکرار سے پرہیز کرتے ہوئے اصل بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ دراصل بنیادی مسئلہ توہین آمیز کارٹون کی اشاعت سے وابستہ ہے اور جیسا کہ شاہد مہدی صاحب نے فرمایا کہ اس سلسلہ میں ہم لوگوں کے پاس دو متبادل ہیں: پہلے تو یہ طے کرنا ہوگا کہ یہ سیاسی مسئلہ ہے یا قانونی مسئلہ۔ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ یہ سیاسی مسئلہ ہے تو شاہد صاحب پہلے ہی بیان کرچکے ہیں کہ مسئلہ کی تحقیق ایک اعلیٰ سطحی کمیٹی کے سپرد کردی گئی ہے جو جلد ہی اپنی رپورٹ داخل کردے گی۔ اگر اس کو قانونی مسئلہ قرار دیا جائے تو یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ اس ضمن میں جو بین الاقوامی قوانین موجود ہیں ان میں ایسا کون سا نقص ہے جس کی وجہ سے یہ واقعہ قانونی چارہ جوئی کے ذریعہ حل نہیں کیا جاسکتا۔ اس سلسلہ میں دو عالمی اسناد کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے پہلی سند انسانی حقوق سے وابستہ عالمی اعلامیہ ہے جس کی دفعہ ۱۸ اور ۱۹ میں اس مسئلہ کی طرف پوری توجہ دی گئی ہے اور دوسری سند سماجی اور سیاسی مسائل ومشکلات پر ہونے والا عالمی معاہدہ ہے۔ ہمارا ملک ہندوستان بھی اس معاہدہ میں شامل تھا اور اس معاہدہ کی وجہ سے گھریلو قوانین میں بھی لازمی تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ انسانی حقوق کے عالمی اعلامیہ کی دفعہ ۱۹ میں مکمل وضاحت کے ساتھ یہ بات کہی گئی ہے کہ ہر شخص کو اپنی رائے قائم کرنے اور اپنے خیال کے ظاہر کرنے کی مکمل آزادی حاصل ہوگی۔ اس سلسلہ میں ہر شخص کو اطلاع کی جستجو، حصول اور دوسروں تک منتقل کرنے کی آزادی حاصل ہوگی اور وہ وسائل ابلاغ کے ذریعہ اپنے خیال کو سرحد پار کے علاقوں میں بھی منتقل کرسکتا ہے۔ اس اعلامیہ کی دفعہ ۱۸ میں آزادی فکر اور آزادی مذہب کی بات کہی گئی ہے۔ اس حق کے ذیل میں ہر شخص کو اپنے مذہب کے تبدیل کرنے کا حق حاصل ہوگا جس کا استعمال وہ انفرادی طور پر یا اجتماعی انداز میں مذہبی تعلیمات کے بیان اور ان پر عمل کے ذریعہ ظاہر کرسکتا ہے۔ دفعہ ۱۹ کی ذیلی دفعات ۱ اور ۱۱ میں کہا گیا ہے کہ ہر شخص کو آزادی اظہار خیال کا مکمل حق حاصل ہوگا جس میں خیال کی تلاش اور اس کا حصول وابلاغ شامل ہوگا اور وسائل ابلاغ کی حیثیت سے تحریر تقریر یا فنکاری کے نمونوں کا استعمال کیا جاسکتا ہے اور ان نمونوں کو بیرون ملک بھی

ارسال کیا جاسکتا ہے۔ اس قانون کی ذیلی دفعہ II میں اس حق سے فائدہ اٹھانے والے ہر شخص کے فرائض اور اس کی ذمہ داریوں کی نشاندہی کی گئی ہے جس میں وہ قانونی پابندیاں بھی شامل ہیں جس کے تحت دوسروں کے حق کا احترام وتحفظ ، قومی امن وسلامتی کا تحفظ اور سماجی امن وامان کی حفاظت مقصود ہے۔ جہاں تک حق آزادی مذہب کا تعلق ہے دفعہ ۱۸ میں کہا گیا ہے کہ ہر شخص کو فکر وخیال کی آزادی حاصل ہوگی اور یہ اس کا بنیادی حق ہوگا۔ اس بنیادی حق کے ذیل میں اسے پسندیدہ دین ومذہب واعتقاد اختیار کرنے کی آزادی ہوگی۔ اپنے پسند یدہ دین کے انتخاب کے ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے عقیدہ کے مطابق عباداتی اعمال انجام دے سکتا ہے اور اس کی تعلیمات کو ہر جگہ ظاہر کرسکتا ہے۔ ذیلی دفعہ III میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان حقوق کا استعمال کرتے وقت اس کے سلسلہ میں جو قانونی پابندیاں لگائی گئی ہیں ان کی مکمل پیروی بھی لازم ہوگی مثلاً عوامی امن وسلامتی کی حفاظت ، اخلاقیات کی پیروی اور دوسروں کے بنیادی حقوق اور ان کی آزادی کی محافظت کے بغیر ان حقوق سے فائدہ اٹھانا ممکن نہ ہوگا۔ اس طرح یہ بات واضح ہوگئی کہ عالمی معاہدوں اور سرکاری بیانات میں آزادی بیان اور آزادی مذہب جیسے بنیادی حقوق کے ساتھ ہی ساتھ ان سے وابستہ پابندیوں اور قانونی ممنوعات کا ذکر پوری تاکید کے ساتھ موجود ہے۔

اب اس سلسلہ میں ہندوستانی صورتحال کا تجزیہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستانی آئین کی دفعہ ۱۹ ذیلی دفعہ I-A میں چھ حقوق کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو اس طرح ہیں : ملک کے تمام شہریوں کو اظہار خیال کی آزادی ، پرامن انداز میں ایک انجمن یا یونین کی حیثیت سے ایک جگہ تمام لوگوں کے اجتماع کی آزادی ، ہندوستان کے ہر علاقہ میں آمد و رفت کی آزادی، ہندوستان کے کسی حصہ میں رہائش کی آزادی ، اپنے پسندیدہ کام اور پیشہ کے انتخاب کی آزادی، حاصل ہوگی۔ سردست ہم لوگوں کا سروکار آزادی اظہار خیال سے ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خیال اور اس کا اظہار کیا ہے؟ ۱۹۷۲ء میں سپریم کورٹ کے جج جناب Justice Mathe Jay نے آزادی اظہار خیال کی تعریف بیان کی ہے۔ اگر آزادی بیان کی تعریف معلوم ہوجائے تو مسئلہ کارٹون کا حل آسان ہوجائے گا اور ہمیں اس بات کا پتہ چل جائے گا کہ موجودہ کارٹون معاملہ کن اصول وقوانین کی روشنی میں حل کیا جاسکتا ہے اور اس قانون کو بین الاقوامی سطح پر بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ جسٹس میتھی جے کہتے ہیں کہ اہم باب یہ نہیں

کہ اظہار خیال کی آزادی نہایت مفید اور کار آمد چیز ہے بلکہ اس کے بغیر جمہوری نظام ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ کسی بھی جمہوریت کا بنیادی ڈھانچہ یہ ہے کہ سماج میں زندگی بسر کرنے والے عام لوگ حاکم بھی ہیں اور محکوم بھی، رعایا بھی ہیں اور سرکار بھی۔ یہ عوام ایک دانشمندانہ فیصلہ کر سکتے ہیں۔ لیکن اہم بات یہ ہے کہ جس چیز کے بارے میں انہیں فیصلہ کرنا ہے اس سے وابستہ تمام پہلوؤں کو ان کے سامنے واضح انداز میں پیش کر دیا جائے تاکہ وہ حقیقت تک رسائی حاصل کر لیں۔ یہ عوام کا سیاسی حق ہے کہ فیصلہ سے قبل انہیں تمام حقائق سے آگاہ کر دیا جائے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو آزادی فکر وخیال کا بنیادی پہلو یہی ہے اور اظہار خیال کی آزادی بھی اسی سے وابستہ ہے۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد آئین کی تدوین عمل میں آئی اور اس میں یہ دفعات شامل کی گئیں لیکن جیسا کہ ایم پی سنگھ صاحب نے اشارہ کیا کہ حق آزادی اظہار خیال کا تفصیلی تجزیہ آئین میں موجود نہیں ہے بلکہ پہلی بار عدالت عالیہ نے رمیش تھاپر بنام حکومت مدراس اور برج بھوشن بنام حکومت دہلی مقدمہ میں ۱۹۵۰ء میں اس پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ عدالت عالیہ نے اس سلسلہ میں یہ تحریر کیا کہ آئین کی دفعہ ۱۹ کی ذیلی دفعہ 19-A میں آزادی بیان اور اظہار خیال کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ قتل اور دیگر جرائم کے مرتکب افراد بھی اس کے ذریعہ اپنے معاملہ کی وکالت وپیروی کر سکتے ہیں۔ لیکن جسٹس فضل علی نے عدالت عالیہ کے اس فیصلہ سے اتفاق نہ کرتے ہوئے اپنے علیحدہ فیصلہ میں یہ بات کہی کہ اگر آزادی اظہار خیال عوامی نظم وضبط پر اثر انداز ہوتی ہے تو اس کی وسعت میں مناسب اور لازمی کمی کی جاسکتی ہے اور اس کے دائرہ کار کو محدود کیا جاسکتا ہے۔ جسٹس فضل علی کے اس فیصلہ کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ۱۹۵۱ء میں آئین میں ترمیم کرتے ہوئے دفعہ 19-A میں اس جملہ کا اضافہ کر دیا گیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ عوامی نظم وضبط کیا ہے؟ اس کی وضاحت بھی ۱۹۷۲ء میں سپریم کورٹ کے ذریعہ کانوسواس بنام حکومت بنگال مقدمہ میں یوں بیان کی گئی کہ عوامی نظم وضبط کا درجہ عام قانونی نظم وانتظام سے بالاتر ہے۔ یہ عمومی امن وسلامتی کا مترادف اور ہم معنی لفظ ہے۔ اگر کسی عمل سے عوامی نظم وضبط اور امن وسلامتی متاثر ہونے لگے تو مذکورہ دفعہ کے بموجب وہ ممنوع ہوگا۔ اور اگر کسی عمل سے کوئی فرد متاثر ہوتا ہے تو اس کو عمومی امن وسلامتی کی خلاف ورزی نہیں کہا جاسکتا۔ اب آزادی مذہب کے بارے میں بھی قدرے غور وفکر لازمی ہے: آئین کی دفعہ ۲۵ میں

پسندیدہ مذہب کی عملی پیروی کی بات کہی گئی ہے اور پسندیدہ مذہب کے انتخاب و پیروی کی آزادی کی مزید وضاحت مختلف عدالت گاہوں کے ذریعہ کی گئی ہے۔ میں سردست ثقافتی اختلاف وتنوع اور سماجی توازن وہم آہنگی کی طرف آپ لوگوں کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں ۔ ہم لوگوں کے سامنے دو معاملات ایسے ہیں جن کی طرف پروفیسر ایم۔ پی سنگھ اور پروفیسر انصاری دونوں نے اشارہ کیا ہے۔ ایک معاملہ میں یہ کہا گیا کہ اگر امام بخاری یہ اعلان کرتے ہیں کہ آپ لوگ ہمیں ووٹ دیجئے کیونکہ ہم مسلمان ہیں اور ہمارے مقابلہ میں جو امیدوار ہے وہ ہندو ہے لہذا اس کو ووٹ نہ دیں۔ اسی طرح بال ٹھاکرے کا اس بنیاد پر ووٹ مانگنا کہ وہ ہندو ہے اور ہندوؤں کو اپنے ہندو امیدواروں کی حمایت کرنی چاہئے۔ یہ معاملہ سپریم کورٹ تک گیا اور سپریم کورٹ نے یہ وضاحت پیش کی کہ ہندو ازم ایک طرز زندگی ہے اور اس سے توہین و مذمت کی نشاندہی نہیں ہوتی اور نہ ہی اس پر نفرت کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں بڑی صفائی کے ساتھ جسٹس کرشنا آئیر Justice Krishna Aiyer کی زبان میں اپنی بات کہنا چاہتا ہوں کہ آخر کار جج حضرات بھی انسان ہیں اور فیصلہ کا جج کی ذہنیت سے متاثر ہونا کوئی غیر فطری امر نہیں ہے۔ یہ بات بھی اثر انداز ہوتی ہے کہ خاندانی پس منظر کیا رہا ہے اور وہ کون سے نقوش ہیں جو اس کے ذہن میں محفوظ رہ گئے ہیں۔

بہر حال اب ثقافتی رنگارنگی اور سماجی توازن کے سلسلہ میں محمد حنیف قریشی بنام حکومت بہار والے مقدمہ کو بعنوان مثال پیش کیا جاسکتا ہے جس کا ذکر AIR-1958 میں درج ہے۔ محمد حنیف قریشی نے عدالت میں یہ مقدمہ پیش کیا کہ عید قرباں کے موقع پر گائے کی قربانی اس کے مذہبی عقیدہ کا اہم اور اٹوٹ حصہ ہے۔ پس حکومت کی طرف سے بنائے گئے گائے کشی مخالف قانون کی وجہ سے ہماری مذہبی آزادی میں خلل واقع ہوتا ہے لہٰذا یہ قانون ختم کیا جائے۔ عدالت نے محمد حنیف کے مقدمہ کو خارج کرتے ہوئے یہ فیصلہ سنایا کہ صرف گائے کی قربانی کرنا مذہب اسلام کا لازمی جزو نہیں ہے۔ لہٰذا گائے کشی کا قانون صحیح اور حق بجانب ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی ایسے معاملات ہیں جن میں عدالت نے اپنے فیصلہ سے سماج میں موجود ثقافتی تنوع اور رنگارنگی کی حفاظت کی ہے۔ چونکہ گائے کی قربانی مذہب اسلام کا لازمی حصہ نہیں ہے لہٰذا عدالت نے ثقافتی رنگارنگی کو دھیان میں رکھتے ہوئے یہ حکم جاری کردیا کہ سماجی توازن اور ثقافتی تنوع کی خاطر گائے کشی مخالف قانون کو باقی رکھا جائے۔ جی

ہاں ! اس قسم کے فیصلوں کو عالمی سطح پر بھی لاگو کیا جاسکتا ہے ۔ اس کے علاوہ خود سر سید احمد خان نے بھی مسلمانوں سے یہ اپیل کی تھی کہ ہم مسلمانوں کو اپنے ہندو بھائیوں کے مذہبی جذبات کا احترام کرتے ہوئے گائے کشی سے خود ہی دستبردار ہوجانا چاہیئے۔ ہم لوگوں کے اس عمل سے ثقافتی رنگارنگی اور سماجی توازن برقرار رہے گا۔ اس نمونہ کو بین الاقوامی سطح پر بھی لاگو کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ بات صرف ہندوستانی آئین کی حد تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ۱۹۶۰ء میں تشکیل شدہ Indian Panal Code کے پندرھویں باب میں مذہب سے متعلق جرائم کی بات کہی گئی ہے جس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر ایک شخص کو اپنے مذہبی عقائد کی پیروی کی مکمل آزادی ہوگی لیکن قانونی اعتبار سے کسی کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ دوسروں کے مذہب کی توہین کرے۔ تعزیرات ہند کے پندرھویں باب میں مندرج پانچ دفعات شمارہ 295, 295 A , 296,297, 298 میں عبادت گاہوں کی بے حرمتی اور دیگر مذاہب کی پیروی کرنے والے لوگوں کے مذہبی اجتماعات میں خلل اندازی نیز ان کے مذہبی عقائد کی بے حرمتی وغیرہ شامل ہیں۔ دوستو ! مسئلہ کارٹون کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ یہ ایک ایسا شرمناک جرم ہے جس پر مذکورہ چار دفعات لاگو ہوتی ہیں اور اس کی سزا تین سال کی قید بامشقت اور جرمانہ دونوں ہوسکتی ہے یا دو میں سے ایک ہی سزا پر اکتفا کی جاسکتی ہے۔ عام قانون میں بھی کسی دوسرے مذہب کی تکفیر میں ادا کئے گئے افکار وعقائد کو جرم قرار دیا گیا ہے اور اس کی سزا بھی متعین کی گئی ہے کیونکہ اس سے معاشرہ کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہوجاتا ہے۔ ۱۹۵۷ء میں سپریم کورٹ میں رام جی مودی بنام حکومت یوپی ایک مقدمہ کی سنوائی ہوئی جس میں دفعہ IPC/295A کی آئینی حیثیت کو چیلنج کیا گیا تھا۔ عدالت عالیہ نے اس قانون کو نہ صرف یہ کہ آئین کے مطابق قرار دیا بلکہ یہ کہا گیا کہ اس دفعہ کے ذیل میں جو سزا تجویز کی گئی ہے، اس کا مقصد آئین کے Article 19, Clause 2 میں آزادی بیان پر جو پابندی لگائی گئی ہے، اس کا دفاع مقصود ہے۔ واضح رہے کہ اس سے قبل کی قانونی دفعات کے ذیل میں حق آزادی بیان کی بھرپور ضمانت بھی اہم کی گئی ہے۔

پروفیسر رحمت اللہ خان: بہت بہت شکریہ ۔ درحقیقت وقت کم ہے اور موضوع کے بارے میں اظہار خیال کرنے والے دانشوروں کی تعداد زیادہ ۔ بہر حال میں Justice A.S. Qureshi سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے دانشمندانہ افکار وعقائد سے نوازیں۔

جسٹس قریشی صاحب:

مظفری صاحب اور تمام دانشوروں کے شکریہ کے ساتھ میں درج باتوں پر اپنے خیالات آپ لوگوں کی خدمت میں پیش کرنے کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہوں :

ا۔ اسلام درحقیقت امن وسلامتی کا مذہب ہے، جو اس کے نام سے بخوبی ظاہر ہے۔ پس ہر مسلمان کا یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں تمام لوگوں کے ساتھ معاملہ کرتے وقت صلح وسلامتی اور عدم تشدد سے کام لے۔ ایک حقیقی مسلمان کے ذہن میں تشدد اور دہشت گردی کا خیال بھی نہیں ابھر سکتا ہے۔ بدقسمتی کی بات ہے کہ مذہب اسلام غلط فہمی ، غلط ترجمانی اور غلط استعمال کا شکار رہا ہے اور صرف غیر مسلموں نے ہی نہیں بلکہ خود مسلمانوں نے بھی اس کی غلط ترجمانی اور اس کے سلسلہ میں غلط فہمی سے کام لیا ہے۔ چنانچہ غیر مسلموں کے ذہن میں اسلام کا ایک غلط عکس قائم ہے کہ یہ مسلمانوں کے ساتھ بے جا سلوک کے جواب میں شدت پسندی اور تشدد کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

۲۔ موجودہ ماحول اور حالیہ تناظر میں مسلمانوں کو پہلے ہی سے دہشت گردی اور غارتگری کی طرف مائل سمجھ لیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ مسلمان جہاد کے بہانہ انسانی زندگی اور ان کی املاک کے لئے غیر معمولی خطرہ بن گئے ہیں۔ مسلمانوں اور غیر مسلم افراد دونوں نے جہاد کو سمجھنے میں غلطی کی ہے اور دونوں کو اس کا حقیقی مفہوم معلوم نہیں ہے۔ جہاد تین گوشہ والی جڑ سے وابستہ ہے جس کے تحت انسان مخلصانہ کوشش کرتا ہے۔ درحقیقت عام آدمی کی زندگی میں جہاد انتہائی موثر اور مفید کردار ادا کرتا ہے۔ یہ محض جنگ اور خونریزی کا نام نہیں ہے۔ یہ محض ایک مقدس جنگ نہیں ہے۔ ایسے مخصوص حالات میں جبکہ مسلمان برادری کا وجود خطرہ میں ہو، اپنے وجود کے دفاع میں جنگ کی جاسکتی ہے اور یہ جہاد میں شامل ہوگا یعنی اپنے دفاع میں جہاد سے کام لینا ضروری ہے۔

۳۔ بین الاقوامی سطح پر ایک فیصلہ کن اور منصوبہ بند سازش کے تحت اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے اور ان کے چہرے پر بدنما داغ لگانے کی ہر ممکن کوشش جاری ہے اور دنیا والوں پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش بھی جاری ہے کہ مسلم برادری دنیا کے تمام لوگوں کے ساتھ جنگ و نبرد آزمائی پر کمر بستہ ہے۔ حالانکہ یہ سفید جھوٹ ہے۔ یہ قرون وسطیٰ کے ان یوروپی عیسائیوں کی ذہنیت کا نتیجہ ہے جو سرزمین فلسطین پر اس سرزمین کے حقیقی مسلمان باشندوں کے خلاف The Crusade یعنی مذہبی

جنگ لڑنے کے لئے آئے تھے اور جو کئی صدیوں تک جاری رہی اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ مذہبی جنگ آج بھی جاری ہے۔ ماضی میں سلطان صلاح الدین ایوبی کے ہاتھوں شکست خوردہ عیسائیوں اور یہودیوں نے اس وقت سے اپنے انتقامانہ جذبات کی تسکین کی خاطر مسلمانوں کی تباہی وبربادی اور قتل وغارتگری کا بازار گرم کررکھاہے۔ بے گناہ فلسطینی مسلمانوں کو ان کے وطن میں ہی نہیں بلکہ ان کی پناہ گاہوں میں بھی نہایت بے رحمی کے ساتھ قتل کیا جارہا ہے۔ اسلام دشمن طاقتوں کی اس ظالمانہ اور بے رحمانہ راہ وروش کو دیکھنے کے بعد بعض مسلمان نوجوانوں پر ایسی بے حوصلگی طاری ہوگئی ہے کہ ایسے شرمناک اور ذلت آمیز ماحول میں زندہ رہنے کے بجائے باعزت موت کو ترجیح دینے لگے ہیں، جوموجودہ اصطلاح میں انسانی بم کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں اور ان نوجوانوں کو دہشت گرد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

۴۔مسلمانوں کو تشدد اور دہشت گردی کے الزام میں جگہ جگہ گرفتار اور قید وبند کے مصائب وآلام سے دوچار کیا جارہا ہے اور اب نوبت یہ آگئی ہے کہ انہیں اپنے قول وعمل سے اس قرآنی ارشاد کی ترجمانی کرنی ہوگی جس میں خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے کہ تمہارادین تمہارے لئے اور ہمارا دین ہمارے لئے ۔ اسلام کی یہ تعلیم درحقیقت نہایت شرافت مندانہ تعلیم اور اسلام کا زرین اصول ہے۔ اگر ساری دنیا کے لوگ فقط اسی قرآنی اصول کے پیرو ہوجائیں۔ بالخصوص اگر دنیا کے تمام مسلمان اس آیۂ کریمہ کا عملی روپ بن جائیں تو عالمی سطح پر موجود بہت سے مسائل خودبخود حل ہوجائیں گے اور عالمی سطح پر وہ صلح وسلامتی قائم ہوجائے گی جس کی طرف اسلام نے برابر نشاندہی کی ہے ۔

۵۔ مذہبی برادریوں کی پر امن باہمی بقا اور سلامتی کے لئے غیر معمولی صبروتحمل اور دوسرے مذاہب اور ان کی پیروی کرنے والوں کے ساتھ رحمدلی اور ہمدردی کا سلوک کرنا ہوگا۔ افسوس کی بات ہے کہ مذہبی معاملات میں مسلمانوں کے صبروتحمل کا درجہ بہت کم ہے۔ پس مسلمانوں پر یہ ذمہ دارری عائد ہوتی ہے کہ وہ مذہبی امور میں مزید صبروتحمل کا مظاہرہ کریں ۔ انہیں جذباتی نہیں بلکہ دانشمندانہ انداز میں اپنے ردّعمل کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک طالب علم کی حیثیت سے میں نے سب سے پہلے George Sale کا ترجمہ قرآن پڑھا تھا جس کے مقدمہ میں اس مترجم نے قرآن اور پیغمبرؐ اسلام پر سخت تنقید کی تھی۔ اور یہ بھی لکھا تھا کہ ’’محمد نے (معاذ اللہ) اپنا جھوٹا مذہب

بنی نوع انسان پر مسلط کردیا ہے''۔ فاضل مترجم کے اس جملہ کو پڑھنے کے بعد میں بوکھلا گیا اور سوچنے لگا کہ ایسے آدمی کو فوری طور پر موت کے گھاٹ لگادینا چاہئے۔ میرے پروفیسر نے کہا کہ اس قسم کے تشدد آمیز خیال کے بجائے تمہیں اسلام کا بھرپور مطالعہ کرنا چاہئے اور اپنے عالمانہ مقالہ کے ذریعہ اس کی تنقید کا دندان شکن جواب دینا چاہئے۔ مجھے یہ مشورہ پسند آیا۔ اس کے بعد میں نے Justice S. Amir Ali کی The Spirit of Islam کا بھرپور مطالعہ کیا۔ پھر K.L.Gauba کی کتاب The Prophet of Desert پڑھی اور اس قسم کی متعدد کتابوں کے مطالعہ کے بعد میں نے ایک مقالہ تحریر کیا جس کی میرے پروفیسر نے بہت تعریف کی۔ اس واقعہ نے میرے ذہن پر جواثر مرتب کیا وہ آج بھی قائم ہے کہ ہم لوگوں کو اسلام کے خلاف لکھی اور کہی گئی باتوں کا مدلل اور دقیق جواب دینے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس کے دو فائدے ہیں: پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ یہ بات اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس کے بعد اسلام دشمن طاقتوں کے پاس ایسا کوئی بہانہ نہ ہوگا کہ جس کے سایہ میں وہ مسلمانوں کا قتل عام کرسکیں۔

اپنی عرضداشت کے آخر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ ہماری زیادہ تر پریشانیاں اور اکثر مصائب وآلام خود بخود کم ہوجائیں گے اگر ہم واقعی حقیقی مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کا اٹل ارادہ کرلیں۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ حقیقی اسلام کی پیروی کے ذریعہ ہم آفاقی انسانی بھائی چارہ کی فکر کو بھی عملی جامہ پہنانے میں معاون ثابت ہوسکتے ہیں۔آج انسانیت صلح وامن کی تلاش میں سرگرداں ہے۔مسلمانوں کو اس سلسلہ میں آگے بڑھنا چاہئے اور عالمی امن وسلامتی کے قیام ودوام کی علمبرداری خود سنبھال لینی چاہئے ۔

پروفیسر رحمت اللہ خاں: قریشی صاحب میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے اس مذاکرہ میں عقل ودانش کے چمکدار موتی بکھیر دیئے۔ اگر وقت کی کمی نہ ہوتی تو آپ کی دلکش گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا اور ہم لوگ آپ کی گفتگو میں محو رہتے۔ بہر حال اب میں ظفر الاسلام خاں صاحب سے التماس کرتا ہوں کہ وہ اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

پروفیسر ظفر الاسلام صاحب:

دراصل اب تک گفتگو میں موضوع سے متعلق تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی جاچکی ہے، پھر بھی

میں محدود اور معینہ وقت کے اندر کچھ باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں ۔ ہم لوگوں کو اس بات کا بخوبی علم ہے کہ آزادی بیان اور آزادی اظہار خیال کا ایک مغربی نظریہ ہے جس کے بموجب حتی کہ مغربی ممالک میں بھی یہ حق ایک حق مطلق کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اس کا استعمال بعض غیر معمولی موثر افراد یا تجارتی اداروں کے ذریعہ کیا جاتا ہے اور عام لوگوں کو اس حق کی اہمیت وافادیت کا زیادہ علم بھی نہیں ہوا کرتا۔ مثلاً امریکہ میں تقریباً ایک درجن نشریاتی کمپنیاں ہیں جو اپنی مرضی کے مطابق اپنے پسندیدہ افکار وعقائد کو لوگوں پر مسلط کئے ہوئے ہیں۔ مغربی دنیا میں زندگی بسر کرنے والا عام آدمی کبھی اس حق آزادی بیان کا اظہار نہیں کرتا ہے بلکہ دولتمند افراد مختلف نشریاتی پروگراموں کے ذریعہ اپنے خیالات کو لوگوں پر مسلط کرنے میں سرگرم رہا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر Robert Mark کو عالمی میڈیا کا شہنشاہ کہا جاتا ہے۔ یہ ساری دنیا کے ٹیلی ویژن چینلوں اور عمدہ پروگراموں کی خریداری میں ہمہ تن سرگرم ہے۔ دنیا کے کسی بھی اخبار یا پروگرام کو منہ مانگی قیمت دے کر خرید لیتا ہے ۔ جب وہ برطانیہ میں داخل ہوا تو اس نے London Times خرید لیا اور اس اخبار میں سب کچھ تبدیل کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اخبار اور میڈیا تجارت کا بہترین وسیلہ ہیں۔ لٰہذا ا سے بھرپور تجارتی فائدہ اٹھانا چاہئے۔ اس کی اس روش کے خلاف مظاہرہ کرتے ہوئے بعض باحوصلہ نوجوان ایڈیٹروں نے The Independent نامی اخبار قائم کرلیا جو آج دنیا کا ایک اہم اخبار تسلیم کیا جاتا ہے ۔

بہر حال میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کچھ لوگ یا کچھ جماعتیں آزادی بیان کے اس نظریہ کا استحصال کررہی ہیں ۔ خود ہمارے ملک ہندوستان میں اب اخبار کا دفتر ایک تجارتی ادارہ ہوگیا ہے ۔ سب سے پہلے اس تجارتی رنگ وروپ کا اظہار Times of India نے کیا اور اس کے بعد سبھی اخباروں نے اس کے نقش قدم کی پیروی شروع کردی۔ اور اب صورتحال یہ ہے کہ موٹی رقم کے حصول کے بعد اکثر موضوعات کو خبروں کی شکل میں پیش کیا جارہا ہے۔ یہاں عام آدمی اور اس کا حق آزادی بیان کہاں چلا گیا؟ اگر مطبوعہ خبر میں قدرے اصلاح اور ترمیم کی بات کہی جائے تو بہ آسانی قابل قبول نہیں ہے بلکہ بڑے اثر ورسوخ کے بعد یہ کام ممکن ہے۔ جب کوئی وکیل عدالت گاہ میں کھڑا کردینے کی دھمکی دیتا ہے تو دوچار سطریں ترمیم میں شائع کردی جاتی ہیں۔

اب میں اسلام اور مسلمانوں کی توہین کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں ۔ یہ بات موجودہ مسئلہ

کارٹون تک ہی محدود نہیں بلکہ صدیوں سے اسلام اور مسلمانوں کی توہین کا لامتناہی سلسلہ جاری ہے، اور ۱۱ ر ستمبر کو رونما ہونے والے افسوس ناک حادثہ کے بعد مغربی دنیا میں زندگی بسر کرنے والا ہر غیر مسلم یہ خیال کرتا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو چاہے کیا جاسکتا ہے۔ پیغمبر کی توہین میں کچھ بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج یوروپ کے اخبارات اسلام دشمن مقالات سے مالا مال دکھائی دیتے ہیں۔ دیکھنا یہ چاہئیے کہ اس سلسلہ میں اسلام کیا کہتا ہے؟ درحقیقت اسلام کی نگاہ میں آزادی بیان، آزادی اظہار خیال اور آزادی مذہب سب مقدس چیزیں ہیں۔ اسلام صاف صاف لفظوں میں یہ اعلان کرتا ہے کہ مذہب میں کسی قسم کے زور یا دباؤ کا گزر نہیں بلکہ ہر آدمی اپنے پسندیدہ مذہب کے اختیار کرنے اور اس کی پیروی کے لئے آزاد ہے۔

پروفیسر رحمت اللہ خاں: اب میں پروفیسر قمر رئیس سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔

پروفیسر قمر رئیس:

چیرمین صاحب کے شکریہ کے ساتھ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ علمی اور کتابی اعتبار سے اس موضوع پر سیر حاصل بحث ہوچکی اور دانشور حضرات آزادی بیان اور حق آزادی مذہب کے سلسلہ میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار بھی کر چکے ہیں، لہٰذا اس نظری اور اصولی بحث کے بعد میں بحث کا عملی رنگ و روپ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میرے دوست نے ٹھیک ہی فرمایا کہ حق آزادی اظہار خیال خود مغربی ممالک میں حق مطلق کا درجہ نہیں رکھتا۔ اقوام متحدہ کی بنیادی اسناد اور خود امریکہ کے آئین میں انسانی حقوق کی طرفداری میں بہت کچھ کہا گیا ہے لیکن ساری دنیا اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ انسانی حقوق کی خلاف ورزی اور پامالی بھی سب سے زیادہ انہیں ملکوں میں پائی جاتی ہے۔ ان ممالک نے صرف اپنی سرزمین پر ہی نہیں بلکہ دنیا کے دیگر ملکوں میں بھی انسانی حقوق کو مجروح اور نابود کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

مرکزی ایشیا میں واقع ملکوں پر امریکہ کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کی وجہ سے انسانی حقوق اور ثقافتی آزادی جیسی مقدس اصطلاحات کو ذاتی اور امریکی مفاد کے لئے استعمال کیا جارہا ہے۔

عالمی سطح پر کہیں بھی تہذیبوں کے درمیان ٹکراؤ یا مشرق ومغرب کے درمیان ٹکراؤ کا ماحول دکھائی

نہیں دیتا بلکہ اصل ٹکراؤ تو تجارتی اور اقتصادی مفاد ومصالح کے درمیان دکھائی دیتا ہے اور یہ ٹکراؤ کسی دو گروہ یا نمائندہ جماعت کے درمیان نہیں ہے بلکہ یہ ٹکراو اس وجہ سے ہے کہ امریکہ دنیا کے تمام اقتصادی اور تجارتی ذخائر پر اپنا قبضہ چاہتا ہے چونکہ یہ ایشیائی ممالک معدنی ذخائر سے مالامال ہیں لہٰذا امریکہ ان پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتا ہے اور وہ ساری دنیا کو للکار رہا ہے ایسے موقع پر ایران کے صدر احمدی نژاد صاحب کو سلام عرض کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے امریکی چیلنج کا مناسب جواب دیا جبکہ دنیا کے دوسرے لیڈران خواب غفلت میں گرفتار ہیں۔

پروفیسر رحمت اللہ خان: بہت بہت شکریہ پروفیسر قمر رئیس صاحب! اب میں اپنے شاگرد عزیز منوج کمار سنہا سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس سلسلہ میں اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں۔

منوج کمار سنہا صاحب:

میں استاد محترم کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ پروفیسر ایم پی سنگھ، پروفیسر اقبال اور پروفیسر اقبال انصاری جیسے نامور اساتذہ کی تقریر وگفتگو کے بعد کچھ عرض کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی تاہم میں سردست عالمی سطح پر ہوئے مختلف معاہدوں اور قراردادوں کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا جن میں سماجی اور سیاسی حقوق کا عالمی معاہدہ، اقتصادی، سماجی اور ثقافتی حقوق کا عالمی معاہدہ، خواتین کے حقوق کے سلسلہ میں امتیازی روش کے خلاف عالمی معاہدہ، حقوق اطفال کا عالمی معاہدہ، نسلی امتیازات کی نابودی کا عالمی معاہدہ اور ۲۰۰۳ء میں منعقد ہونے والا عالمی معاہدہ اور مہاجر مزدوروں کا عالمی معاہدہ وغیرہ شامل ہیں۔ ہندوستان ان ساتوں عالمی معاہدوں میں شریک رہا ہے۔ ان میں سے پانچ معاہدوں پر ہندوستان دستخط کرچکا ہے، البتہ ایذا رسانی اور مہاجر مزدوروں سے متعلق جو عالمی معاہدہ عمل میں آیا ہے اس کو ابھی ہندوستان نے پاس نہیں کیا ہے۔ ان ساتوں عالمی دستاویزوں کی مراقبت کے لئے کمیٹیاں موجود ہیں جن کی طرف پروفیسر اقبال صاحب اشارہ کرچکے ہیں۔ جس کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ ان معاہدوں کی تعمیل کے دوران اظہار خیال کی آزادی اور ہر طرح کے نسلی جنسی یا قومی امتیاز سے دوری پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ اس کے علاوہ علاقائی سطح پر انسانی حقوق کی دوسری دستاویز بھی موجود ہیں جن میں آزادی اظہار پر خصوصی توجہ دی گئی ہے مثلاً یورپی سطح پر انسانی حقوق کا یورپی معاہدہ اور افریقی سطح پر انسانی حقوق کا افریقی معاہدہ جیسی علاقائی دستاویز بھی موجود ہیں۔

اسی طرح سے انسانی حقوق کا امریکی معاہدہ اور لاطینی امریکی معاہدہ جیسی دستاویز ات بھی پائی جاتی ہیں اور ان سبھی دستاویزات میں اظہار خیال کی آزادی پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ ان معاہدوں کے علاوہ دوسرا ادارہ بھی موجود ہے جس کو اب انسانی حقوق کا ؤنسل کے نام سے یاد کیا جائے گا۔ یہ ادارہ عالمی انسانی حقوق کمیشن کی جگہ پر قائم ہوا ہے جس میں ممبر ملکوں کی تعداد کا تعین اس طرح کیا گیا ہے : ایشیا سے ۱۳ ممالک، افریقہ سے ۱۳ ممالک ، ۷ مشرقی یوروپی ممالک، ۶ مغربی یورپی ممالک اور ۸ لاتینی امریکی ممالک۔ عالمی انسانی حقوق کمیشن ۱۹/جون ۲۰۰۶ء کو تحلیل ہوجائے گا اور اس کی جگہ پر یہ کاؤنسل کام کرے گی۔ اقوام متحدہ کے ۱۹۱ ممبر ملکوں میں سے رکنیت کی خواہش رکھنے والے جس ملک کو ۹۶ ملکوں کی حمایت حاصل ہوگی وہ اس کاؤنسل کا ممبر ہوجائے گا۔

دوسری بات جس کی طرف میں اشارہ کرنا چاہتاہوں وہ یہ ہے کہ میں پچھلے ہفتہ ملیشیا سے آیاہوں۔ اس ملک میں ۶۰ فیصد مسلمان ، ۳۰ فیصد چینی اور ۱۰ فیصد ہندوستانی آباد ہیں۔ میں جس ٹیکسی پر سفر کررہا تھا اس کا ڈرائیور ہندوستانی تھا۔ چھ پشت قبل اس کے آباء واجداد ہندوستان سے ملیشیا آگئے تھے ۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا تمہیں کبھی ہندوستان سے کوئی محبت محسوس ہوتی ہے۔ اس نے جواب دیانہیں بالکل نہیں۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ میرا وطن ملیشیا ہے۔'' آپ ہندوستانی ہیں۔ آپ کا مذہب ہندوہے'' میں نے کہا۔ اس نے جواب دیا کہ میں ہندوہوں۔تمل زبان بولتا ہوں لیکن میں ملیشیائی شہری ہوں۔ اور ہندوستان سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ میرے اسلاف کا ہندوستان سے رابطہ تھا۔لیکن اب وہ منقطع ہوچکا ہے ۔ اس نے بتایا کہ ہندوستان کے برعکس ملیشیائی آئین میں یہ لکھا ہوا ہے کہ اکثریت کی حامل برادری کے حقوق کو ترجیح دی جائے گی جس کا مطلب ہوا کہ مسلمانوں کی ہر حالت میں حفاظت کی جائے گی۔چینی اور ہندی نژاد شہریوں کے مقابلہ میں ملیشیائی مسلمانوں کے حقوق کے سلسلہ میں متعدد بار مثبت اقدام کے گئے لیکن اس کا دیگر برادریوں پر کوئی منفی اثر مرتب نہیں ہوا۔ ہندوؤں کو مکمل آزادی فراہم کی گئی ہے۔چینی شہریوں کو بھی اپنے پسندیدہ دین کی پیروی کی مکمل آزادی حاصل ہے۔ انہیں حکومت کی بھرپور حمایت حاصل ہے اور یہ خوشحال زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس ہندوستانی نژاد ملیشیائی ڈرائیور کی باتوں سے سبق حاصل کرتے ہوئے ہم لوگوں کو اپنے اندازفکر میں کچھ تبدیلی پیدا کرنی چاہئے اور ایسے اصولوں کی پیروی کی طرف مائل ہونا چاہئے جو

برادریوں کے درمیان موجود خلا کو پورا کرسکے۔

پروفیسر رحمت اللہ خاں: اب میں جناب یوگندر بالی صاحب سے گزارش سخن کرونگا۔

یوگندر بالی:

سب سے پہلے میں آپ سبھی دانشوروں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے اس مذاکرہ میں شرکت کا موقع فراہم کیا گیا۔ اس وقت میڈیا سے میں اکیلا ہوں اور ہم میڈیا والوں کی وجہ سے ہی مسائل کا جنم ہوتا ہے کیونکہ ہم ہی لوگ آزادی اظہار خیال کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔ بہرحال میں مظفری صاحب کی تمام باتوں کا جواب نہایت اختصار کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہوں۔

ان کا پہلا سوال ہے کہ کیا آزادی بیان ایک مذہب یا عقیدہ رکھنے کی تردید کرتی ہے؟

میرا جواب ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ہندوستانی آئین وقوانین میں اس کی ضمانت موجود ہے۔ حکومتیں آتی اور جاتی رہیں۔ حکمراں عروج وزوال کی منزلیں طے کرتے رہے لیکن مذہب اپنی جگہ پر قائم وبرقرار ہے۔ پس میرا مذہب، میرا مذہب ہے۔ آپ کو یہ نہیں معلوم کہ میرا مذہب کیا ہے اور خداوند عالم سے میرا کیا رابطہ ہے؟

عالمی انسانی حقوق کے معاہدوں میں آزادی اظہار خیال پر پابندی بھی موجود ہے۔ عالمی انسانی حقوق پر مبنی دستاویزات عرصہ دراز سے لکھی جاتی رہی ہیں لیکن ان کی تعمیل میں بے ایمانی، عدم صلاحیت اور امتیازی راہ وروش کی زیادتی پائی جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم لوگوں کو اس سلسلہ میں ضرور کچھ کرنا چاہئے۔

سوال یہ ہے کہ کیا عالمی دستاویزات میں کچھ کوتاہیاں پائی جاتی ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں ایسا ضرور ہے۔ اگر میرا تعلق دولتمند ملک سے ہے تو ہم دوسرے ملک کے مقابلہ میں اپنے قانون کا باقاعدہ استعمال کرسکتے ہیں۔ میرے پاس وسائل کی فراوانی ہے! میں اپنی فوج لاکر تمہیں قتل کرڈالوں گا! آپ بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کرر ہے ہیں! آپ نے پوری دنیا میں ہلچل مچارکھی ہے! میں اس کو تسلیم نہیں کرتا! یہ عدم توازن کا معاملہ ہے آپ کو اس کی اصلاح کرنی ہوگی۔ آخری اور اہم سوال یہ ہے کہ کیا اظہار بیان کی آزادی کی نظریاتی بنیاد ہرزمانہ کی

تکنیکی پریشانیوں کی وضاحت کرتی ہے؟

نہیں! عقلمند آدمی اور متعصب لوگ اظہار بیان کی تشکیل کا کام انجام دیتے ہیں۔ کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے۔ جب تک یہ لوگ اس واقعہ کے بارے میں کچھ کرنے کی فکر کرتے ہیں دوسرا واقعہ رونما ہوجاتا ہے۔ یہ ان لوگوں کی ایمانداری اور ان کے ارادہ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ سوال پیدا کردیتا ہے اور حادثہ اپنی جگہ موجود رہتا ہے۔ یہ میں نے اپنے گھر کے امور کے بارے میں اشارہ کیا۔ اب میں شاہد مہدی صاحب کی اس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتاہوں جس میں انہوں نے تہذیبوں اور تمدنوں کے درمیان اتحاد اور ہم آہنگی کی بات کہی ہے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ایران کے سابق صدر نے تہذیبی ٹکراؤ کی تردید کرتے ہوئے تمدنوں کے درمیان گفتگو، اتحاد اور ہم آہنگی کی بات کہی تھی۔ میں سمجھتاہوں کہ ہم لوگوں کو دیگر متمدن لوگوں کے ساتھ اتحاد قائم کرنا چاہئے۔ مہذب ومتمدن افراد کی کمی نہیں ہے۔ اس مذاکرہ میں موجود دیگر مقررین کی گفتگو سے میں جو نتیجہ اخذ کرتاہوں وہ یہ ہے کہ مذہب کے ذریعہ کسی مسئلہ کی ایجاد نہیں ہوتی۔ البتہ مذہب کے ناجائز سیاسی استعمال کی وجہ سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ مذہب کسی بندوق کا نام نہیں ہے۔ بلکہ یہ مقدس اساس ہے۔ لہٰذا اس سلسلہ میں ان لوگوں کو کوئی اہمیت نہ دی جانی چاہئے، جو مذہب سے پوری طرح ناواقف ہیں۔ بات در اصل پھر اظہار خیال کی آزادی پر ٹھہر جاتی ہے۔ میں درحقیقت اس میدان کا عملی کھلاڑی ہوں اور یہ سمجھتاہوں کہ اظہار خیال درحقیقت ابلاغ کا ایک اٹوٹ حصہ ہے، اور یہ عملی تعریف دوبارہ پیش کی جانی ہے۔ بہرے لوگ بات کہتے رہیں اور گونگے لوگ سنتے چلے جائیں تو اس کہنے اور سننے کو اظہار خیال کی آزادی اور حق کے دائرہ میں کیسے شامل کیا جاسکتا ہے؟ ہم جس کو چاہیں اس کو انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا مجرم قراردیں اور اس کی بات بالکل نہ سنیں اور اس کے معاملات سے آگاہی حاصل کیئے بغیر اس کے خلاف کارروائی کرنے لگیں! یہ بات قطعاً مناسب نہیں ہے تمام معاملات کو بخوبی سمجھنے کے بعد اظہار خیال کی تعریف پھر سے بیان کرنی ہے اور جہاں تک اظہار خیال کی آزادی کا معاملہ ہے اس میں سیاسی رہنماؤں کو ہرگز نمونۂ عمل نہ بنایا جائے۔

آزادی بیان: قانونی حق یا مذہبی فرض

اسلامی اور مغربی نظریہ کا تقابلی جائزہ

جناب سید علی محمد نقوی

بظاہر یہ تصور ہوتا ہے کہ آزادی فکر اور بیان جدید مغربی تہذیب کی دین ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ موجودہ مغربی تہذیب کے ظہور سے صدیوں پہلے اسلام نے آزادی فکر اور آزادی بیان کی نعمتوں سے انسانی معاشرہ کو مالامال کر دیا تھا۔

اسلام کے ظہور کے بعد حضرت محمدؐ نے مدینہ میں جو پہلا اسلامی معاشرہ قائم کیا، وہ آزادی بیان کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ مدینہ اسلامی حکومت کا مرکز تھا مگر وہاں عیسائی، یہودی، مشرک، دہریہ سب آتے اور اپنے نظریات پیش کرتے تھے۔ یہاں تک کہ عبداللہ بن ابیّ جیسے کھلے منافق اور اس کے ساتھیوں کو چھوٹ تھی کہ وہ اپنے نظریات بیان کریں، جب کہ وہ اس آزادی سے غلط فائدہ بھی اٹھاتے تھے۔

بحار الانوار میں ایک روایت ہے جس میں امیر المومنین حضرت علیؑ نے مدینہ میں بین مذہبی آزاد گفتگو کا حال بیان فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں:

ایک دن یہودی، عیسائی، دہریہ اور مشرک علماء حضرت پیغمبرؐ کے پاس مسجد نبوی میں حاضر ہوئے۔ یہودی پیشوا نے کہا محمد ہمارا عقیدہ ہے عزیر خدا کے بیٹے ہیں۔ آپ کا اس بارے میں کیا نظریہ ہے؟ اسی طرح دوسرے فرقوں کے علماء آئے اور ہر ایک نے اپنا نظریہ پیش کیا۔ حضرت پیغمبرؐ نے ان کے بیان عقائد پر اظہار ناراضگی نہیں کیا بلکہ خندہ پیشانی اور خوش اسلوبی سے دلائل کے ساتھ ان کا جواب دیا۔[1]

امیر المومنین حضرت علیؑ کی بھی یہی روش تھی۔ آپ تمام مخالف نظریات کو سنتے اور پھر استدلالی طور پر جواب دیتے تھے۔ اسی روش کا جیتا جاگتا ثبوت نہج البلاغہ میں بھی موجود ہے۔ روایات میں یہودی، عیسائی، ملحد علماء اور زنادقہ کے ساتھ آپ کی گفتگوئیں نقل ہوئی ہیں۔

۱۔ علامہ مجلسی، بحار الانوار، ج ۹، ص ص ۲۵۷۔۲۶۷

علامہ مجلسی نقل کرتے ہیں کہ جب امامؑ نے بھری مجلس میں مشہور جملہ ارشاد فرمایا کہ سلونی سلونی، قبل ان تفقدونی تو ایک جسور یہودی کھڑا ہو گیا اور اس نے یہ جسارت آمیز جملہ کہا:

ایھاالمدعی لما لا یعلم والمتقدم لما لا یفھم انا اسئالک فاجب[۱]

امام کے اصحاب برانگیختہ ہو گئے، مگر امام نے سب کو بٹھا دیا کہ یہ جو پوچھتا ہے اسے پوچھنے دو۔

آزادی بیان کا یہ اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ دنیا جس سے آگے نہیں جا سکتی۔ ایک معمولی یہودی اس کے دربار میں جسارت کر رہا ہے جو عظیم اسلامی سلطنت کا خلیفہ اور اس وقت کی سپر پاور کا فرمانروا ہے، جس کی سلطنت اتنی وسیع ہے کی ایران، عراق، عربستان، یمن اس کے صوبے ہیں۔ یہ تاریخ بشر کا زریں صفحہ ہے۔ آج دنیا آزادی بیان کے لاکھ دعوے کرے، اس علوی نمونہ سے آگے نہیں جا سکتی۔

ائمہ علیہم السلام کی سیرت میں بھی ایسے ہی نمونے ملتے ہیں۔ امام باقرؑ ، امام جعفر صادقؑ کے دور میں آزادی فکر اور آزادی بیان کا نمونہ ماحول تھا۔ اموی حکومت کمزور ہو گئی تھی جس کی وجہ سے ائمہ اطہار کو موقع ملا کہ آزادی بیان کے سلسلہ یں مدینہ میں خاص اسلامی فضا بنا دیں۔ امام باقرؑ اور امام جعفر صادقؑ کی مجلس میں اس دور کے بڑے (Materialist) مادہ پرست، ملحد اور زندیق، جیسے ابن ابی العوجاء اور ابو شاکر دیصانی حاضر ہوتے اور امام آزادی بیان کے ماحول میں ان سے گفتگو فرماتے تھے۔ روایت میں اس کے بہت سے شواہد موجود ہیں۔

علامہ مجلسی بحار الانوار میں نقل کرتے ہیں: ابن ابی العوجاء اپنے ملحد ساتھیوں کے ساتھ مسجد نبوی میں بیٹھ کر اپنے نظریات پیش کر رہا تھا کہ کائنات کا کوئی خالق نہیں۔ جب خدا ہی نہیں تو خدا کے رسول کا تصور ہی کیا ہے؟ حضرت محمدؐ تو معمولی انسان تھے (معاذ اللہ کوئی رسول پیغمبر نہیں تھے) جس وقت وہ یہ نظریہ پیش کر رہا تھا مفضل جو امام جعفر صادقؑ کے مخصوص اصحاب میں سے تھے، اتفاق سے وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے یہ کفر آمیز باتیں سنیں تو طیش میں آگئے اور کہا:

''دشمن خدا! یہ ہمت کہ کائنات کے خالق اور مدبر کا انکار کر رہا ہے''!

ابن ابی العوجاء مفضل کو نہیں پہچانتا تھا۔ اس نے کہا: ''تم کیوں' ناراض ہو رہے ہو۔ اگر اہل کلام (یعنی معتزلہ میں سے) ہو تو آؤ عقلی گفتگو کرو اور اگر امام جعفر صادقؑ کے شاگردوں میں سے ہو، تو جان لو کہ تمہارے امام کی یہ روش نہیں۔ تمہارے امام ہم سے اس لہجہ میں گفتگو نہیں کرتے۔

۱۔ علامہ مجلسی: بحار الانوار، ج ۱۰، ص ۱۲۶

وہ ہماری باتیں صبر اور حوصلہ کے ساتھ سنتے ہیں، اس کے بعد نرمی اور مہربانی کے ساتھ جواب دیتے ہیں۔ اس وقت تک بولتے نہیں جب تک ہم اپنی بات ختم نہ کرلیں ، اور اس طرح غور سے ہماری باتیں سنتے ہیں کہ ہم کو غلط فہمی ہوجاتی ہے کہ شاید یہ ہماری دلیل اور نقطہ نظر کو قبول کررہے ہیں۔ اگر ان کے دوستوں میں سے ہوتو ہم سے اسی انداز میں گفتگو کرو۔''[۱]

اس زرین روایت میں تین اہم نکتے ہیں کہ مسلمان ان پر ناز کرسکتے ہیں ۔ پہلے تو یہ کہ جب مسلمانوں کی حکومت افریقہ سے ایشیا اور یورپ تک قائم تھی، اس وقت آزادی بیان کی یہ فضا تھی کہ ایک میٹریالیسٹ مدینہ کی مسجد نبوی میں بیٹھ کر نہ تنہا خدا بلکہ حضرت محمدؐ کی نبوت کا بھی انکار کررہا تھا۔ ایسی آزاد فضا تھی کہ ملحد اور زندیق جو گویا اس دور کے کمیونسٹ تھے، مسجد میں بیٹھ کر اپنا نظریہ پیش کرتے تھے۔ نبی امیہ نے سیاسی سرکوبی اور فاشزم ضرور قائم کررکھا تھا مگر ائمہ اہلبیت کے صدقہ میں فکری آزادی کی فضا قائم ہورہی تھی۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ابن ابی العوجاء کا اہل کلام یا اصحاب امام صادقؑ کی طرف اشارہ، اس بات کا غماز ہے کہ اس دور میں فکری مباحث میں معتزلہ اور شیعہ ہی پیش پیش تھے۔

تیسرے اس دور کا سب سے بڑا ملحد امام جعفر صادقؑ کا وہ مثالی نمونہ بیان کررہا ہے جو آج بھی بین مذاہب گفتگو (Inter-faith dialogue) کے اصول وضوابط متعین کرسکتا ہے۔ امام نے جو درس دیا کہ آزادانہ فضا میں گفتگو کیسے کی جائے، دنیا کا کوئی بھی آزاد خیال معاشرہ اس سے آگے نہیں جاسکتا۔

امام رضا علیہ السلام کے زمانہ میں خلیفہ مامون الرشید نے بین مذہبی ڈائیلاگ اور گفتگو کی تاریخی کاؤنسل بنائی۔ یورپ اور امریکہ میں تو مذہبی ڈائیلاگ (Inter-faith dialogue) کا رواج اب ہورہا ہے ۔ بین مذاہبی مفاہمت کا آغاز انیسویں صدی کے آخر میں ہوا جب سوامی وویکانند، شکاگو میں بین المذاہب پارلیمنٹ میں شریک ہوئے۔ جب کہ اسلامی تاریخ میں ایک ہزار سال پہلے امام رضاؑ کے زمانے میں خلیفہ مامون الرشید نے بین المذاہب ڈائیلاگ (Iner-faith Dialogue) کی اعلیٰ کاؤنسل قائم کی۔ اس مجلس میں مذہبی مسائل اور اختلافات پر آزادانہ گفتگو ہوتی تھی۔ سوامی وویکانند کو شکاگو میں ۱۸۹۸ء میں مدعو کیا گیا، جب کہ مامون الرشید کی اعلیٰ مجلس میں مسیحی اسقف اعظم جاثلیق، یہودیوں کا سب سے بڑا مذہبی پیشوا راس الجالوت، زردشتیوں کا سب سے بڑا پیشوا ہر بذا کبر،

۱۔ علامہ مجلسی، بحار الانوار، ج۳، ص ۱۵۳

اور صابئ فرقہ کے پیشوا شریک ہوتے تھے ۔جس مجلس میں اسلام کی نمائندگی حضرت امام رضا علیہ السلام فرماتے ہوں وہ کیسی مجلس ہوگی ؟ خلیفہ مامون الرشید کی موجودگی میں ہر ایک کھل کر اپنے نظریات اورشکوک وشبھات پیش کرتا اور امام رضا علیہ السلام اور ان کے ساتھی سب کا استدلالی طور پر جواب دیتے تھے۔مسلمانوں کے لئے حضرت محمدؐ اور ائمہ اطہارؑ کی سیرت واجب الاتباع ہے۔ مسلمانوں کا فرض ہے ان کی پیروی کریں۔ اس طرح آزادی فکر اور آزادی بیان کی فضا بنانا مسلمانوں کے لئے مذہبی فرض کا درجہ رکھتا ہے۔

آزادی فکر اور آزادی بیان کا یہ وہ مثالی نظام ہے جس کو اسلام قائم کرنا چاہتا ہے۔ پیغمبر اکرمؐ اور سچے پیشواؤں کی کوشش سے اس کی جھلک اسلامی معاشرہ میں دیکھنے میں آتی تھی۔ ورنہ یہ صحیح ہے کہ پیغمبرؐ کی رحلت کے بعد قریش کی جاہلیت کا نظام رفتہ رفتہ واپس آیا اور جب ابوسفیانیت حاکم ہوگئی تو آزادی کا گلہ گھونٹا گیا۔ جب اسلامی حکومت ملوکیت میں تبدیل ہوگئی اس وقت سے حاکم طبقہ پر ہر طرح کی تنقید کا دروازہ بند کردیا گیا۔ تاریخ اسلام میں رحلت پیغمبرؐ کے بعد ہی وہ صورت آئی کہ آزادی بیان کی بناء پر ابوذر کو جلاء وطن کردیا گیا ۔ امیر معاویہ کے دور میں حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کو حق گوئی کی بناء پر قتل کردیا گیا اور میثم کی زبان کاٹ دی گئی۔ حجاج نے عبد اللہ بن عمر کو خاموش رہنے یا قتل پر تیار ہوجانے کی دھمکی دی۔ مگر مندرجہ بالا نمونوں سے ثابت ہوتا ہے کہ آزادی بیان کے سلسلہ میں پیغمبرؐ اور ائمہ کا اسوہ اور اسلام کی تعلیمات اتنی روشن تھیں کہ ابھی بھی علمی اور فکری مسائل میں ، کھلی گفتگو کی چھوٹ تھی۔ ہاں جب مغلوں کے حملہ اور پھر ترکوں کی بالا دستی کے بعد اسلامی معاشرہ فکری زوال کا شکار ہوا، تو آزادی فکر کی فضا بھی ختم ہوگئی۔

آزادی بیان کے سلسلہ میں مغربی اور اسلامی نظریہ کا تقابلی جائزہ:

اس طرح مغربی تہذیب کے ظہور سے بہت پہلے اسلامی معاشرہ میں جسے پیغمبر اکرم حضرت محمدؐ نے قائم کیا اور جس کو دوسرے مقدس پیشواؤں نے قائم رکھنے کی کوشش کی، آزادی فکر اور آزادی بیان کے اصول حاکم تھے۔

جس وقت اسلام دشمن عناصر کے ہاتھ میں مسلمانوں کی حکومت پہنچی اور پھر جب مسلمانوں کا تہذیبی اور فکری زوال شروع ہوا اس وقت سے مسلمان معاشرہ فکری جمود کا شکار ہونے لگا اور اسلامی

اس پر گھٹن کا ماحول طاری ہوگیا۔ آج اگر دنیا میں ایک بار پھر آزادی فکر، آزادی بیان اور حقوق انسانی کی تحریک شروع ہوتی ہے تو یہ روح اسلامی کے باعین مطابق اور اسی سمت میں ہے جس کی قرآن، احادیث اور سیرت پیغمبرؐ اور معصومین نے نشان دہی کی تھی۔ اس لئے مسلمانوں کو اس تحریک کو آگے بڑھانا چاہئے اور مسلم معاشرہ میں یہ فضا قائم و دائم کرنا چاہئے۔

اسی کے ساتھ ہی ساتھ اس بات کی کوشش بھی کرنی چاہئے کہ حقوق انسانی اور آزادی بیان کے سلسلہ میں ہم مغرب کی کورانہ تقلید نہ کریں بلکہ ان اصولوں کو اسلامی بنیادوں پر استوار کریں۔

اسلام نے آزادی فکر اور آزادی بیان کا جو تصور دیا ہے وہ مغربی تصور سے کہیں زیادہ گہرا ہے۔ مغربی تصور میں آزادی بیان ایک سیاسی سماجی حق ہے مگر اسلام میں یہ ایک مقدس مذہبی فرض ہے۔

آزادی، فقط مقدس مذہبی فرض اور خداوند کی موہبت ہی نہیں انسان کے وجود کے ملکوتی پہلو کا خاصہ ہے۔ مغربی نظام میں آزادی کی سیاسی سماجی حیثیت ہے۔ اسلام میں اس کی وجودی حیثیت ہے۔ آزادی اور حریت فطرت انسانی کا خاصہ ہے۔ مذہبی طرز فکر میں انسان ایک حیوان نہیں بلکہ کچھ اور بھی ہے۔ قرآن کریم نے خلقت انسان کے حق میں جسمانی ساخت کے مراحل کا ذکر کرنے کے بعد کہا ہے۔ فَاِذَا سَوَّیۡتُهٗ وَنَفَخۡتُ فِیۡهِ مِنۡ رُّوۡحِیۡ[1] اس طرح فطرت انسانی اسی عنصر ملکوتی یا نفخہ الٰہی کا نتیجہ ہے اور آزادی وحریت خواہی اسی فطرت کا تقاضا ہے۔ اس لئے سمجھا جاسکتا ہے کہ سماجی اور سیاسی نظریات کے مقابلہ میں مذہب نے آزادی اور حریت کو کتنا عظیم اور مقدس درجہ دیا ہے۔ اسی فطرت انسانی کو جلاء بخشنے اور انسان کو ''سیر الی اللہ'' کے مراحل کے لئے تیار کرنے کے لئے انبیاء اور پیغمبر بھیجے گئے۔ انبیاء اور پیغمبروں کی بعثت کا ایک بنیادی مقصد ان زنجیروں کو توڑنا ہے جس میں انسان جکڑا جاتا ہے۔

''وَیَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ کَانَتۡ عَلَیۡهِمۡ[2]

اغلال یا ان زنجیروں میں جن کو توڑنے کے لئے انبیاء کا ظہور ہوا ہے انسان کی آزادی فکر اور آزادی بیان پر پابندیاں بھی شامل ہیں۔ بعثت انبیاء کا اصل مقصد فطرت انسانی کو جلا بخشنا اور سیر الی اللہ کی راہ ہموار کرنا ہے۔ قرآن اس ضمن میں ایک مقصد ان زنجیروں کو توڑنا بتاتا ہے جس میں انسان جکڑا ہوا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ آزادی فکر اور آزادی بیان اور انسانی حریت سیر الی اللہ کے

۱۔ سورہ الحجر (۱۵) آیہ ۲۹۔ نیز رجوع ہو: سورہ ۳۸ آیہ ۷۲
۲۔ سورہ الاعراف (۷) آیہ ۱۵۷

مقدس انسانی سفر کی ضروری منزلیں ہیں۔اس طرح اسلامی نظریہ میں آزادی ایک مقدس الٰہی اور ماورائی (Metaphysical) حقیقت ہے،صرف ایک سیاسی اور سماجی نظریہ نہیں۔

قرآن میں قلم اور بیان کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔قرآن کریم میں خود خداوند قلم کی قسم کھاتا ہے۔

"نٓ وَالْقَلَمِ وَمَايَسْطُرُوْنَ۔" ۱؎

انداز قرآنی یہ ہے کہ کسی چیز کی بے انتہا اہمیت اور عظمت ظاہر کرنے کے لئے خداوند اس کی قسم کھاتا ہے۔

اسی طرح انسان کے لئے خداوند کی بنیادی نعمتوں کے بیان کے ضمن میں قرآن کریم نے فرمایا کہ : "عَلَّمَهُ الْبَيَان" ۲؎

آزادی قلم اور آزادی بیان خداوند کی اس موہبت کے دفاع کا نام ہے۔اس لئے اسلام میں اس کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے۔

معصومین کی احادیث میں بھی آزادی بیان پر بڑا زور ہے۔ اسماعیل ابو البصیر نقل کرتے ہیں امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنے دوستوں کے ایک گروہ سے فرمایا۔

''کیا تم کو ایسا ماحول میسر ہے کہ آزادی کے ساتھ اکٹھا ہوسکو۔ ایک دوسرے سے گفتگو کرسکو اور جو چاہو کہہ سکو؟ انہوں نے جواب دیا : جی ہاں ! امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ زندگی کی لذت اس کے علاوہ کیا ہے؟

امام کے نزدیک وہ سماج جہاں زبان و دہن پر قفل لگے ہوں یا قلم پر پہرے ہوں زندگی کی لذت سے محروم ہے۔

قرآن نے تدبر اور تعقل پر بڑا زور دیا ہے۔قرآن کی تاکید ہے کہ تم خود اپنی عقل کا استعمال کیوں نہیں کرتے اور باپ دادا کی اندھی تقلید کیوں کرتے ہو؟

ذہنی خلاقیت کو آزادی کی فضا میں ہی جلا ملتی ہے ۔اگر آزادی فکر اور آزادی بیان نہ ہوتو تعقل اور تدبر کا مفہوم ہی نہیں۔

جیسا کہ امام صادقؑ نے مندرجہ بالا ارشاد میں فرمایا ہے : آزادی سے محروم معاشرہ، مردہ معاشرہ ہے۔ ہم کو اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنا چاہیئے کہ ہم نے ذہن پر قفل لگانے اور قلم توڑنے کی

۱۔سورہ القلم (۶۸) آیہ ۱ ۲۔سورہ الرحمان (۵۵) آیہ ۴

کوشش تو نہیں کی ! ورنہ سمجھنا چاہیئے ہمارا معاشرہ وہ معاشرہ ہے جسے امام صادق علیہ السلام مردہ معاشرہ کہتے ہیں۔ اسلامی تصور کے لحاظ سے آزادی خدواند متعال کی نعمت اور موہبت ہے اور اس کی مقدس حیثیت ہے۔ انسان صرف انسان کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ خدا کے بندہ کی حیثیت سے بھی ذمہ دار ہے کہ نہ صرف آزادی بیان کا لحاظ رکھے بلکہ اس مقدس حق کا دفاع بھی کرے۔ اور اگر ضرورت ہو تو کلمہ حق کے بیان کے لئے میثم کی طرح زبان بھی کٹوادے اور جان کی بازی لگادے۔تقدس کا یہ درجہ صرف مذہب ہی دے سکتا ہے۔مغربی سیکولر نظریہ میں تقدس کا یہ عنصر آہی نہیں سکتا۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ آزادی بیان اور اس کا پاس ولحاظ اور دفاع اسلام میں عبادت (Act of worship) کا درجہ رکھتا ہے ۔ ہر وہ عمل جس کے ساتھ خدا کا تصور شریک ہو اسلام میں عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔

آزادی بیان حق یا مذہبی فرض

اسلامی اور مغربی تصور میں ایک اہم فرق یہ ہے کہ مغرب میں آزادی بیان ''انسانی حق ہے'' مگر اسلام میں صرف حق نہیں بلکہ تکلیف یا مذہبی ذمہ داری ہے۔حق (Right) کو تو انسان چاہے استعمال کرے اور چاہے استعمال نہ کرے بلکہ تکلیف (Obligation) کی حیثیت فرض کی سی ہے جس کو انجام دینا ہی ہے۔ مغربی نظریہ میں آزادی بیان صرف حق ہے ، اسلامی نظریہ میں حق بھی اور مذہبی ذمہ داری (تکلیف) بھی اور مذہبی طور پر اس کی حیثیت واجب کی ہے۔

مندرجہ ذیل نکات ہیں جن کی بناء پر ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی نظام میں آزادی بیان کی حیثیت فرض اور واجب کی ہے۔

یہ بات اسلامی اصول فقہ او راصول استنباط میں ثابت ہے کہ مقدمہ واجب بھی واجب ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی چیز واجب ہے تو اس کی شرائط اور وہ چیز جس پر اس کا دارومدار ہے، واجب ہوگی۔ مثلاً نماز واجب ہے تو واجب نماز کے لئے وضو بھی واجب ہوگا۔ اب ملاحظہ کیجئے مندرجہ ذیل امور کی حیثیت اسلام میں فرض اور واجب کی سی ہے اور یہ امور اسی وقت انجام پاسکتے ہیں جب آزادی بیا ن موجود ہو اس لئے آزادی بیان کی حیثیت واجب کی سی ہوگی۔ مندرجہ ذیل امور مسلمان معاشرہ میں فرض کی حیثیت رکھتے ہیں اور قرآنی آیات اور احادیث میں ان کا حکم دیا گیا ہے۔

۱۔امر بہ معروف ونہی از منکر:

امر بہ معروف اور نہی از منکر مسلمانوں پر ویسے ہی واجب ہیں جیسے نماز و روزہ ان کی حیثیت بھی عبادت کی سی ہے۔ یہ اسلام کا اہم حکم ہے۔قرآن مجید کی آیات ، پیغمبر اکرم کی احادیث،نہج البلاغہ کے ارشادات اور ائمہ کے اقوال سے امر بہ معروف اور نہی از منکر کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

امر بہ معروف کا اور نہی از منکر کا مفہوم ہے کہ مسلمان معاشرہ اور سیاسی حکمرانوں اور دوسرے افراد کی خامیوں کی کھلی تنقید کریں اور ان کو صحیح اسلامی راہ پر چلنے کی تلقین کریں۔ امر بہ معروف کا دائرہ صرف ڈاڑھی رکھو اور نماز پڑھو کی حد تک نہیں بلکہ سماجی اور سیاسی کجروی اور انحراف کے مقابلہ میں کھلی تنقید کے معنی میں ہے۔ یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب معاشرہ میں آزادی بیان اور آزادی قلم حاکم ہو۔ اسلام کے مطابق ہر فرد کی ذمہ داری ہے کہ حاکم طبقہ اور معاشرہ کو راہ راست سے نہ بھٹکنے دے۔ پیغمبر اکرمؐ نے مشہور حدیث میں فرمایا:

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ [۱]

اس کا مفہوم یہ ہے کہ سماج میں ہر فرد اچھائی کو بڑھانے اور برائی کو روکنے کا ذمہ دار ہے۔ یہ کام اسی وقت ہوسکتا ہے جب آزادی بیان اور آزادی قلم اور آزادی فکر کا ماحول ہو۔

پیغمبر اکرمؐ اور سچے پیشواؤں کے زمانہ میں یہی ماحول حاکم تھا ، جیسا کہ ہم نے مختلف مثالوں میں دیکھا ۔مگر جب اسلامی حکومت ملوکیت بن گئی۔ اس وقت سے حاکم طبقہ پر ہر طرح کی تنقید کا دروازہ بند کردیا گیا اور جب اسلامی معاشرہ جہالت اور جمود کا شکار ہوا اس وقت سے عوامی عقائد اور سماجی رسم ورواج پر بھی تنقید کی راہ مسدود ہوگئی۔ اس دور کے مقدس مآب حضرات نے امر بہ معروف اور نہی از منکر کا دائرہ 'ڈاڑھی رکھو' مونچھیں مت بڑھاؤ ، سر کے بال کاٹو، ٹوپی منڈھو، یا زیادہ سے زیادہ ''نماز پڑھو'' کی حدود تک محدود کردیا۔مگر اسلامی نظریہ میں تو امر بہ معروف ونہی از منکر بڑا وسیع اصول ہے جس کو مصلحت پرستوں نے سمیٹ دیا۔ امر بہ معروف کے وسیع اصول پر عمل آزادی بیان کا محتاج ہے کیونکہ امر بہ معروف فرض اور واجب ہے اس لئے آزادی بیان کی فضا بنانا بھی فرض اور واجب ہے۔

۱۔محمد ری شہری : میزان الحکمۃ ، ج ۶ ص ۳۲۷

اصل شوریٰ:

اسلام میں اصل شوریٰ پر بڑا زور دیا گیا۔ شوریٰ کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی فیصلے باہمی مشورہ کی بنیاد پر ہونا چاہئیں۔ ہر شخص کی ذمہ داری ہے کہ کھل کر مشورہ دے اور جو صحیح سمجھے کہے۔ پھر ان سب مشوروں کی روشنی میں فیصلہ کیا جائے۔ اسلام میں شوریٰ کی اہمیت کے لئے یہی کافی ہے کہ قرآن کریم میں خداوند نے رسول اکرمؐ کو حکم دیا ہے۔

وَشَاوِرۡهُمۡ فِی الۡاَمۡرِ "امور میں مسلمانوں سے مشورہ کر لیجئے۔"

اس کی بناء پر جنگ بدر واحد اور خندق کے موقع پر رسولؐ خدا نے اپنے اصحاب سے مشورہ کیا۔ حدیث میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ مختلف مسائل میں مشورے مانگیں نیز تاکید کی گئی کہ سب کھل کر اپنی رائے پیش کریں۔ معصوم نے فرمایا:

"من شاور الرجال شارکھم فی عقولھم"

نہج البلاغہ میں حضرت امیر المومنینؑ نے ارشاد فرمایا:

"ایک رائے کو دوسری رائے کے مقابل قرار دو چونکہ آراء کے تصادم سے حقیقت سامنے آتی ہے۔ جیسے جب دودھ متھا جاتا ہے تبھی گھی نکلتا ہے۔"

جب امیر المومنین کو مسلمانوں نے خلیفہ ظاہری کی حیثیت سے بھی منتخب کیا تو آپ نے فرمایا:

"تم پر میرا حاکم کی حیثیت سے یہ حق ہے کہ تم اس بیعت پر قائم رہو جو تم نے مجھ سے کی ہے اور مجھے صحیح مشورہ دو اور نصیحت کرو"[۱]

"شوریٰ" کی اہمیت اس حد تک تھی کہ بعض مسلمانوں نے تو اس کو نص" کے مقابلہ میں قرار دے لیا جو صحیح نہ تھا، یعنی اگر کسی چیز کا اعلان قرآن یا حدیث پیغمبرؐ میں ہو جائے تو پھر اس کے مقابلہ میں مسلمان مشورہ اور شوریٰ سے کچھ اور فیصلہ نہیں کر سکتے، مگر عام حالات میں شوریٰ اسلامی سیاسی اور معاشرتی نظام کی بنیاد ہے۔ شوریٰ اور مشورہ کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آزادی بیان اور آزادی فکر موجود ہو اور جو جیسا سمجھ رہا ہے ویسا بیان کر سکے۔ اس طرح شوریٰ کے حکم سے بھی یہ بات ظاہر ہے کہ آزادی فکر اور آزادی، اسلام میں صرف حق نہیں بلکہ مذہبی فرض ہے۔ حکومت اور معاشرہ کا فرض ہے آزادی کا ماحول بنائے۔

۱۔ شیخ کلینی: اصول کافی، ج ۱ ص ۴۰۳،

نہی از کتمان حق:

اسلام کے نزدیک کتمان حق یعنی حق بات کو چھپانا بہت بڑا گناہ اور حرام ہے، اس طرح سچ بات اور حق کا اعلان اور ظاہر بہ ظاہر کہنا واجب ہے۔قرآن مجید کی آیات اور معصومین کی احادیث میں کتمان حق (حق چھپانے) کی سخت مذمت ہوئی ہے اور شدت کے ساتھ اس سے منع کیا گیا ہے۔

''کہئے کہ یہ ہے میرا راستہ، میں اللہ کی طرف دعوت دیتا ہوں، میں بھی اور وہ بھی جو میرا پیرو ہے، اللہ کی ذات ہر برائی سے پاک ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں۔ ۱

''یہاں اس جملہ سے کہ وہ بھی جو میرا پیرو ہے'' صاف ظاہر ہے کہ اعلان حق ہر مسلمان کا فرض ہے اور اس پر عمل نہ کرنا ایک طرح کا شرک آمیز عمل ہے۔

قرآن مجید نے مختلف آیات میں ان لوگوں کی سخت مذمت کی ہے جو لالچ، طمع یا خوف سے حق کو چھپاتے ہیں۔

لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُونَ۔

کیوں حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کرتے ہو اور اصلی حق کو چھپاتے ہو، حالانکہ تم جانتے ہو۔ ۲

جو حق کا اعلان نہ کرے اور اسے چھپائے، قرآن مجید اس کو سب سے بڑا ظالم گردانتا ہے۔

"وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ" ۳

اور اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جو کسی گواہی کو جو اس کے پاس اللہ کی طرف سے ہے چھپائے، اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں۔

بہت سی آیات ہیں جن میں قرآن مجید نے ان افراد کی سخت مذمت کی ہے جو حق کو چھپاتے ہیں اور اپنے افکار کا سنسر (CENSOR) کرتے ہیں۔خود سنسری (SELF-CENSORHIP) ایسے معاشرہ کی نشان دہی کرتی ہے جہاں آزادی فکر اور آزادی بیان کا ماحول نہیں۔اعلان حق کے سلسلہ میں علماء کی ذمہ داری بہت زیادہ ہے ان کو ہمیشہ وہ ہی بات کہنا چاہئے جو حق بات ہو چاہے کسی کو پسند آئے یا ناگوار ہو۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے:

''جب میری امت میں بدعت پھیل رہی ہو اس وقت علماء کا فرض ہے اپنا علم ظاہر کریں ورنہ خداوند کی لعنت کے مستحق ہوں گے۔''

۱۔سورہ یوسف / ۱۰۸ ۲۔سورہ آل عمران / ۷۱، ۳۔سورہ بقرہ / ۱۴۰،

ہر حال میں حق بات کہنا اور جس چیز کو صحیح سمجھیں ، اس کو نہ چھپانا اسی وقت ممکن ہے جب معاشرہ میں آزادی فکر اور آزادی بیان کا ماحول ہو۔ اس طرح اسلام میں آزادی بیان کی حفاظت واجب ہے۔

اصول جدال احسن:

قرآن مجید میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ ''جدال احسن'' کی روش اپنائیں ۔

"اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَالۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَجَادِلۡھُمۡ بِالَّتِیۡ ھِیَ اَحۡسَنُ"

اپنے پروردگار کے راستے کی طرف دعوت دیجئے ، حکمت اور اچھے عنوان سے وعظ ونصیحت کے ساتھ اور ان سے نرمی اور بہترین طریقہ سے بحث کیجئے۔

قرآن کریم مختلف نظریات کے درمیان اور اختلافی نقطہ نظر رکھنے والوں کے درمیان بحث وگفتگو کا اصول بتا رہا ہے۔'' پروردگار کا راستہ'' حق اور سچائی کا راستہ ہے انسان جس بات کو حق سمجھتا ہے اس کا اعلان کرے لیکن دوسرے پرتھوپنے کا حق اس کو نہیں ''جدال احسن'' کے مفہوم میں استدلال ، نرمی اور خوش اسلوبی داخل ہے،'' زور زبردستی جدال احسن'' کے اصول کے خلاف ہے۔ جدال احسن' کی روش یہ ہے کہ دوسرے نقطہ نظر کے افراد کے نظریہ کو سن کر استدلالی طور پر اور اچھے انداز میں اپنا نظریہ پیش کیا جائے تاکہ اگر ان کو پسند آئے تو یہ نظریہ اپنالیں۔ قرآن مسلمانوں کو حکم دیتا ہے غیر افراد کے سامنے اسلام کو یوں پیش کریں۔ یہ روش آزادی فکر اور آزادی بیاں کی روش ہے۔'' جدال غیر احسن'' جو حرام ہے، یہ ہے کہ زور زبردستی سے دوسرے کو خاموش کیا جائے اور اپنا نقطہ نظر اس پر مسلط کیا جائے۔ اسلام اس روش سے مسلمانوں کو منع کرتا ہے۔

آزاد اندیشی اور استدلالی گفتگو کا حکم:

قرآن مجید مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ ہمیشہ استدلالی گفتگو کریں ، مخالفین سے بھی قرآن کا یہی تقاضا ہے کہ جو کہیں اسکے بارے میں دلیل دیں۔ قرآن مجید کی بہت سی آیات میں یہ'' برھان طلبی'' موجود ہے۔

قُلۡ ھَاتُوۡا بُرۡھَانَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ [۱] ''اگر تم سچے ہو تو اپنی دلیلیں لاؤ۔''

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے مخالفین کو بھی یہ آزادی دی ہے کہ وہ اپنی دلیلیں اور اپنے نظریے پیش کریں۔ خود قرآن کریم کی یہ روش ہے کہ وہ مخالفین کے کفر آمیز ترین الزامات کو بھی

۱۔ سورہ بقرہ/ ۱۱۱

نقل کرتاہے پھر استدلالی طورپر اس کا جواب دیتا ہے۔ قرآن کی متعدد آیات میں آیا ہے ''وَقَالَ الَّذِینَ کَفرُوا ''وَقَالَ الَّذِینَ اَشرَکُوا'' ان آیات میں مادہ پرستوں اورمشرکین کے تمام نظریات اور الزامات نقل ہوئے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ قرآنی سوسائٹی میں افکار کا سنسر نہیں بلکہ افکار کے اظہار کی آزادی اور استدلالی گفتگو کا ماحول ہے۔قرآن کریم میں آزاد اندیش اور کھلی فکر کے افراد کی تعریف کی گئی ہے ۔ جو مختلف نظریات سے مطلع ہوتے ہیں اور پھر سب سے اچھے نظریہ کو اختیار کرتے ہیں۔

فَبَشِّرْ عِبٰادِ الَّذِیْنَ یَستَمِعُونَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهُ اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ هَدٰهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰئِکَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبٰابِ''

''مژدہ اورخوش خبری دومیرے ان بندوں کو جو بات غور سے سنتے ہیں اور جو بہترین ہو اس کو اپنا لیتے ہیں اور اس کی پیروی کرتے ہیں ۔ یہ وہ ہیں جن کی اللہ نے خاص طور سے رہنمائی کی ہے اور یہ ہیں صاحبان عقل [۱]

'' یَستَمِعُونَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهُ '' کا مصداق اسی وقت ہوگا جب معاشرہ میں مختلف نظریات وافکار کو پیش کرنے کا موقع اور آزادی فکر وبیان کی فضا ہو۔

قرآن کریم خود پیغمبرؐ کی یہی خصوصیت بیان کرتا ہے کہ وہ مختلف نظریات سنتے تھے یہاں تک کہ منافقین کہنے لگے تھے کہ ''هُوَ اَذن'' پیغمبرؐتو سراپا گوش ہیں،قرآن فرماتا ہے۔''قُلْ اَذن خَیرلکم'' پیغمبرؐ کی یہ روش تمہارے لئے بہتر ہے ۔یعنی آزادی بیان کی فضا ہی سب کے لئے خیر ہے۔

اسلام میں آزادی بیان کے حدود:

مندرجہ بالا شواہد سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ اسلام نہ کہ تنہا آزادی بیان کا حامی ہے بلکہ آزادی بیان اسلام میں ایک مذہبی فریضہ اور واجب عمل ہے۔لیکن اس کا خیال رہے کہ اسلام میں آزادی وعقائد اور آزادی بیان کا تصور ، اس تصور سے قدرے مختلف ہے جو آج مغربی لبریلزم(Liberalism)میں پایا جاتا ہے۔

اسلام میں آزادی فکر اور آزادی بیان اللہ کی موهبت ہے ، مغرب میں خدا کے مقابل انسان شورش کی علامت ہے۔ اسلام میں آزادی بیان مذہبی فرض ہے ، مغربی لبریلزم میں صرف انسانی حق۔

۱۔ سورہ زمر ۱۷

اسلام میں آزادی بیان کے کچھ حدود ہیں، مغربی نظام میں بھی کچھ حدود ہیں۔ مغربی نظام میں آزادی بیان کے حدود یہ ہیں کہ کسی فرد کی ہتک عزت یا تصادم کی حد تک نہ ہو۔ اسلام میں اس کے ساتھ یہ حد بھی ہے کہ وہ کسی مذہبی پیشوا کی ہتک حرمت یا مقدسات مذہبی کا استہزا، اور مذہب کے لاکھوں ماننے والوں کے دل دکھانے کی غرض سے نہ ہو، مغرب کی آزادی بیان کے نظام نے رشدی پیدا کیئے ، اسلام کی آزادی بیان کے نظام نے ابوریحان بیرونی۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ اسلام میں آزادی بیان کا مفہوم خواہش اور جنسی حیوانیت کی تبلیغ نہیں۔ آزادی بیان انسان کی انسانیت کے جلاء کا ذریعہ ہے انسان کو جانور بنانے کا طریقہ نہیں۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ چونکہ مغربی تصور آزادی صرف سیاسی، سماجی اور سیکولر بنیادوں پر استوار ہے اس لئے اس کے حدود صرف سیاسی قوانین اور معاشرتی ضرورتوں کے لحاظ سے متعین ہوئے ہیں۔ مثلاً آزادی بیان ، اسی حد تک جائز ہے کہ سیاسی قوانین کی خلاف ورزی یا دوسروں کے حقوق پر دست درزای نہ ہو۔ مگر اسلام میں چونکہ آزادی بیان خدا کی موھبت اور امانت اور مذہبی فرض ہے اس لئے مذہبی حدود کا بھی لحاظ ضروری قرار پاتا ہے۔ آزادی بیان اور قلم کا اسلام میں یہ مفہوم نہیں کہ جس مذہبی پیشوا کی چاہیں توہین کریں۔ ایک فرد کی توہین پر تو ہتک عزت کا مقدمہ قائم ہوجائے مگر جن پیشواؤں سے کروڑوں انسانوں کے مذہبی جذبات وابستہ ہوں، ان کے مذاق اڑانے کی کھلی چھوٹ ہو، اسلام اس آزادی بیان کے ڈھکوسلے کا قائل نہیں۔

تتمہ اور نتیجہ گیری:

ہماری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ حقوق انسانی ، آزادی فکر اور آزادی بیان کی تحریک اصولی طور پر اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ ہے۔ اسلام نے مغرب سے ہزار سال پہلے مدینہ کے پہلے نمونہ معاشرہ میں آزادی بیان کی وہ فضا قائم کردی تھی جس کی نظیر اب بھی پیش نہیں کی جاسکتی۔ پیغمبر اکرمؐ، امیرالمومنین حضرت علی اور دوسرے ائمہ کی سیرت میں آزادی بیان کے بے نظیر نمونے سامنے آئے۔ ہاں جب سے جاہلیت کی قدریں اسلامی معاشرہ میں واپس آئیں اور فکری زوال شروع ہوگیا اس وقت سے گھٹن کی فضا پیدا ہوئی۔ موجودہ آزادی بیان کی تحریک سے ہمارے معاشرہ میں اجتہاد اور آزادی فکر، آزادی بیان اور آزادی قلم کی فضا پھر قائم ہوگی جو عین اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے۔ ہاں ! اسلام

اورمغربی تصور آزادی میں کچھ بنیادی فرق پائے جاتے ہیں۔مسلمانوں کو آزادی بیان اور حقوق انسانی کے اصول اپنانے میں اجتہادی انداز اپنانا ہوگا۔کورانہ طور پر جو مغرب میں پیش کیا جارہا ہے اس کو لے لینا غلامانہ ذہنیت ہوگی، جو آزاد فکری اور حریت کی علامت نہیں۔

اکبر اور آزادی بیان

پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین ہمدانی

مغل بادشاہ اکبر (۱۶۰۵ء-۱۵۵۶ء) تاریخ ہندوستان میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اپنے عہد میں اس نے جو فیصلے کئے اور پالیساں بنائیں وہ اپنے دور سے آگے کی بات تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے علماء کی ایک کثیر تعداد اس کی اہمیت کو نہ سمجھ سکی۔ وہ تصوف سے حد درجہ متاثر تھا، اسی وجہ سے مذہب کی بنیاد پر تفریق کا سوال ہی نہ تھا۔ وہ مغل حکومت میں رہنے والے تمام لوگوں کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ کرنا چاہتا تھا اور اس کوشش میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوا۔

ترکوں کی سلطنت ۱۲۰۶ء میں ہندوستان میں قائم ہوئی لیکن ترکوں کا ہندوؤں سے کوئی رشتہ نہ تھا، اور اگر تھا تو صرف لگان وصول کرنے تک۔ ترکوں نے کوئی کوشش ہندووں کے مذہب کے سمجھنے کے لئے بھی نہیں کی۔ ایسا لگتا ہے کہ ان لوگوں سے کسی قسم کا کوئی رشتہ ہی نہ تھا۔ آزادی بیان کا کوئی سوال نہ تھا کیوں کہ ان کی حکومت میں ان لوگوں کا کوئی دخل ہی نہ تھا۔ اکبر نے ہندوؤں سے تعلقات قائم کئے۔ انہیں مغل حکومت کا حصہ بنایا اور ان لوگوں سے رشتہ ازدواج بھی قائم کیا۔ اس کے بعد مکمل آزادی کا مسئلہ سامنے آیا۔ ہندووں کا کیا سوال، ترکوں کے عہد میں تو شیعوں کو بھی آزادی بیان کی سہولت حاصل نہ تھی۔ اس دور کے مورخین کی تاریخیں مثلاً ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی وغیرہ اس کے بین ثبوت ہیں۔ اکبر کا اس آزادی کی راہ میں پہلا قدم ۱۵۶۳ء میں ہندوؤں پر تیرتھ یاترا ٹیکس کا معاف کرنا تھا۔ ہر شخص مذہبی آزادی کا خواہاں ہے۔ لیکن ۱۵۶۳ء تک مالدار ہندو تو تیرتھ کے لئے ٹیکس ادا کر کے تیرتھ یاترا کر سکتے تھے لیکن غریب ہندو تیرتھ یاترا کے حق سے اس لئے محروم تھے کہ وہ مفلوک الحال ہونے کی وجہ سے یہ ٹیکس ادا نہیں کر پاتے تھے اور تیرتھ یاترا کی حسرت ان کے دلوں میں ہی رہ جاتی تھی۔ اس ٹیکس کو ختم کر کے اکبر نے تمام ہندووں کو تیرتھ یاترا کی آزادی دی۔ اس دور میں بھی عبد القادر بدایونی، شیخ احمد سرہندی وغیرہ نے اکبر کے ان اقدامات کی مخالفت کی اور آج بھی پاکستانی مورخ اکبر کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے۔

صوفیاء نے ہندوستان میں خانقاہوں کی بنیاد ڈالی، جن کے دروازے بلا تفریق مذہب وملت سب

کے لئے کھلے رکھے۔ ہر شخص چاہے وہ ہندو ہو یا کسی اور مذہب کا پیرو ہو خانقاہوں میں آسکتا تھا، ساتھ بیٹھ سکتا تھا اور اپنی بات کہہ سکتا تھا۔ لیکن سولہویں صدی سے صوفی تحریک کمزور ہونا شروع ہوگئی۔

اکبر کے عہد کے ابتدائی دور میں مخدوم الملک عبداللہ سلطانپوری اور شیخ عبد النبی جیسے علماء جس کو چاہتے قتل کرادیتے اور جس کو چاہتے اس کی لاش کو قبر سے نکلوا کر دوسری جگہ دفن کروادیتے۔ مخدوم الملک کی تو یہ حالت تھی کہ جن کتابوں سے وہ متفق نہ ہوتے ان کتابوں کو بھی جلوادیتے۔ خود بدایونی نے یہ واقعہ لکھا ہے کہ ''میں ۱۵۷۲ء میں فتح پور میں ابوالفضل کے ساتھ مخدوم الملک سے ملنے گیا تو دیکھا کے ان کے سامنے امیر جمال الدین عطاء الدین فضل اللہ حسینی شیرازی کی کتاب۔ روضة الاحباب فی سیرة النبی والاصحاب، رکھی تھی۔ جب ہم بیٹھ گئے تو ہم سے کہا کہ دیکھتے ہو کہ اس کتاب میں مقتدیان ولایت نے کس قدر غلط بیانی سے کام لیا ہے اور ایک شعر کی طرف ہماری توجہ دلائی کہ یہ تو رفض سے بھی زیادہ ہوگیا۔ سب نے طے کرلیا ہے کہ اس کتاب کو جلادوں'' [۱] اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ آزادی بیان کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔

اکبر کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ کوئی ایک ایسا سینٹر بنایا جائے جہاں تبادلہ خیال ممکن ہو۔ لہٰذا ۱۵۷۵ء میں فتح پور میں اس نے عبادت خانہ کی بنیاد ڈالی۔ بدایونی کے مطابق یہ عبادت خانہ اس مقام پر تعمیر ہوا جہاں کبھی میاں عبد اللہ نیازی سرہندی کی خانقاہ ہواکرتی تھی۔ بدایونی کو یہ بات پسند نہ آئی اور اس نے کہا کہ فاروقیوں کی ملکیت پر فرعون وشداد کی عبادت گاہ تعمیر ہوئی [۲] بدایونی کے اس جملہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اکبر کے اس فیصلہ سے قطعی ناخوش تھا۔

ابتداء میں عبادت خانہ میں صرف سنی علماء کو بات چیت کرنے کے لئے مدعو کیا گیا۔ اور یہ جلسہ عبادت خانہ میں شب جمعہ میں منعقد ہوتا تھا۔ اکبر خود اس جلسہ میں شرکت کیا کرتا تھا۔ [۳] مختلف موضوعات پر بحث ہوتی۔ اکبر سب سے اوپر بیٹھتا اس کے بعد ابوالفضل، فیضی بیٹھتے اور اس کے بعد والے درجہ پر باقی علماء کی نشست ہوتی۔ عبادت خانہ کی ایک پینٹنگ بھی دستیاب ہوئی ہے جسکی وجہ سے عبادت خانہ کی صحیح جگہ کی نشاندہی ممکن ہوسکی۔ جب ڈاکٹر محمد کے کے، آگرہ سرکل، آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کے سپرنٹینڈنگ آرکیالوجسٹ تھے، انہوں نے فتح پور کی جامع مسجد کے سامنے

۱۔ ابوالفضل۔ اکبرنامہ۔ جلد سوم۔ صفحہ ۳۶۵

۲۔ بدایونی منتخب التواریخ۔ جلد دوم صفحہ ۲۰۲

۳۔ بدایونی منتخب التواریخ۔ جلد دوم۔ ص ۲۱۲

بدایونی کے بیان اور پینٹنگ کی مدد سے اس جگہ کھدائی کی اور وہ پلیٹ فارم مل گیا جو عبادت خانہ کی عمارت کا حصّہ تھا۔

ابو الفضل نے اکبر نامہ میں بھی عبادت خانہ کا تذکرہ کیا ہے۔ اکبر گجرات سے کتابوں کا ایک ذخیرہ اپنے ساتھ لایا اور اس کو اس نے ان علماء کو دیا جو عبادت خانہ کی بحث میں حصہ لیا کرتے تھے[۱] بدایونی نے لکھا کہ اس کو'' مشکوٰۃ الانوار'' کی جلد ملی[۲] اکبر نے عبادت خانہ میں علماء کے علاوہ مشائخ کو بھی دعوت دی جس کے نتیجہ میں شیخ بدر الدین چشتی کو بھی جو شیخ سلیم چشتی کے فرزند تھے، اس عبادت خانہ میں آنے اور بحث میں حصہ لینے کا موقع ملا۔[۳] لیکن اکبر نے ایک بات کی ہدایت کررکھی تھی کہ بحث ومباحثہ تہذیب کے دائرہ میں رہ کر ہوگا اور کوئی شخص اس بحث میں کسی کو ذلیل نہیں کرے گا اور نہ ہی نازیبا الفاظ کسی کے خلاف استعمال کرے گا۔ اکبر نے عبادت خانہ کے نظم وضبط کی ذمہ داری عبد القادر بدایونی کے سپرد کی اور انہیں ہدایت دی کی جو شخص بھی عبادت خانہ کے ڈسپلن کی خلاف ورزی کرے، اس کو عبادت خانہ سے باہر نکال دیا جائے۔ ایک رات عبادت خانہ میں بہت سخت بحث چل رہی تھی اور علماء ایک دوسرے کو برا بھلا کہہ رہے تھے ۔ اس وقت آصف خاں، بدایونی کے نزدیک بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے بدایونی سے کہا کہ اگر تم بادشاہ کی ہدایت پر عمل کرو تو اس وقت کوئی بھی عبادت خانہ میں نہ رہ سکے گا۔ بدایونی کو آصف خاں کی اس بات پر ہنسی آگئی۔[۴] عبادت خانہ کی بحث کا یہ حشر اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ ہم دوسرے کو کچھ کہنے کی آزادی دینا نہیں چاہتے بس ہم جو کہہ رہے ہیں وہی صحیح ہے اور وہی دوسروں کو ماننا چاہئے۔

عبادت خانہ کے اس تجربہ کے بعد اکبر نے ایک انقلابی قدم یہ اٹھایا کہ عبادت خانہ کے دروازے شیعی علماء کے لئے بھی کھول دیئے۔ ۱۲۰۶ء میں ترکوں کی سلطنت کے قیام کے بعد، ۱۵۷۶ء میں یہ پہلا موقع تھا جب شیعی علماء کو آزادی بیان کا حق ملا۔ یہ وہ وقت تھا جب ایرانی علماء مع اپنے کتاب خانہ کے ہندوستان پہونچ چکے تھے ۔ ان میں سے کچھ نے لاہور ، آگرہ، فتح پور اور کچھ علماء نے حیدر آباد میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ اب کیا تھا تاریخ اسلام کے مختلف ابواب پر بحث شروع ہوئی اور خاص طور سے ان سوالات پر بحث ہوئی جو حکومت بنی امیہ کی مختلف پالیسیوں کے نتیجہ میں

۱۔ ابو الفضل ۔ اکبرنامہ ۔ جلد سوم ۔ صفحہ ۳۶۵

۲۔ بدایونی منتخب التواریخ ۔ جلد دوم صفحہ ۲۰۲

۳۔ بدایونی منتخب التواریخ ۔ جلد دوم ۔ ص ۲۱۲

۴۔ بدایونی منتخب التواریخ ۔ جلد دوم ۔ ص ۲۰۱

سامنے آئے۔ بدایونی نے لکھا ہے کہ اس قدر بحث کرتے کہ پسینہ آجاتا۔لیکن بدایونی کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس بحث میں شیعی علماء کی بحث بڑی مدلل ہوتی اور ان لوگوں کی مدلل بات کے سبھی دانشور قائل ہوجاتے[۱] اسی بحث کے نتیجہ میں بعد میں بعض شیعی علماء نے کتابیں لکھیں ۔جن میں قاضی سید نور اللہ شوشتری کی احقاق الحق اہمیت کی حامل ہے۔ اکبران علماء سے متاثر ہوا جن کا مطالعہ عمیق تھا۔ اکبر نے ان علماء کا احترام کرنا شروع کردیا۔ بدایونی لکھتا ہے کہ" اس بحث کے نتیجہ میں پہلے جو اکبر کی نظر میں چڑھے ہوئے تھے، وہ گر گئے اور جو دور تھے وہ اکبر کے قریب آگئے[۲]

۱۵۷۸ء میں اکبر کا انتہائی اہم قدم ہندوؤں ، عیسائیوں اور پارسیوں کو عبادت خانہ میں مدعو کرنا تھا۔ اکبر نے ایسا کیسے سوچا اس لئے کہ سولہویں صدی میں دنیا اس دور سے گذر رہی تھی کہ انگلینڈ اور یوروپ میں عیسائی ، عیسائیوں کا گلا کاٹ رہے تھے۔مسلم دنیا میں سنی شیعوں کا قتل کررہے تھے اور شیعہ سنیوں کا قتل کررہے تھے ۔لیکن یہ تھا اکبر کا ہندوستان جہاں فتح پور میں عبادت خانہ میں سنی، شیعہ ، ہندو، عیسائی اور پارسی دانشورانہ بحث میں مصروف تھے۔ ابو الفضل نے اکبر نامہ میں ان لوگوں کی فہرست دی ہے جو اس بحث میں شامل تھے۔ ان میں صوفیاء، فلاسفہ ،مقرر ،علماء قاضی، سنی، شیعہ، برہمن، یہودی، عیسائی، زردشتی وغیرہ[۳] سبھی موجود رہا کرتے تھے۔

اکبر ہندوستان کا پہلا بادشاہ ہے جس نے آزادئ بیان کا احترام کیا۔ اورلوگوں کو آزادی بیان کی سہولت بھی فراہم کی ۔جس کے نتیجہ میں وہ مغل حکومت کے قریب آتے گئے۔ پھر اکبر کا اگلا قدم ''صلح کل'' کا قیام تھا۔ آزادی بیان اور صلح کل نے تو مغل حکومت میں ایک انقلاب برپا کردیا۔ اس کے نتیجہ میں اکبر نے ایک مضبوط ہندوستان کا خواب دیکھا۔مغل حکومت کو اکبر کے عہد میں جو ترقی حاصل ہوئی اس میں اس کی ان دو پالیسیوں، ایک آزادی بیان اور دوسری صلح کل' کا بڑا دخل ہے۔ آج کا سیکولر ہندوستان اکبر کے خواب کی تعبیر ہے۔

۱۔ بدایونی منتخب التواریخ، جلد دوم، صفحات ۲۱۱-۳۰۸ ۲۔ایضاً صفحہ ۳۰۸

۳۔ اکبرنامہ، جلد سوم، صفحہ ۳۶۵

آزادی بیان بحوالہ منشور حقوق بشر و نہج البلاغہ

پروفیسر شاہ محمد وسیم

انسان اور عقل

الیکسز کارل Alexis Carel مؤلف ''انسان موجود ناشناس'' ''Man The Unknown'' کہتا ہے کہ انسانی بدن غیر معمولی استحکام واستعداد کا حامل ہے، یہ جسم ہر قسم کے حادثہ میں استقامت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اسی طرح بھوک ، بے خوابی، تکان، بہت زیادہ غصہ، درد، بیماری، دکھ، مشقت اور روح وبدن میں موجود حیرت انگیز اعتدال کی حفاظت کے موقعہ پر بہت عجیب وغریب تحمل اور قوت برداشت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہاں تک کہ کہا جاسکتا ہے کہ عام حیوانات میں سے انسان میں باقی رہنے اور جدوجہد کرنے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔ اپنی اس عجیب وغریب فکری وجسمانی توانائی کی وجہ سے ہی انسان صنعت وتمدن میں اس مقام پر آن پہنچا ہے۔ اور تمام جانوروں پر اپنی برتری ثابت کرچکا ہے۔

''خدا نے انسان کو عقل سے بہتر کوئی چیز نہیں دی ہے۔'' فرمایا موسیٰ ابن جعفرؑ نے کہ عقل وعلم ساتھ ہیں ۔ یہی عقل وعلم انسان کو سوچنے ، سمجھنے اور اظہار خیال وبیان کے قابل بناتے ہیں۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ اپنے خیالات وتصورات کا نہ صرف حامل بنے بلکہ اسے یہ حق بھی ملے کہ وہ انہیں آزادانہ طور پر دوسروں تک پہونچا بھی سکے۔

منشور حقوق بشر اور آزادانہ بیان:

انسان کو جو جمہوری حقوق حاصل ہیں ان میں اور اسے فراہم کی گئی مختلف النوع آزادیوں کے درمیان آزادی بیان کو ایک کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے حقوق انسانی پر کسی قسم کے اعلامیہ یا عہد نامہ کا خاکہ تیار کرنے سے قبل، اپنے ۱۹۴۶ء کے اوّلین اجلاس میں ریزویشن نمبر ۵۹ (۱) میں تصریح کی کہ'' معلومات (حاصل کرنے) کی آزادی ، انسانی حقوق کے ضمن میں ایک اہم انسانی حق ہے اور یہ (حق) ہر اس آزادی کی کسوٹی ہے جسے اقوام متحدہ نے بجا قرار دیا ہے۔''[1]

1.Freedom of information is a fundamental human right and... the touchstane of all the freedoms to which the United Nations is consecrated.

آزادی بیان جمہوریت کے قائم ودائم رہنے اور فیصلوں میں عوام کی حصہ داری کی ضمانت ہے۔ کسی ملک کے باشندے اس وقت تک نہ اپنے حق رائے دہندگی کا استعمال مؤثر طور پر کرسکتے ہیں اور نہ ہی عوامی سطح پر کوئی فیصلہ کرسکتے ہیں، جب تک انہیں معلومات اور مختلف النوع خیالات وتصورات کو آزادانہ طور پر حاصل کرنے کی سہولت نہ ہو اور وہ خود اپنے خیالات وتصورات کا آزادانہ طور پر اظہار نہ کرسکتے ہوں۔ اس طرح آزادی بیان انسان کی انفرادی عظمت واہمیت، سماج میں اس کی حصہ داری، ذمہ داری اور جمہوری اقدار کی نشوونما کے لئے لازمی ہے۔ اس کی خلاف ورزی تمام دوسرے انسانی حقوق کو کالعدم قرار دے دیتی ہے، جیسے ادارہ سازی اور مل جل کرکسی ادارہ میں باہمی طور پر فرائض کے انجام دینے کا حق۔

اس طرح آزادی بیان ہر فرد کو آزادانہ اظہار خیال اور حق رائے دہندگی عطا کرتی ہے۔ آزادئی بیان وہ حق ہے جو جمہوریت کی تقویت کا باعث اور ملکی معاملات میں سیاسی حق داری کی ضمانت ہے۔ آزادی بیان کے بغیر" دوسرے تمام بنیادی حقوق مثلاً حق رائے دہندگی وغیرہ تحلیل ہوکر معدوم ہوجاتے ہیں۔" لیکن ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ آزادئی بیان کی وسعت لامتناہی نہیں ہوسکتی کیونکہ اس کا بے روک وٹوک استعمال دوسرے حقوق اور دوسروں کے حقوق سے ٹکراسکتا ہے۔ لہٰذا حالات اور معاملات کی مناسبت سے نقطۂ اعتدال پر لانے کے لئے اسے کنٹرول کرنا بھی ضروری ہے۔ مثال کے طور پر (بلاوجہ) نفرت آمیز بیان (Hate Speech) پر روک لگانا ضروری ہے۔ اس کی انتہائی مثال ۱۹۹۴ء میں روانڈا Rawanda میں رونما ہونے والی نسل کشی اور وہ نسل انگیز حملے ہیں جن کے لئے ریڈیو اور ٹیلی ویژن (Libre des Milles Collines) کا استعمال کیا گیا تھا۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ Hate Speech کو دبایا جائے اور ذرائع ابلاغ کا استعمال انسان کی بھلائی کے لئے ذمہ دارانہ طور پر کیا جائے۔

۱۹۴۸ء میں حقوق انسانی کا عالمی اعلامیہ(Universal Declaration of Human Rights) وجود میں آیا جس کو اسی سال ۱۰ ردسمبر کے اجلاس میں جنرل اسمبلی نے قبول کرلیا۔ اس اعلامیہ کی دفعہ ۱۹ میں کہا گیا ہے :

" ہر شخص کو... آزادانہ طور پر اپنی رائے رکھنے اور اسے بیان کرنے کا حق حاصل ہے۔ اسی حق کے تحت اسے بلاکسی مداخلت کے اپنی رائے رکھنے اور معلومات (کے ذرائع) کا پتہ لگانے،اسے حاصل

کرنے اور (ان) معلومات اور خیالات کو کسی بھی ذریعہ ابلاغ کی وساطت سے بغیر کسی حد بندی کے (دوسروں تک) پہونچانے کا حق حاصل ہے۔''[1]

بین الاقوامی عہد نامہ برائے شہری وسیاسی حقوق (International Covenant on Civil & Political Rights) ۱۹۶۶ سے لاگو ہے۔ یہ اعلامیہ حقوق انسانی کے عالمی اعلامیہ میں مندرج اصولوں کو تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ اس پر عمل پیرا ہونا ہر اس حکومت کی ذمہ داری ہے جس نے اس پر دستخط کئے ہیں اور اس کی تصدیق کی ہے ICCPR کی دفعہ ۱۹ واضح طور پر یہ شرط عائد کرتی ہے کہ:

''۱۔ ہر شخص کو بغیر کسی مداخلت کے رائے رکھنے کا حق ہوگا۔

۲۔ ہر شخص کو آزادی بیان کا حق حاصل ہوگا، اس حق کے تحت اسے ہر قسم کی معلومات اور خیالات کا پتہ لگانے، انہیں حاصل کرنے اور دوسروں تک پہونچانے کی آزادی (بھی) شامل ہے، چاہے یہ زبانی (انجام پائے) یا تحریری طور پر یا طباعت کے ذریعہ (انجام پائے)۔ یا فنکارانہ (تخلیق) کی صورت میں یا اس کی پسند کے کسی دوسرے ذریعہ ابلاغ کے توسط سے۔

۳۔اس دفعہ کے دوسرے پیراگراف میں دیئے گئے حقوق کو بروئے کار لانے کے ساتھ ساتھ مخصوص فرائض اور منصبی ذمہ دارایاں (بھی) عائد ہوتی ہیں۔ اس لئے ان حقوق پر کچھ پابندیاں بھی لگائی گئی ہیں، مگر یہ پابندیاں وہی اور اسی طرح کی ہوں گی جن کا قانونی جواز ہو اور جو لازمی قرار پاتی ہوں: (الف) دوسروں کے حقوق کا احترام یا ان کی شہرت کے واسطہ سے (ب) ملکی تحفظ یا عوامی نظم وضبط (Public Order) کی خاطر یا پھر شہریوں کی صحت یا اخلاقیات کے لئے۔''[2]

مخصوص اقوام متحدہ رپورتیر برائے آزادی رائے اور بیان (UN Special Rapporteur on Freedom of Opinon & Expression) کا تقرر اقوام متحدہ کمیشن برائے حقوق انسانی کی ایک قرار داد کے ذریعہ ۱۹۹۳ء میں ہوا تھا۔ اس کے تحت حکومتوں، غیر سرکاری اداروں اور دوسروں کے ساتھ بھید بھاؤ،

1."Everyone has the right to the freedom of opnion and expression. This right includes freedom to hold opinions without interference and to seek, receive and import information and ideas through any media and regardless of frontiers.

2.Article 19 of the (CCPR) stipulates that: Everyone shall have the right to hold opinions without interference.

Everyone shall have the right to freedom of expression, this right shall include freedom to seek, receive and import information and ideas of all kinds, regardless of Frontiers, either orally, in writing or in print, in the form of art or through any other media of his choice.

The exercise of the rights provided for in paragraph 2 of this Article carries with it special duties and responsibilities, it many therefore be subject to certain restrictions, but these shall only be such as are provided by law and are necessary : (a) For respect of the rights, or reputations of others (b) for the protection of national security or of public order (*order public*), or of public health or Morals".

تشدد جن میں پیشہ ور افراد بھی شامل ہیں، کوحق آزادی رائے اور بیان کے ضمن میں ستائے جانے کے واقعات کے اعداد وشمار جمع کرنے اور پھر انہیں اپنی سالانہ عمومی رپورٹ اور ملکی رپورٹ میں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ، ان حقوق کی بہتری کے لئے اپنی سفارشات کو پیش کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔

یونسکو(UNESCO)بھی آزادی بیان اور اس ضمن میں پریس کی آزادی کو ایک بنیادی حق کی حیثیت سے بڑھاوا دیتا ہے۔ اس حق کی اہمیت کے مدنظر ۱۹۹۳ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کا وہ اعلان بھی قابل ذکر ہے ، جس کے ذریعہ ہر سال ۳ مئی کو عالمی ''یوم آزادئی پریس'' کے طور پر منائے جانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس ضمن میں یونسکو (UNESCO)نے ۱۹۹۷ میں گوئیلر مکنو (Guillermocano) عالمی آزادی پریس انعام کی تاسیس بھی کی ہے۔ آزاد ذرائع ابلاغ کو متنازعہ علاقوں میں یونسکو (UNESCO)کی سرپرستی اس خیال کے تحت حاصل ہے کہ تنازعہ کا سدباب کیا جاسکے اور ثقافت اور امن وسلامتی کی طرف مثبت طور پر پیش رفت ہو۔ یونسکو (UNESCO) کا خیال ہے کہ پریس کی آزادی، مجموعی طور پر آزاد ذرائع ابلاغ ، اخبار کی ترویج اور ریڈیو اسٹیشنوں کا قائم ہونا سماجی، رشتوں کو استوار کرنے اور مصالحتی تدابیر میں معاون ہوں گے ۔ آزادئی بیان اور اس کی اضافی جہت کے طور پر پریس کی آزادی کو انسان کی زندگی میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

انٹرنیٹ اور آزادی بیان

۱۹۹۰ء کی دہائی سے حق آزادی بیان کی توسیع کے تحت ہماری زندگی، کاروبار، طرز زندگی اور روزمرہ کے برتاؤ اور طریقہ کار سب ہی کو کمپیوٹری نظام کے تحت بتدریج لایا جا رہا ہے۔ اس طرح عالمی سطح پر تیز رفتار اور پراثر تبادلۂ خیال کو آزادی بیان کی ذمہ دارانہ وسعت کی رو سے دیکھا جارہا ہے ، اس شرط کے ساتھ کہ شخصی واجتماعی ذمہ داری اور قانون ہاتھ سے جانے نہ پائیں۔ در اصل موجودہ دور میں ذمہ داری یہ نبھانا ہے کہ انٹرنیٹ (Internet) اور برقی ذرائع ابلاغ کے فوائد پر ضرب بھی نہ لگے اور ان کے غیر ذمہ دارانہ اور مجرمانہ استعمال پر روک بھی لگ جائے مثلاًان برقی ذرائع ابلاغ اور انٹرنیٹ (Internet) کا استعمال نابالغ بچوں (بلکہ کسی کے بھی) جنسی استحصال کے لئے نہ کیا جانا چاہئے۔

آزادی بیان اور فتنہ انگیز (Seditious) اور خرابکار (Subversive) تقاریر کے لئے حکومت کے

سزا دینے کے اختیار کی قانونی حد بندی کرنے میں امریکہ میں دوسو برس لگ گئے[1] بہت سے لوگوں کو تکلیفیں اٹھانی پڑیں۔ جیسے مزدور لیڈر Engene V. Debs کو دس سال کی سزا مزدوروں کی پر امن ریلی کو خطاب کرتے ہوئے یہ کہنے پر دے دی گئی تھی کہ آپ سب ''غلامی اور توپوں کا چارہ بننے سے بہتر چیز کے حقدار ہیں۔''

بیسویں صدی کی ابتدا بھی کچھ زیادہ اطمینان بخش ثابت نہ ہوئی۔ ٹریڈ یونین کے جلسوں کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔ عدالتیں اسٹرائک کرنے والوں اور مزدوروں کے احتجاج پر پابندیاں عائد کرنے لگیں۔ ان احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کو قید کرلیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ پہلی جنگ عظیم میں امریکہ کی شمولیت کے خلاف پر امن احتجاج کرنے والوں کو قید وبند کی مصیبتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا تھا۔

اسی طرح کے معاملات سے نپٹنے کے لئے ۱۹۲۰ء میں (امریکن سول لبرٹیز یونین : American Civil Liberties Union) امریکی یونین برائے شہری آزادی کا قیام عمل میں آیا۔

آزادی بیان اور ہماری ذمہ داری

آزادی بیان کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ اسے بغیر کسی اخلاقی شرط اور قانونی بندش کے غیر ذمہ دارانہ طور پر استعمال کیا جائے۔ کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ آزادی بیان کے نام پر کسی دوسرے کے جذبات کو بلاوجہ مجروح کرے یا اسے معطل کردے یا اسکے خیالات وتصورات کو غیر دیانتدارانہ طور پر خود اپنے نام سے دوسروں تک پہونچائے۔ بلکہ اس کے برعکس آزادی بیان کا مطلب یہ ہے کہ خود اپنے خیالات اور تصورات کو اگر ضرورت ہوتو عام کیا جائے یا اسے دوسروں تک پہونچایا جائے، نہ یہ کہ کسی دوسرے کے خیالات اور تصورات کو غیر دیانتداری کے ساتھ خود اپنے نام سے عام کیا جائے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آزادی بیان اور دیانتداری لازم وملزوم قرار پاتے ہیں۔

ہر فرد ومعاشرہ اور حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ خدا کی بندگی کے ساتھ ساتھ، انسانیت کی فلاح وبہبود اور آزادی بیان سب کو مدنظر رکھتے ہوئے صحت مند معاشرہ کی تشکیل اور اس کی ترقی، باہمی زندگی(Mutual Existence) کے اصول پر کاربند رہتے ہوئے، خود اپنی اور انسانی معاشرہ میں

1.Freedom of Expression: ACLU Position Paper (1.2.1997)

ایک ایک فرد یعنی سب کی اصلاً خوشی اور صحتمند زندگی کے لئے کوشاں رہے۔

آزادی بیان ایک حق ہی نہیں ، ایک ذمہ داری بھی ہے ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آزادی بیان اپنی حدوں سے تجاوز کر کے ایک ایسے نقطہ تک جا پہونچے جس کے اردگرد اندھیرا ہی اندھیرا ہو ! آزادی بیان کے نام پر انسان کو اس کے مقصد حیات سے دور کرنے والے بیانات تحریریں اور اقدامات آزادی کے نام پر غیر صحتمند رجحانات ، اذہان میں پلنے والے غیر صحتمند تصورات وخیالات کی غلامی کے مترادف ہوں گے جو نہ صرف یہ کہ انسان کو بربادی کے ایک دہانہ پر لاکر کھڑا کردیں گے، بلکہ اسے برباد کر ڈالیں گے۔ آزادی بیان کے نام پر کیو کلکس کلان Ku Klux Klan کی حمایت کرنا، عجب سی بات ہے۔ آزادی بیان کو اصل اصول پے کاربند رہتے ہوئے بروے کار لانا چاہئے۔ یہی وہ روش ہے جس کے ذریعہ وہ اپنی جہت اور منزل کو پاسکتی ہے۔ زبان کو کہاں رکنا چاہئے اور کہاں اسے تیز رفتاری کے ساتھ معنی و مطالب کو ادا کرنا چاہئے ، اس کا فیصلہ صحتمند تفکر کے زریں اصولوں کو مدنظر رکھ کر ہی کیا جاسکتا ہے۔

آزادی بیان اگر صحتمند ذہن وتفکر کے تابع ہوگی تو ہر فرد اپنی شخصیت کو ابھار سکتا ہے انسانی صلاحیتوں کو بروئے کار لاسکتا ہے۔ اس طرح آزادی بیان علم کی ترویج اور اس میں اضافہ کی جہت میں محرک و مفید وموثر ثابت ہوگی۔ یہ حق کے متلاشی کو اس کی منزل تک پہونچا سکتی ہے۔ انیسویں صدی کے مشہور ومعروف فلسفی، مصنف ،شہری آزادی کے نقیب اور ماہر معاشیات جان اسٹوارٹ مل (John Stuart Mill) کا قول ہے کہ دانشمندانہ فیصلہ اسی وقت ممکن ہے جب کوئی تمام حقائق اور خیالات پر غوروفکر کرلے ، چاہے اس کا سرچشمہ کوئی بھی ہو۔ ایسے میں فیصلہ کرتے وقت خود اپنے نظریات کے مدمقابل دوسروں کے نظریات کا محاسبہ کرنے کے بعد، لئے گئے فیصلے ہی در اصل صحیح ہوتے ہیں۔

اس طرح کے مدبرانہ ، دانشورانہ اور ذمہ دارانہ غوروفکر کے بعد اب جو زبان کھلے گی تو اظہار حق کے لئے ، اسکے ماسوا اور کسی چیز کے لئے نہیں ! کیونکہ عقل پر ایمان کا سایہ ہوگا۔ امام حسین علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے کہ عقل صرف حق کی پیروی سے مکمل ہوتی ہے۔

آزادی بیان نہج البلاغہ کی روشنی میں

خدا نے انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کیا ہے، اس طرح کہ ” اگر اس کی عقل اس کی شہوت وغضب پر غالب آجائے تو یہ فرشتوں سے افضل ہے اور اگر اس کی شہوت اور غضب اس کی عقل پر غالب آجائے تو یہ حیوان سے پست ہے۔[۱] چونکہ انسان کے لئے سب سے بڑی دولت عقل ہے۔“ [۲] اس لئے آزادی بیان کو جذبہ حق پرستی اور عقل کے تابع ہونا چاہئے ۔ اگر زبان عقل کی محکوم نہ ہوتو درندہ بن جاتی ہے۔ عقل اسے بے راہ رو ہونے سے روکتی ہے اور اسے بے جا آزادی عطا نہیں کرتی ہے۔ جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے” زبان درندہ ہے اگر چھوڑ دو ،(جو چاہے کہے) تو کاٹ لے (گی)“ [۳] آزادی بیان کو بروئے کار لانے والے ہر شخص کو اپنی ذمہ داری آپ سمجھنا چاہئے ۔ نہ کسی کی دل آزاری کرنا چاہئے اور نہ کسی کو بدنام کرنے کی سازش کے تحت زبان کھولنا چاہئے۔ بلکہ جیسا کہ قرآن حکیم کا ارشاد ہے۔ وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (اور تم میں سے ایک گروہ ایسے (لوگوں کا بھی) تو ہونا چاہیئے جو (لوگوں) کو نیکی طرف بلائے، اچھے کاموں کا حکم دے اور برے کاموں سے روکے [۴] آزادی بیان کا استعمال امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے لئے کرنا چاہئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ خالق کائنات نے اپنے بندوں پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ زبان سے بیان کرنا ،قلم سے لکھنا اور عمل کرکے دکھانا اور سبق دینا، سب نیکی کی تعلیم دینے کی غرض سے ہونا چاہئے۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ

” جو شخص خود کو عوام کا قائد جتائے اسے چاہئے کہ وہ دوسروں کو تعلیم دینے سے پہلے اپنی ذات کو تعلیم دے اور اس کا کردار اس کی زبان سے پہلے ادب سکھائے اور نمونہ عمل دکھائے ۔ اپنے نفس کو مودب کرنے اور قابل بنانے والا دوسروں کو تعلیم دینے والے سے زیادہ قابل تعلیم وعزت ہے۔“ [۵]

” بولو کہ پہچان لئے جاؤ کیونکہ انسان زبان کے پردے میں چھپا ہوا ہے۔“ [۶] کے مصداق جو صحتمند تصورات اور خیالات کے حامل ہیں، جو بندگان خدا کی بھلائی چاہتے ہیں اور سب سے بڑھ کر جو خوف خدا دل میں رکھتے ہیں، انہیں آزادئی بیان کے حق کے تحت اپنے کلمات اور نمونہء عمل کو

۱۔ حضرت علی علیہ السلام ۲۔ ایضاً ۳۔ مختصر کلمات ۵۸، نہج البلاغہ ، احباب پبلیشرس، لکھنؤ ، ۱۹۸۲ء، صفحہ ۹۱۱

۴۔ قرآن، سورہ آل عمران ، آیت ۱۰۴ ترجمہ مولانا فرمان علی ، نظامی پریس، لکھنؤ۔

۵۔ مختصر کلمات ۱۷، نہج البلاغہ ، احباب پبلیشرس ،لکھنؤ ۱۹۸۲ء ، صفحہ ۹۱۳۔

۶۔ حضرت علیؑ ،مختصر کلمات ۳۸۵، نہج البلاغہ، احباب پبلیشرس لکھنؤ ۱۹۸۲ء ، صفحہ ۹۸۸

دوسروں کے سامنے پیش کرنا چاہئے، تا کہ بہترین معاشرہ وجود میں آئے اور و بتدریج ترقی بھی کرتا رہے۔

بیان کرنے والے ہر ذمہ دار کو مولائے کائنات کی مندرجہ ذیل نصیحت پر عمل کرنا چاہئے۔

''اپنے اور دوسروں کے درمیان خود اپنی ذات کو میزان بنا۔ جو بات تجھے اپنے لئے پسند ہے وہی ان کے لئے بھی پسند کر اور جو بات خود اپنے لئے ناپسند کرتا ہے، ان کے حق میں بھی ناپسند کر۔''۱

صاحب نہج البلاغہ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ عقل کے تین مظہر ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ''دوسروں کی بھلائی کے لئے بولنا۔۲ قوت بیان عقل کی طلبگار ہے۔ اور صاحب عقل حق کا طلبگار ہوتا ہے اور جو حق کا طلبگار ہو، وہ ظلم نہیں کرتا، نہ زبان سے، نہ قلم سے اور نہ غیر ذمہ دارانہ کردار وعمل سے، کیونکہ ایک کا حق دوسرے پر ہوتا ہے اور پھر ''...آپس میں حق وانصاف کرنے کا دائرہ بہت تنگ ہے۔ دو آدمیوں میں ایک کا حق دوسرے پر اس وقت ہے جب دوسرے کا بھی اس پر حق ہو اور دوسرے کا حق اس پر جب ہی ہوتا ہے جب پہلے کا حق دوسرے پر بھی ہو... پھر اس نے (اللہ نے) ان حقوق انسانی کو بھی جنہیں ایک کے لئے دوسرے پر قرار دیا ہے اپنے ہی حقوق میں سے قرار دیا ہے۔''۳ اور ظاہر ہے جو اللہ کا حق ہے وہی بندوں کی ذمہ داری قرار پاتا ہے۔ اس طرح آزادی بیان حق نہیں ذمہ داری بن کر بندوں پر عائد ہوتی ہے۔ بیان کرنے والا حق اور عدل وانصاف سے پہلو تہی نہیں کرسکتا ہے۔

اور سننے والوں پر بھی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ جب وہ کچھ سنیں تو تحقیق کرلیں کہ کہنے والا سچ بول رہا ہے یا گمراہ کن رویہ کا حامل ہے۔ حضرت علیؑ نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''جب خبر سنو تو اسے شرائط کے ساتھ سمجھو، کیونکہ علم کے نقل کرنے والے تو بہت ہیں مگر اس کی دیکھ بھال کرنے والے کم ہیں۔''۴

آج کی دنیا اور اس کے پس منظر میں مندرجہ بالا تعلیمات پر عمل کرنا اور بھی زیادہ ضروری ہوگیا ہے کیونکہ مادی وسائل کو حاصل کرنے کی ہوس نے اذہان پر ضرب کاری لگائی ہے اور آج صحن عالم

۱۔ حضرت علیؑ، امام حسنؑ کے لئے وصیت نامہ، نہج البلاغہ، احباب پبلیشرس، لکھنؤ ۱۹۸۲ء، صفحہ ۶۷۷۔

۲۔ حضرت علیؑ نے ارشاد فرمایا کہ عقل کے ۳ مظہر ہیں: ۱۔ پوچھے جانے پر جواب دینا ۲۔ اس وقت بولنا جب سب عاجز ہوجائیں ۳۔ دوسروں کی بھلائی کے لئے رائے دینا۔ ۳۔ حضرت علیؑ خطبہ نمبر ۲۱۴ نہج البلاغہ، احباب پبلیشرس، لکھنؤ ۱۹۸۲ء، صفحہ ۶۶۲۔

۴۔ مختصر کلمات، نہج البلاغہ، احباب پبلیشرس، لکھنؤ ۱۹۸۲ء، صفحہ ۹۱۹۔

میں آزادی بیان کے نام پر وہی ہو رہا ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

جنوں کا نام خرد رکھدیا خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

آج دنیا کی روش اس طرح کی ہوگئی ہے کہ" کچھ لوگ فتنوں کے دریاؤں میں اترے ہوئے ہیں اور سنتوں کو چھوڑ کر بدعتوں میں پڑ چکے ہیں، ایمان والے دبکے پڑے ہوئے ہیں اور گمراہوں اور جھٹلانے والوں کی زبانیں کھلی ہوئی ہیں۔" ۱

حکومت اور آزادی بیان

قرآن کا فرمان ہے کہ... اِذَاحَکَمۡتُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ اَنۡ تَحۡکُمُوا بِالۡعَدۡلِ جب لوگوں کے مابین فیصلہ کرنا تو عدل سے کرنا۔لہٰذا اگر جور وظلم وستم بڑھنے لگے اور حقوق کی پامالی ہونے لگے تو ایسے میں کیا کریں؟ ایسے میں قائدین، علماء اور دانشوروں کے خامگر یہ ذمہ داری ہے کہ" آئین جواں مردی وحق گوی و بے باکی" کو اپنائیں۔ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ سلطان جابر کے سامنے ایک کلمۂ حق کہہ دینا ستر سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے مالک اشتر کو مصر کا گورنر بنایا تو دستور حکومت میں منجملہ اور باتوں کے یہ بھی تحریر فرمایا کہ

" خاص الخاص لوگوں میں بھی وہی تمہاری نگاہ میں سب سے زیادہ مقبول ہوں جو زیادہ سے زیادہ کڑوی بات تم سے کہہ سکتے ہوں..." ۲

یہی نہیں اگر فریاد کرنے والے آزادانہ طور پر حکمراں سے کچھ کہنا چاہتے ہوں تو ان کو آزادی بیان ملنا چاہیئے اس طرح کہ

" اور تم اپنے وقت کا ایک حصہ فریادیوں کے لئے خاص کر دینا۔"

سب کام چھوڑ کر ان سے ملاقات کرنا۔ ایسے موقع پر تمہاری مجلس کا دروازہ سب کے لیے کھلا رہے کہ جس کا جی چاہے بے دھڑک چلا آئے۔ اس مجلس میں خدا کے نام پر خاکسار بن جاؤ۔ فوجیوں، افسروں اور پولیس والوں سے مجلس کو بالکل خالی رکھنا تا کہ آنے والے تم سے دل کھول کر اپنی بات کہہ سکیں کیونکہ میں نے رسولؐ اللہ کو بار بار فرماتے سنا ہے کہ" اس امت کی بھلائی نہیں ہوسکتی، جس

۱۔ حضرت علیؑ خطبہ نمبر ۱۵۲، نہج البلاغہ، احباب پبلیشرس، لکھنؤ، ۱۹۸۲ء، صفحہ ۴۶۱۔

۲۔ مکتوب نمبر ۵۳، نہج البلاغہ، احباب پبلیشرس، لکھنؤ ۱۹۸۲ء، صفحات ۸۲۵۔۸۲۴۔

میں کمزوروں کا طاقت ور سے پورا حق دلایا نہیں جاتا۔''

'' یہ بھی یادر ہے کہ اس مجلس میں عوام ہی جمع ہوں گے ۔ اب اگر بدتمیزی سے بات کریں یا اپنا مطلب صاف صاف بیان نہ کرسکیں تو خفا نہ ہونا، برداشت کرلینا۔...''[۱]

اس طرح یہ بات واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہے کہ آزادیٔ بیان ، بیان کی آزادی ہی نہیں ایک ذمہ داری بھی ہے اور یہ کہ اس آزادی کا طلبگار انسان ہے اور انسان وہ ہے جو انسانیت کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہو، ورنہ اگر بہکا تو اسفل السافلین میں قرار پائے گا۔

اس طرے آزادی بیان انسان کا بنیادی حق ہے کہ ہو اشرف المخلوقات ہے اسے عقل وفہم عطا کرنے کے ساتھ ساتھ،قوت گویائی دے کر بھیجا گیا ہے اور اسے حکم دیا گیا ہے کہ وَتَوَاصَو بِالْحَقّ وَ تَوَاصَوْ بِالصَّبْرِ ۔لیکن آزادی پابند اصول وضوابط رہے ورنہ ایک کی آزادی کسی دوسرے کی اور دوسری آزادیوں سے ٹکرا جائے گی اور نتیجتاً انسان کے ہاتھ انتشار ہی انتشار آئے گا اور کچھ نہیں۔

۱۔مکتوب نمبر ۵۳ ، نہج البلاغہ، احباب پبلیشرس ،لکھنؤ ۱۹۸۲ ء،صفحہ ۸۳۶۔

عقاید شناسی

امام کی معرفت

علامہ محمد حسین طباطبائی

امام کے معنی

امام یا پیشوا کا لقب اس شخص کو دیا جاتا ہے جو کسی مخصوص معاشرتی تحریک یا سیاسی نظریہ یا علمی یا دینی طرز فکر میں کسی جماعت کی رہنمائی کرتا ہے۔ قدرتی طور پر اس تعلق کی بنا پر جو اس کے اور ان لوگوں کے مابین ہوتا ہے جن کی وہ رہنمائی کرتا ہے، یہ ضروری ہے کہ وہ اہم اور ثانوی معاملات میں اپنے اعمال اور ان کی صلاحیتوں کے درمیان مطابقت پیدا کرے۔

جیسا کہ گزشتہ ابواب سے ظاہر ہے، اسلام لوگوں کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے احکام جاری کرتا ہے۔ یہ انسان کی زندگی کا روحانی نقطۂ نگاہ سے مطالعہ کرتے ہوئے اس کی رہنمائی کرتا ہے ۔ اس کے علاوہ یہ فرد کی مادی زندگی اور اس کے نظم ونسق میں دخل انداز ہوتا ہے اور اسی طرح اجتماعی زندگی اور اس کے نظم وضبط (حکومت) میں بھی مداخلت کرتا ہے۔

لہٰذا اسلام میں امامت اور دینی پیشوائی کا مطالعہ تین پہلوؤں سے کیا جاسکتا ہے یعنی اسلامی حکومت کے نقطۂ نگاہ سے ، اسلامی علوم اور احکام کے نقطہ نگاہ سے اور روحانی رہنمائی کے نقطہ نگاہ سے۔ اہل تشیع کا اعتقاد ہے کہ چونکہ اسلامی معاشرہ کو ان تینوں شعبوں میں ہدایت کی اشد ضرورت ہے لہٰذا جو شخص ان معاملات میں پیشوائی کا رتبہ رکھتا ہو اس کا تقرر لازمی طور پر اس کے خدا اور اس کے رسولؐ کی جانب سے ہونا چاہیئے اور بلا شبہ پیغمبر بھی امام کو اللہ کے حکم سے نامزد کرتا ہے۔

امامت رسولؐ کی جانشینی اور اسلامی حکومت

انسان اپنی خدا داد فراست کی بدولت یہ بات کسی شک وشبہ کے بغیر سمجھ سکتا ہے کہ کوئی منظّم معاشرہ مثلاً ملک ،شہر یا گاؤں یا قبیلہ حتیٰ کہ کوئی گھر جس میں چند افراد رہتے ہوں ، ایک سرپرست اور حاکم کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ ہر معاشرہ کو ایک پیشوا کی ضرورت ہوتی ہے جو معاشرہ کے افراد کو اپنی سماجی ذمہ داریاں پوری کرنے کی رغبت دلائے۔ کسی ایسے حاکم کے بغیر معاشرہ کا شیرازہ تھوڑی ہی مدت

میں بکھر جاتا ہے اور افراتفری پھیل جاتی ہے لہذا جو شخص کسی چھوٹے یا بڑے معاشرہ کا حاکم یا پیشوا ہو اور وہ اپنے مقام یا معاشرہ کی بقا میں دلچسپی رکھتا ہو تو جب کبھی وہ عارضی اور مستقل طور پر اپنے فرائض انجام دینے سے کنارہ کش ہوتا ہے تو اپنا جانشین ضرور مقرر کرتا ہے۔ وہ اس بات پر آمادہ نہیں ہوتا کہ اپنی حکومت کو لاپروائی سے خیر باد کہہ دے اور خوشحالی و بردباری سے بے نیاز ہوجائے۔ اگر کسی گھر کا سرپرست چند دنوں کے لئے سفر پر جاتا ہے تو گھر کا انتظام چلانے کے لئے اپنے خاندان کے کسی فرد یا کسی شخص کو اپنا جانشین مقرر کرتا ہے اور گھر کا نظم ونسق اس کے سپرد کرتا ہے۔ کسی ادارہ کا سربراہ یا اسکول کا پرنسپل یا دکان کا مالک اگر چند گھنٹوں کے لئے غیر حاضر ہونا چاہے تو کسی نہ کسی کو اپنا نمائندہ مقرر کرتا ہے۔

اس طرح اسلام ایک ایسا دین ہے جس کی بنیاد قرآن وسنت کے مطابق اشیاء کی بنیادی فطرت پر رکھی گئی ہے اور جیسا کہ اپنے پرائے اور ہر مشاہدہ کرنے والے پر واضح ہے، اس دین کا تعلق اجتماعی زندگی سے ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اسکے رسولؐ نے اس دین کی اجتماعیت پر توجہ دی ہے۔ اس بات سے نہ انکار کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس سے چشم پوشی کی جاسکتی ہے۔

یہ اسلام کا ایک ایسا روپ ہے جس کا کسی دوسری چیز سے ہرگز مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں کہیں اسلام کو اثر ورسوخ حاصل ہوا رسول اکرمؐ نے سماجی گروہ تشکیل دینے کے مسئلہ کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ جب کبھی کوئی شہر یا قریہ اسلامی قلمرو میں شامل ہوتا آپؐ جس قدر جلدی ممکن ہوتا وہاں کا ایک والی یا حاکم مقرر کرتے اور مسلمانوں کے معاملات کا انتظام اس کے سپرد کردیتے[۱] آپؐ جب کبھی کسی اہم عسکری مہم (جہاد) کا حکم دیتے اس کے لئے ایک سے زیادہ سالار مقرر کرتے اور مقدم اور مؤخر کے لحاظ سے ان کی ترتیب بھی معین فرمادیتے۔ حتیٰ کہ جنگ موتہ میں آپ نے چار سالار مقرر کیے تاکہ اگر ان میں سے ایک قتل ہوجائے تو دوسرا اور اگر دوسرا قتل ہوجائے تو تیسرا سالار اور سردار کے فرائض انجام دے وعلیٰ ہذا القیاس۔[۲]

رسول اکرمؐ جانشینی کے معاملہ میں گہری دلچسپی لیتے تھے اور جب کبھی ضروری ہوتا جانشین کا تقرر فرماتے تھے۔ جب کبھی آپ مدینہ سے باہر تشریف لے جاتے تھے تو وہاں اپنا ایک نمائندہ چھوڑ کر

۱۔ تاریخ یعقوبی (جلد ۳، صفحات ۶۱-۶۲) اور سیرۃ ابن ہشام (جلد ۴، صفحہ ۱۹۷)

۲۔ تاریخ یعقوبی (جلد ۲، صفحات ۵۲ تا ۵۹) اور سیرۃ ابن ہشام (جلد ۲، صفحہ ۲۲۳)

جاتے تھے[۱] حتیٰ کہ جب آپؐ نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی تو صورت حال واضح نہیں تھی مگر آپؐ نے ان چند دنوں کے لئے اپنے معاملات کے نظم ونسق کی خاطر اور لوگوں کی امانتیں واپس کرنے کے لئے حضرت علیؑ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔[۲] اسی طرح آنحضرتؐ کی وفات کے بعد بھی حضرت علیؑ آپ کے قرضوں اور دوسرے معاملات کے لئے آپ کے جانشین تھے[۳] اسی بنا پر اہل تشیع دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ امر قرین قیاس نہیں ہے کہ آنحضرتؐ نے اپنے وصال سے پہلے اپنا کوئی جانشین مقرر نہ کیا ہو اور کسی ایسے رہنما کا انتخاب نہ کیا ہو جو آپ کے بعد مسلمانوں کے معاملات کا نظم ونسق سنبھالے اور اسلامی معاشرہ کے پہیوں کو حرکت میں لائے۔

انسان کی بنیادی فطرت کو اس امر کی قدرو قیمت اور اہمیت میں کوئی شک نہیں کہ معاشرہ کے وجود کا دارومدار کچھ مشترک قواعد وضوابط اور اصول پر ہے جنہیں اس معاشرہ کے مختلف طبقوں کی اکثریت عملاً قبول کرتی ہے اور معاشرہ کی بقاء کا انحصار ایک ایسی عادل حکومت پر ہوتا ہے جو ان قواعد کو مکمل طور پر نافذ کرے۔ کوئی باشعور شخص اس حقیقت کو نظر انداز یا فراموش نہیں کرسکتا ۔ اس کے علاوہ اسلامی شریعت کے وسیع اور دقیق ہونے اور اسکی اس اہمیت اور قدرو قیمت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا جو رسول اکرمؐ کے نزدیک اسے حاصل تھی اور جس کے اجرا اور بقاء کی خاطر آپ نے بے شمار قربانیاں دیں اور نہ ہی رسول اکرمؐ کی دماغی قابلیت، عقل کے کمال، صحیح رائے اور قوت تدبیر کے بارے میں کوئی بحث کی جاسکتی ہے۔ علاوہ اس کے کہ ان صفات کی تائید وحی اور نبوت سے ہوتی ہے۔

ان متواتر احادیث کے مطابق جو سنی اور شیعہ محدثین نے حدیث کی کتابوں میں (فتنہ وفساد کے باب میں) نقل کی ہیں، رسول اکرمؐ نے ان فتنوں اور مصائب کے متعلق جن سے ملت اسلامیہ آپؐ کی وفات کے بعد دو چار ہونے والی تھی اور ان خرابیوں کے بارے میں جو اسلام میں رخنہ پیدا کرنے والی تھیں مثلاً آلِ مروان وغیرہ کی حکومت جنہوں نے اس مقدس دین کو اپنی ہوا وہوس کا بازیچہ بنالیا تھا، تفصیل سے خبر دی تھی۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ ان حوادث اور مصائب کے بارے میں تو غفلت نہ برتیں۔ اور ان کا ذکر کریں جو ان کی وفات کے کئی سال نہیں بلکہ ہزار سال بعد رونما ہونے والے تھے، لیکن ان اہم ترین حالات سے جو ان کی وفات کے فوراً بعد پیش آنے والے تھے

۱۔ تاریخ یعقوبی (جلد ۲، صفحات ۵۹۔۶۰ اور صفحہ ۴۴) اور سیرۃ ابن ہشام (جلد ۲، صفحہ ۲۵۱ اور جلد ۴، صفحات ۱۷۳ اور ۲۷۲)
۲۔ تاریخ یعقوبی (جلد ۲، صفحہ ۲۹) تاریخ ابی الفداء (جلد ۱، صفحہ ۱۲۶) اور سیرۃ ابن ہشام (جلد ۲، صفحہ ۹۸)
۳۔ غایت المرام (صفحہ ٦٦۴) مسند احمد حنبل اور دوسری کتابوں سے ماخوذ۔

غفلت برتیں اور اس امر کو جو ایک طرف سے بالکل سادہ اور واضح تھا اور دوسری طرف سے بیحد اہم تھا، ناقابل توجہ سمجھیں اور فطری اور معمولی کاموں مثلاً کھانے پینے اور سونے کے متعلق تو سینکڑوں احکام دیں اور اہم مسئلہ پر سکوت اختیار کریں اور کسی کو اپنا جانشین مقرر نہ کریں۔

اگر بفرض محال ہم اس بات کو تسلیم بھی کرلیں (جسے شیعیت تسلیم نہیں کرتی) کہ شریعت نے اسلامی معاشرہ کا سربراہ مقرر کرنے کا اختیار خود مسلمانوں کو دیدیا تھا، تب بھی یہ لازم تھا کہ رسول اکرمؐ اس امر کی وضاحت فرماتے اور اس کے متعلق ضروری ہدایات دیتے تاکہ لوگ اس مسئلہ کے بارے میں پورے طور پر آگاہ ہوجاتے جس پر اسلامی معاشرہ کی زندگی اور ترقی اور شعائر دین کی بقاء کا دارومدار تھا۔ تاہم اس قسم کی کسی حدیث نبوی یا دینی حکم کا وجود نہیں ہے۔ اگر کوئی ایسی چیز ہوتی تو جن لوگوں نے آنحضرتؐ کی وفات کے بعد عنان اختیار سنبھالی، اس کی مخالفت نہ کرتے جبکہ صورت حال یہ ہے کہ پہلے خلیفہ نے وصیت کے ذریعہ خلافت دوسرے خلیفہ کو منتقل کردی اور دوسرے خلیفہ نے تیسرے خلیفہ کے انتخاب کے لئے ایک چھ رکنی مجلس شوریٰ مقرر کی جس کا طریق کار اور قواعد وضوابط اس نے خود متعین کیے۔ معاویہ نے امام حسنؑ کو صلح کرنے پر مجبور کیا اور یوں خلافت خود سنبھال لی۔ اس واقعہ کے بعد خلافت موروثی سلطنت میں تبدیل ہوگئی۔ رفتہ رفتہ صدر اسلام کے شعائر دین (مثلاً جہاد، امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور انسانی اعمال کی حدود) کمزور پڑ گئے بلکہ مسلمانوں کی سیاسی زندگی سے مفقود ہوگئے اور یوں پیغمبر اسلامؐ کی مساعی پر پانی پھر گیا۔

شیعیت نے انسان کی بنیادی فطرت اور غیر منقطع عاقلانہ سیرت کا مطالعہ کیا ہے جو بنی نوع انسان میں زندہ رہی ہے، اس نے اسلام کے بنیادی نظریات پر غور کیا ہے جن کا مقصد فطرت کا احیاء ہے۔ اس نے ان طریقوں کے بارے میں تحقیق کی ہے جو رسول اکرمؐ نے لوگوں کی ہدایت کے لئے استعمال کیے۔ اس نے ان مصائب کا مطالعہ بھی کیا ہے جو آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد اسلام اور مسلمانوں پر وارد ہوئے اور جن کی کڑیاں ہجرت کے بعد کی ابتدائی صدیوں کی اسلامی حکومتوں کی کوتاہی اور غفلت سے ملتی ہیں۔ اس تمام تحقیق کے بعد یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ امام اور جانشین رسولؐ کے تقرر کے بارے میں آنحضرتؐ کی کافی احادیث موجود ہیں۔ اس نتیجہ پر قرآنی آیات اور متواتر قطعی احادیث مثلاً آیت ولایت، حدیث غدیر، حدیث سفینہ، حدیث ثقلین، حدیث حق، حدیث منزلت، حدیث دعوت عشیرۃ الاقربین وغیرہ دلالت کرتی ہیں۔ تاہم اہل تسنن اور اہل تشیع نے ان

احادیث کو جن میں سے اکثر و بیشتر اہل سنت کے لئے بھی قابل قبول ہیں، یکساں معنی نہیں پہنائے ورنہ جانشینی کا مسئلہ پیدا ہی نہ ہوتا۔ جہاں اہل تشیع ان احادیث کو رسول اکرمؐ کی جانب سے جانشینی کے متعلق ایک واضح اشارہ سمجھتے ہیں وہاں اہل سنت ان کا مطلب کچھ اور لیتے ہیں اور جانشینی کا مسئلہ وہیں رہ جاتا ہے۔

حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کی خلافت کے اثبات کے لئے اہل تشیع مندرجہ ذیل آیت سمیت کئی ایک آیات قرآنی سے استفادہ کرتے ہیں۔

''تمہارا ولی الامر اور صاحب اختیار تو فقط اللہ اور اس کا رسولؐ اور وہ مومنینؑ ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکات دیتے ہیں۔''

سنی اور شیعہ محدثین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ آیت علیؑ ابن ابیطالبؑ کی شان میں نازل ہوئی تھی۔ اور بہت سی شیعہ اور سنّی روایات اس خیال کی تائید کرتی ہیں۔ ابو ذر غفاری نے کہا ہے:

''ایک دن ہم نے ظہر کی نماز رسول اکرمؐ کے ساتھ ادا کی۔ ایک سائل نے لوگوں سے سوال کیا لیکن کسی نے اسے کچھ نہ دیا۔ اس پر اس نے اپنے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیے اور کہا: یا اللہ! گواہ رہنا کہ نبی کی مسجد میں کسی نے مجھے کچھ نہیں دیا۔''

علیؑ ابن ابی طالبؑ اس وقت رکوع کی حالت میں تھے۔ انہوں نے سائل کو اپنی انگلی سے اشارہ کیا اور وہ آپ کی انگلی سے انگوٹھی اتار کر لے گیا۔ رسول اکرمؐ یہ واقعہ دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اپنا سر آسمان کی جانب بلند کیا اور کہا: '' اے پروردگار! میرے بھائی موسیٰؑ نے تجھ سے کہا تھا: اے پروردگار! میرا سینہ کشادہ کردے اور میرے کام آسان کر اور میری زبان میں روانی عطا فرما تا کہ لوگ میری باتیں سمجھ سکیں، اور میرے بھائی ہارونؑ کو میرا وزیر اور مددگار بنا پھر وحی نازل ہوئی کہ ہم نے تیرے بھائی کے ذریعہ تمہارے بازو مضبوط کردیے اور ہم تمھیں اختیار اور تسلط عطا کریں گے (سورہ قصص، آیت ۳۵) اے پروردگار! میں بھی تیرا پیغمبر ہوں۔ میرا سینہ کشادہ کر اور میرے کام آسان کردے اور علیؑ کو میرا وزیر اور مددگار بنا۔''

ابوذرؓ کہتے ہیں: '' ابھی رسول اکرمؐ کی بات مکمل نہ ہوئی تھی کہ (مذکورہ بالا) آیت نازل ہوئی'' [۱]

۱۔ طبری۔ '' ذخائر العقبیٰ'' (صفحہ ۱۶، مطبوعہ ۱۶) قاہرہ ۱۳۵۶ھ یہ حدیث معمولی تفاوت کے ساتھ '' الدرالمنثور'' (جلد ۲، صفحہ ۲۹۳) میں بھی نقل کی گئی ہے۔ اس آیت قرآن کے شان نزول کے بارے میں بحرانی نے غایت المرام میں سنی مدارک سے ۲۴، اور شیعہ مدارک سے ۱۹ احادیث نقل کی ہیں۔

ایک اور آیت جسے شیعہ حضرات علیؑ کی خلافت کا ثبوت خیال کرتے ہیں یہ ہے:

"آج کفار تمہارے دین کو کسی قسم کا نقصان پہنچانے سے مایوس ہوگئے ہیں۔ پس تم ان سے مت ڈرو بلکہ فقط مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کردی اور تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کیا۔" (سورہ مائدہ، آیت ۳)

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس دن سے پہلے کفار یہ امید رکھتے تھے کہ ایک دن اسلام کا خاتمہ ہوجائے گا لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک کام انجام دیکر ان کی یہ امید ہمیشہ کے لئے خاک میں ملادی۔ یہی واقعہ اسلام کی قوت اور تکمیل کا موجب بنا اور لازمی طور پر یہ واقعہ کسی عام دینی حکم کے اجراء کی مانند کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا بلکہ یہ اتنا اہم تھا کہ اس پر اسلام کی بقا کا دارومدار تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت ایک دوسری آیت سے مربوط ہے جو اسی سورہ کے آخر میں ہے۔ وہ آیت یہ ہے:

"اے رسولؐ! جو حکم تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے اور وہ لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو (سمجھ لو کہ) تم نے اس کا کوئی پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ تمہیں لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔" (سورہ مائدہ، آیت ٦٧)

اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم اور بے حد اہم کام رسول اکرمؐ کے سپرد کیا تھا اور اگر اسے انجام نہ دیا جاتا تو اسلام اور نبوت کی بنیاد خطرہ میں پڑ سکتی تھی۔ تاہم معاملہ اتنا اہم تھا کہ آنحضرت کو لوگوں کی مخالفت اور مداخلت کا خوف تھا اور اسی لیے آپ اس کام کی انجام دہی کو التوا میں ڈالے ہوئے تھے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کا فوری حکم نازل ہوا کہ اسے بلا تاخیر اور بلا خوف وخطر انجام دیا جائے۔ یہ معاملہ کسی ایک عام دینی حکم کے اجراء کا بھی نہیں تھا کیونکہ کسی ایک یا چند دینی احکام کی تبلیغ اتنی اہم نہیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک کی تبلیغ نہ کی جائے تو اسلام تباہ و برباد ہوجائے۔ علاوہ ازیں پیغمبرؐ اسلام دینی قوانین اور احکام کی تبلیغ کے بارے میں کبھی کسی سے خوفزدہ نہیں ہوئے۔

ان اشاروں اور شہادتوں سے اہل تشیع کی روایات کو تقویت ملتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ یہ آیات غدیر کے مقام پر نازل ہوئیں اور ان کا تعلق حضرت علیؑ کی ولایت سے ہے۔ علاوہ ازیں بہت سے شیعہ اور سنی مفسرین نے اس رائے کی تائید کی ہے۔

”غدیرخم میں رسول اکرمؐ نے لوگوں کو حضرت علیؑ کی طرف دعوت دی اور ان کا بازو پکڑ کر اتنا بلند کیا کہ بغلوں کی سفیدی نظر آنے لگی۔“ اور پھر یہ آیت نازل ہوئی:

” آج میں نے تمہارے دین کو کامل کردیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کردی اور تمہارے لیے دین اسلام پسند کیا۔“

پھر رسول اکرمؐ نے فرمایا:

اللہ اکبر کہ دین کامل ہوگیا ہے اور اللہ کی نعمت پوری ہوگئی ہے اور اس کی خوشنودی حاصل ہوگئی ہے اور ہمارے بعد علیؑ کی ولایت کی توثیق ہوگئی ہے۔

اس کے بعد آنحضرتؐ نے فرمایا:

”جس کا میں مولا ہوں اس کا علیؑ بھی مولا ہے۔ اے پروردگار! علیؑ کے دوستوں کو دوست رکھ اور اس کے دشمنوں کو دشمن۔ جو کوئی اس کی مدد کرے اس کی مدد کر اور جو کوئی اس کو چھوڑ دے تو بھی اسے چھوڑ دے۔“[۱]

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کے جن دشمنوں نے اسے تباہ و برباد کرنے کے لئے پورا زور لگادیا تھا جب ان کی اس مقصد کے حصول کی تمام امیدیں ختم ہوگئیں تو ان کے دلوں میں فقط ایک امید باقی رہ گئی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ اسلام کے سرپرست اور نگہبان رسول اکرمؐ ہیں اس لیے جب وہ رحلت فرمائیں گے تو اسلام کی حفاظت کرنے والا کوئی نہیں رہے گا اور یہ یقیناً معدوم ہوجائے گا، تاہم غدیرخم کے مقام پر ان کی یہ امید بھی غلط ثابت ہوئی تو آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کو لوگوں کے سامنے اسلام کے منتظم و پیشوا کے طور پر پیش کردیا۔ حضرت علیؑ کے بعد پیشوائی اور رہنمائی کی سنگین اور ضروری ذمہ داری ان کی اولاد کے کندھوں پر ڈالی جانی تھی۔[۲]

ذیل میں کچھ ایسی احادیث نقل کی جاتی ہیں جن کا تعلق غدیرخم، حضرت علیؑ کی ولایت اور اہل بیت رسولؐ کی اہمیت سے ہے۔

حدیث غدیر

حجۃ الوداع سے واپسی کے وقت رسول اکرمؐ نے غدیر کے مقام پر توقف فرمایا، مسلمانوں کو جمع کیا

۱۔ بحرانی نے غایت المرام (صفحہ ۳۳۶) میں سنی مدارک سے ۶ اور شیعہ مدارک سے ۱۵ احادیث اس آیت کی شان نزول کے بارے میں نقل کی ہیں۔

۲۔ مزید توضیح کے لئے علامہ طباطبائی کی تفسیر المیزان (جلد ۵ صفحات ۱۷۷ تا ۲۱۴، اور جلد ۶ صفحات ۵۰ تا ۶۴) مطبوعہ تہران ۱۳۷۷ھ ملاحظہ کریں۔

اور ایک خطبہ دینے کے بعد حضرت علیؑ کی مسلمانوں کے رہنما اور پیشوا کی حیثیت سے نامزدگی کا اعلان فرمایا:

براء کہتے ہیں

میں حجۃ الوداع کے سفر میں رسول اکرمؐ کے ہمراہ تھا۔ جب ہم غدیر خم پہنچے تو آنحضرتؐ نے حکم دیا کہ اس جگہ کو صاف کیا جائے۔ پھر آپؐ نے حضرت علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اپنے دائیں جانب کھڑا کیا اور فرمایا: '' کیا میں تم لوگوں پر اختیار رکھتا ہوں ؟''

لوگوں نے جواب دیا

'' آپ کو ہم پر اختیار حاصل ہے۔''

پھر آپؐ نے فرمایا:

'' جس کا میں مولا ہوں ، اس کا علیؑ بھی مولا ہے۔ اے پروردگار! علیؑ کے دوستوں کو دوست اور اس کے دشمنوں کو دشمن رکھ۔''

عمر بن خطاب نے علیؑ سے کہا: آپ کو یہ منصب مبارک ہو کیونکہ آپ میرے اور سب مومنینؑ کے مولا ہوگئے ہیں۔''[۱]

حدیث سفینہ

ابن عباس کہتے ہیں: رسول اکرمؐ نے فرمایا:

''میرے اہل بیتؑ کی مثال کشتیٔ نوحؑ کی سی ہے۔ جو کوئی اس کشتی میں سوار ہوجائے گا بچ جائے گا اور جو کوئی اس سے منہ موڑے گا غرق ہوجائے گا۔''[۲]

۱۔ البدایہ والنہایہ (جلد ۵،صفحہ ۲۰۸ اور جلد ۷،صفحہ ۳۴۶) ذخائر العقبیٰ (صفحہ ۶۷) ''الفصول المہمہ '' (ابن صباغ (جلد ۲،صفحہ ۲۳) مطبوعہ نجف ۱۹۵۰ء خصائص نسائی (صفحہ ۳۱) مطبوعہ نجف ۱۳۶۹ھ

بحرانی نے ''غایت المرام'' (صفحہ ۷۹) میں اس حدیث کے لئے اہل سنت سے راویوں کے ۸۹ سلسلہ میں اور اہل تشیع سے ۴۳ سلسلہ نقل کئے ہیں۔

۲۔ ذخائر العقبیٰ (صفحہ ۲۰) الصواعق المحرقہ'' ابن حجر (صفحات ۱۵۰ تا ۱۸۴) مطبوعہ قاہرہ ۱۳۱۲ھ۔'' تاریخ الخلفاء'' جلال الدین سیوطی (صفحہ ۳۰۷) مطبوعہ قاہرہ ۱۹۵۲ء ''نور الابصار'' شبلنجی (صفحہ ۱۱۴) مطبوعہ قاہرہ ۱۳۱۲ھ۔'' غایت المرام'' (صفحہ ۲۳۷) میں بحرانی نے اس حدیث کے لئے اہل سنت راویوں کے گیارہ اور اہل تشیع کے سات سلسلہ نقل کیے ہیں۔

حدیث ثقلین

زید بن ارقم نے بیان کیا ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا:

''یوں معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے پاس آنے کی دعوت دی ہے اور میرے لیے ضروری ہے کہ اس دعوت کو قبول کرلوں لیکن میں تمہارے درمیان دو بہت بڑی اور قیمتی چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں۔ ان میں سے ایک اللہ کی کتاب ہے اور دوسری میرے اہلبیت ہیں۔ اس بات کا خیال رکھو کہ تم ان کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہو۔ یہ دونوں چیزیں ہرگز ایک دوسرے جدا نہ ہوں گی حتیٰ کہ (جنت میں) کوثر پر میرے پاس آ پہنچیں۔''[۱]

حدیث ثقلین مسلّم اور قطعی حدیثوں میں سے ہے جو بہت سی سندوں اور مختلف عبارتوں کے ساتھ روایت کی گئی ہے اور سنی اور شیعہ اس کی صحت کے بارے میں متفق ہیں۔ اس حدیث سے اور اس جیسی دوسری حدیثوں سے کئی اور باتوں کا پتہ چلتا ہے۔

۱۔ جیسا کہ قرآن مجید قیامت کے دن تک باقی رہے گا اسی طرح عترت رسولؐ بھی قیامت تک باقی رہے گی، یعنی کوئی زمانہ بھی حقیقی پیشوا سے خالی نہیں رہے گا جسے شیعہ ''امام'' کہتے ہیں۔

۲۔ رسول اکرمؐ نے ان دو عظیم امانتوں کے ذریعہ مسلمانوں کی تمام علمی اور دینی ضروریات پوری کردی ہیں۔ آپؐ نے اپنے اہل بیتؑ کا تعارف مرجع علمی کی حیثیت سے کرایا ہے اور ان کے اقوال اور اعمال کے معتبر ہونے کی توثیق کردی ہے۔

۳۔ قرآن مجید اور اہل بیتؑ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتے اور کسی مسلمان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اہل بیت رسولؐ کے علوم کو رد کردے اور ان کے احکام اور ہدایات سے روگردانی کرے۔

۴۔ اگر لوگ اہلبیتؑ کی اطاعت کریں اور ان کی ہدایت کی پیروی کریں تو وہ کبھی گمراہ نہیں ہوں گے اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ ان کے ساتھ ہوگا۔

۵۔ لوگوں کی تمام ذہنی اور دینی ضروریات کا جواب اہلبیتؑ کے پاس موجود ہے جو کوئی ان کی پیروی کرے وہ گمراہی میں نہیں پڑسکتا اور حقیقی خوش بختی سے ہمکنار ہوتا ہے یعنی اہلبیتؑ ہر قسم کی غلطی اور خطا سے پاک اور معصوم ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ''اہلبیتؑ'' اور ''عترت'' سے مراد

۱۔ ''البدایہ والنہایہ'' (جلد ۵، صفحہ ۲۰۹) ''ذخائر العقبیٰ'' (صفحہ ۱۶) الفصول المہمہ'' (صفحہ ۲۲) ''خصائص'' (صفحہ ۳۰) ''الصواعق المحرقہ'' (صفحہ ۱۴۷) ''غایت المرام'' یہ حدیث سنی مدارک سے ۳۹ طرق اور شیعہ مدارک سے ۸۲ طرق سے نقل کی گئی ہے۔

آنحضرتؐ کی تمام اولاد اور اقربا نہیں ہیں بلکہ کچھ مخصوص افراد ہیں جو علوم دین پر کامل دسترس رکھتے ہیں اور ہر قسم کی غلطی اور گناہ سے پاک ہیں تاکہ وہ لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی کرسکیں۔ یہ اولاد رسول یکے بعد دیگرے منصب امامت پر فائز ہوئے۔ اس نقطۂ نگاہ کی تائید روایات سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً ابن عباس نے کہا ہے:

''میں نے رسول اللہؐ سے پوچھا: آپؐ کے وہ اقربا کون ہیں جن سے محبت رکھنا واجب ہے؟''

آپؐ نے فرمایا:

''علیؑ''، فاطمہؑ'' حسنؑ اور حسینؑ [۱]

جابر نے روایت کی ہے، رسول اکرمؐ نے فرمایا:

'' اللہ نے ہر نبی کی ذریت کو اس کی صلب میں قرار دیا ہے لیکن اس نے میری ذریت کو علیؑ کی صلب میں قرار دیا ہے۔'' [۲]

حدیث حق

امّ المومنین امّ سلمہ (س) بیان کرتی ہیں:

'' میں نے رسول اللہؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ علیؑ حق اور قرآن کے ساتھ ہے اور حق اور قرآن بھی علیؑ کے ساتھ ہیں اور وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے حتیٰ کہ میرے پاس کوثر پر پہنچیں۔'' [۳]

حدیث منزلت

سعد بن ابی وقاص نے کہا ہے: رسول اللہؐ نے علیؑ سے فرمایا:

''کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہو جو ہارونؑ کو موسیٰ سے تھی بجز اس کے میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔'' [۴]

۱۔ ''ینابیع المودۃ'' سلیمان ابن ابراہیم قندوزی (صفحہ ۳۱۱) مطبوعہ تہران ۱۳۰۸ھ ۲۔ ''ینابیع المودۃ'' (صفحہ ۳۱۸)

۳۔ غایت المرام'' (صفحہ ۳۵۹) جس میں اس حدیث کا ماحصل سنی مدارک سے ۱۵ طرق اور شیعہ مدارک سے ۱۱ طرق سے نقل کیا گیا ہے۔

۴۔'' البدایہ والنہایہ'' (جلد ۷، صفحہ ۳۳۹)'' ذخائر العقبیٰ'' (صفحہ ۶۳)''العقول المہمہ'' (صفحہ ۱۲)''کفایت الطالب'' کنجی شافعی'' (صفحات ۱۴۸ تا ۱۵۴) مطبوعہ نجف ۱۳۵۶ھ''خصائص'' (صفحات ۱۹ تا ۲۵)'' صواعق المحرقہ'' (صفحہ ۱۷۷)''غایت المرام'' (صفحہ ۱۰۹ میں یہ حدیث سنی مدارک سے ۱۰۰ طریقوں سے اور شیعہ مدارک سے ۷۰ طریقوں سے نقل کی گئی ہے۔

حدیث دعوت ذوالعشیرہ

رسول اکرمؐ نے اپنے اعزا واقربا کو کھانے کی دعوت دی اور جب سب لوگ کھانا کھا چکے تو ان سے فرمایا:

''مجھے کسی ایسے شخص کا علم نہیں جو اپنی قوم کے لئے اس سے بہتر چیز لایا ہو جو میں تمہارے لیے لایا ہوں۔ اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تمہیں اس کی طرف بلاؤں۔ تم میں ایسا کون ہے جو اس معاملہ میں میری مدد کرے اور تمہارے درمیان میرا بھائی، وصی اور خلیفہ ہو۔''

سب خاموش رہے لیکن حضرت علیؑ نے، جو عمر میں سب سے چھوٹے تھے، عرض کیا: ''میں آپ کا وزیر اور مددگار بنوں گا۔''

پھر رسول اکرمؐ نے اپنا ہاتھ ان کی گردن پر رکھا اور باقی لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

''یہ میرا بھائی، وصی اور خلیفہ ہے تمہیں چاہئے کہ اس کی اطاعت کرو۔''

اب وہ لوگ رخصت ہونے لگے۔ وہ ہنس رہے تھے اور ابو طالب سے کہہ رہے تھے:

''محمدؐ نے تمہیں حکم دیا ہے کہ اپنے بیٹے کی اطاعت کرو۔''[۱]

حذیفہ نے کہا ہے: رسول اکرمؐ نے فرمایا:

''اگر تم علیؑ کو میرا خلیفہ اور جانشین بنالو، اور میرا خیال ہے کہ تم ایسا نہیں کرو گے، تو تم ایک با بصیرت رہنما پاؤ گے جو تمہیں سیدھے راستہ کی جانب چلائے گا۔''[۲]

ابن مردویہ نے کہا ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا:

''جو شخص میری جیسی زندگی اور موت چاہے اور بہشت میں داخل ہونے کی خواہش کرے اسے چاہئے کہ میرے بعد علیؑ سے محبت کرے اور میرے اہلبیتؑ کی پیروی کرے کیونکہ وہ میری عترت ہیں اور میری طینت سے پیدا کیے گئے ہیں اور میرا علم اور فہم انہیں عطا کیا گیا ہے۔ پس وائے ہے ان لوگوں کے حال پر جو ان کی فضیلت سے انکار کریں۔ ایسے لوگوں کو (قیامت کے دن) میری شفاعت ہرگز نصیب نہ ہوگی۔''[۳]

۱۔ ''تاریخ ابی الفداء'' (جلد ۱، صفحہ ۱۱۶) ۲۔ ''حلیۃ الاولیاء'' ابونعیم اصفہانی (جلد ۱، صفحہ ۶۴) مطبوعہ قاہرہ ۱۳۵۱ھ اور ''کفایت الطالب'' (صفحہ ۶۷)

۳۔ منتخب کنز العمال مسند احمد کے حاشیے پر (جلد ۵، صفحہ ۹۴) مطبوعہ قاہرہ ۱۳۶۸۔

سابقہ بیان کی تائید میں

رسول اکرمؐ کی جانشینی کے بارے میں اہل تشیع کی دلیل زیادہ تر اس اعتقاد پر مبنی ہے کہ اپنی بیماری کے آخری ایام میں جب کچھ صحابہ بھی موجود تھے، آنحضرتؐ نے فرمایا کہ کاغذ اور دوات لائی جائے[۱] تاکہ میں ایک ایسی چیز لکھوادوں جس کی پیروی کرنے پر لوگ گمراہ نہ ہوں ۔ جو لوگ موجود تھے ان میں سے بعض نے یہ خیال ظاہر کیا کہ آپ اس قدر علیل ہیں کہ کوئی چیز لکھوانے کے قابل نہیں، چنانچہ انہوں نے کہا: ''ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے۔'' اس معاملہ پر اس قدر شوروغل مچا کہ آنحضرتؐ نے سب کو چلے جانے کا حکم دیا کیونکہ ایک نبیؐ کی موجودگی میں شوروغل برپا کرنا جائز نہیں۔

جانشینی کے متعلق احادیث کے بارے میں جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اور جو واقعات رسول اکرمؐ کی رحلت کے بعد رونما ہوئے، ان کی بنا پر اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے آنحضرتؐ کے جانشین کے بارے میں حضرت علیؑ سے کوئی مشورہ نہیں لیا گیا۔ شیعہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ آنحضرتؐ اپنے جانشین کے متعلق اپنی قطعی رائے کا اظہار کرنا چاہتے تھے لیکن آپؐ ایسا نہ کر سکے۔

چند حاضرین نے جو کلمات کہے ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انکا مقصد الجھن پیدا کرنا تھا تاکہ آنحضرتؐ اپنے حتمی فیصلہ کا اعلان نہ کرسکیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ کے کلام کو قطع کرنے کا مقصد وہ نہیں تھا جو بظاہر نظر آتا ہے یعنی یہ کہ مبادا بیماری کی شدت کیوجہ سے آپؐ کوئی مہمل الفاظ کہہ دیں کیونکہ پہلی بات تو یہ ہے کہ رعلالت کے دوران آپ کو کوئی مہمل اور بے معنی الفاظ ادا کرتے نہیں سنا گیا اور ان سے متعلق کوئی ایسی چیز روایت بھی نہیں کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اسلام کے اصولوں کے مطابق نبی معصوم ہوتا ہے اور اس پر ہذیانی کیفیت ہرگز طاری نہیں ہوتی۔

دوم یہ کہ بعض حاضرین نے اس موقع پر رسول اکرمؐ کے سامنے جو کچھ کہا اگر وہ اس کے متعلق سنجیدہ تھے تو پھر دوسرا جملہ (یعنی ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے) کہنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ممکن ہے آنحضرتؐ کوئی مہمل چیز کہیں ان کی بیماری کی دلیل دی جانی چاہئے تھی۔ نہ یہ کہ قرآن مجید کے ہوتے ہوئے ارشادات رسولؐ کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ کسی مسلمان

۱۔ البدایہ والنہایہ (جلد ۵، صفحہ ۲۲۷) الکامل (جلد ۲، صفحہ ۲۱۷) تاریخ طبری (جلد ۲، صفحہ ۴۳۶) شرح نہج البلاغہ۔ ابن ابی الحدید (جلد ۱، صفحہ ۱۳۳)

سے یہ بات مخفی نہیں ہوسکتی تھی کہ خود قرآن مجید نبیؐ کو واجب الاطاعت قرار دیتا ہے اور ایک لحاظ سے اس کے کلام کو اللہ کا کلام گردانتا ہے۔ قرآن مجید کے مطابق مسلمانوں کیلئے ضروری ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ دونوں کے احکامات کی اطاعت کریں۔

سوم یہ کہ ایسی ہی بیماری کی صورت پہلے خلیفہ کی زندگی کے آخری دنوں میں بھی پیدا ہوگئی تھی اور انہوں نے اپنی آخری وصیت میں دوسرے خلیفہ کو اپنا جانشین نامزد کردیا تھا۔ جب خلیفہ کے مطابق عثمان ان کی وصیت لکھ رہے تھے تو خلیفہ کو غش آ گیا تاہم 'حدیث قلم وقرطاس' کے مطابق جو الفاظ دوسرے خلیفہ نے رسول اکرمؐ کے متعلق کہے تھے، اس موقع پر نہیں دہرائے۔[۱]

اس امر کی تصدیق ابن عباس کی روایت کردہ ایک حدیث میں کی گئی ہے۔[۲] اور دوسرے خلیفہ کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ انہوں نے کہا:

"علیؑ خلافت کے مستحق تھے لیکن قریش ان کی خلافت کو برداشت نہ کرتے کیونکہ اگر وہ خلیفہ بن جاتے تو لوگوں کو دین حق اور راہ راست پر چلاتے۔ ان کے خلیفہ ہوتے ہوئے وہ (قریش) عدل وانصاف کی حدود کو نہ پھلانگ سکتے اور ان کے خلاف جنگ پر کمربستہ ہوجاتے۔[۳]

بلاشبہ دینی اصولوں کے مطابق یہ ضروری ہے کہ جو شخص حق سے ہٹ گیا ہو اسے حق کی پیروی کرنے پر مجبور کیا جائے۔ یہ نہیں ہونا چاہئے کہ جو شخص حق کے خلاف چلے اس کی خاطر حق کو ترک کردیا جائے۔ جب پہلے خلیفہ کو اطلاع دی گئی۔[۴] کہ مسلمان قبیلوں نے زکات دینے سے انکار کردیا ہے تو انہوں نے جنگ کا حکم دے دیا اور کہا" اگر وہ لوگ مجھے وہ محصول ادا نہیں کریں گے جو رسول اللہؐ کو ادا کرتے تھے تو میں ان کے خلاف جنگ کروں گا۔" ظاہر ہے کہ یہ کہنے سے ان کا یہ مطلب تھا کہ حق وانصاف کا احیاء ہر قیمت پر ضروری ہے۔ بلاشبہ خلافت حقہ کا مسئلہ محصول سے زیادہ اہم تھا اور شیعہ یہ خیال کرتے ہیں کہ جس اصول کا اطلاق پہلے خلیفہ نے محصول کے معاملہ پر کیا تھا اسی کا اطلاق ساری امت کو رسول اکرمؐ کی جانشینی کے مسئلہ پر کرنا چاہئے تھا۔

امامت اور معارف الٰہیہ کے بارے میں اس کا کردار

معرفت نبی کی بحث کے سلسلہ میں یہ کہا گیا تھا کہ عام ہدایت کے ناقابل تغیر اور ضروری قانون کے

۱۔ الکامل (جلد ۲، صفحہ ۲۹۲) اور شرح نہج البلاغہ۔ ابن ابی الحدید (جلد ۱، صفحہ ۵۴) ۲۔ شرح نہج البلاغہ۔ ابن ابی الحدید (جلد ۱، صفحہ ۳۴)
۳۔ تاریخ یعقوبی (جلد ۲، صفحہ ۱۳۷) ۴۔ البدایہ والنہایہ (جلد ۶، ۳۱۱)

مطابق جو انواع پیدا کی گئی ہیں ان میں سے ہر ایک کی رہنمائی تکوین اور تخلیق کے راستہ سے اس کی اپنی نوع کے کمال اور خوش بختی کی جانب کی جاتی ہے ۔نوع انسانی بھی اس عام قانون سے مستثنیٰ نہیں ہے اور ضروری ہے کہ واقع بینی اور معاشرتی انداز فکر کی جبلت کے ذریعہ اس کی اس طرح رہنمائی کی جائے کہ وہ اس دنیا میں بھی خوش بختی سے ہمکنار ہوسکے۔ دوسرے الفاظ میں یہ ضروری ہے کہ انسانی خوش بختی اور کمال حاصل کرنے کے لیے انسان کچھ اعتقادات اور ذمہ داریاں اور اپنی زندگی کے طور اور طریقہ ان کے مطابق بنائے ۔ یہ بھی کہا گیا تھا کہ زندگی کے اس لائحہ عمل کو جسے 'دین' کہا جاتا ہے عقل کے ذریعہ نہیں بلکہ وحی اور نبوت کے ذریعہ سمجھا جاسکتا ہے جو جہان بشریت کے کچھ ایسے پاک بندوں کے لئے مخصوص ہیں جنہیں انبیاء یا اللہ کے پیغمبر کہا جاتا ہے ۔ یہ پیغمبر ہی ہیں جو وحی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے بہ حیثیت انسان ، انسان کی ذمہ داریوں کا علم حاصل کرتے ہیں اور انھیں انسانوں تک پہنچاتے ہیں تا کہ وہ ان ذمہ داریوں کو پورا کر کے خوش بختی سے ہمکنار ہوسکیں۔

ظاہر ہے کہ جس طرح یہ دلیل خوش بختی اور کمال کے حصول کی جانب انسان کی رہنمائی کے لئے علم کی ضرورت کو ثابت کرتی ہے، اسی طرح یہ ان افراد کی ضرورت کو بھی ثابت کرتی ہے جو اس لائحہ عمل کی اس کی اصلی شکل میں حفاظت کرسکیں اور حسب ضرورت اسے لوگوں تک پہنچا سکیں۔ جس طرح اللہ کے لطف وعنایت کی رو سے یہ ضروری ہے کہ کچھ ایسے اشخاص پیدا ہوں جو انسان کی ذمہ داریوں کا علم بذریعہ وحی حاصل کریں اور لوگوں کو اس کی تعلیم دیں۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ یہ ذمہ داریاں ہمیشہ کے لئے دنیا میں محفوظ رہیں اور جب کبھی ضرورت ہو بنی نوع انسان کے سامنے پیش کی جائیں اور ان کی تعلیم دی جائے۔ دوسرے لفظوں میں ایسے افراد ہمیشہ موجود ہوں جو اللہ کے دین کی حفاظت کریں اور بوقت ضرورت اسے بیان کریں۔

جس طرح وحی اور نبوت کی روح کا حامل شخص جو اللہ تعالیٰ سے احکام اور قوانین حاصل کرتا ہے نبی کہلاتا ہے، اسی طرح پیغام خداوندی بذریعہ وحی نازل ہوجانے کے بعد جس شخص کے ذمہ اس کی حفاظت اور نگہداشت ہوتی ہے اور جسے اللہ تعالیٰ اس مقصد کے لئے منتخب فرماتا ہے وہ امام کہلاتا ہے۔ ممکن ہے کہ نبوت اور امامت ایک شخص میں جمع ہوجائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ الگ الگ ہوں۔[۱]

۱۔ یہاں امامت کا ذکر ائمہ اہل تشیع کے بارے میں مخصوص تصور کے مطابق ہے اور اہل سنت کی عام روش کے مطابق نہیں جو اکثر وبیشتر 'امام' کا لفظ خلیفہ کے لئے استعمال کرتے ہیں ۔ (ناشر)

نیز جو دلیل پیغمبرؐ کی عصمت کو ثابت کرنے کے لئے دی گئی ہے وہ اماموں کی عصمت کو بھی ثابت کرتی ہے کیونکہ یہ ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حقیقی دین کو صحیح وسالم اور ایسی حالت میں رکھے کہ لوگوں میں ہمیشہ اس کی تبلیغ ہوسکے اور یہ مقصد خطا کے مقابلہ میں خداوندی حفاظت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا۔

نبی اور امام کے درمیان فرق

انبیاء کے خداوندی احکام اور قوانین کے حصول کے بارے میں جو دلیل دی گئی ہے وہ فقط وحی آسمانی احکام کے حصول کے اصول کو ثابت کرتی ہے کہ یہ احکام مسلسل اور ہمیشہ نازل ہوتے رہیں گے۔ اس کے برعکس امام چونکہ دین خدا وندی کا محافظ ہے اس لئے انسانی معاشرہ کو اس کی مسلسل ضرورت رہتی ہے، خواہ لوگ اسے پہچانیں یا نہ پہچانیں۔ انسانی معاشرہ اس ہستی سے خالی نہیں رہ سکتا جسے شیعہ امام کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں فرماتا ہے:

"اگر یہ لوگ ہماری ہدایت پر ایمان نہیں رکھتے تو ہم نے ہدایت کو ایسے لوگوں (یعنی اماموں) کے سپرد کردیا ہے جو اس میں ہرگز تخلف نہیں کرتے۔" (سورہ انعام، آیت ۹۰)

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے بعض اوقات نبوت اور امامت کے منصب ایک ہی شخص میں جمع ہوجاتے ہیں اور قانون خداوندی کا حصول اور اس کی نگہداشت اس کے سپرد کردی جاتی ہے اور بعض اوقات انہیں ایک دوسرے سے الگ کردیا جاتا ہے۔ مثلاً بعض ادوار میں کوئی نبی نہیں ہوتا لیکن امام برحق ہر دور میں موجود ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ انبیاء کی تعداد محدود ہے اور ہر دور میں نبی موجود نہیں رہے۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بعض انبیاء کا تعارف بطور امام کرایا ہے مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق فرمایا ہے:

"جب ابراہیمؑ کو ان کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا اور انہوں نے وہ پوری کردیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں تمہیں لوگوں کا پیشوا اور امام بنانے والا ہوں۔"

(حضرت ابراہیمؑ نے) عرض کیا: "اور میری اولاد میں سے؟" فرمایا: "(ہاں مگر) میرے اس عہدہ پر ظالموں میں سے کوئی شخص فائز نہیں ہوسکتا۔" (سورہ بقرہ، آیت ۱۲۴)

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ: ''اور ہم نے ان کو سب (لوگوں کا) امام (پیشوا) بنایا جو کہ ہمارے حکم سے ان کی ہدایت کرتے تھے۔'' (سورہ انبیاء، آیت ۷۳)

امامت اور دین کے باطنی اعمال

جس طرح امام لوگوں کے ظاہری اعمال کے بارے میں ان کا رہنما اور پیشوا ہوتا ہے، اسی طرح وہ ان کی اندرونی اور باطنی پیشوائی اور رہنمائی بھی کرتا ہے۔ وہ انسانیت کے اس قافلہ کا سالار ہے جو باطن کی راہ سے اللہ کی جانب حرکت کررہا ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل دو تمہیدی وضاحتوں پر توجہ دینی چاہیئے:

اول: اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام اور دوسرے آسمانی مذاہب کی نظر میں انسان کی حقیقی اور ابدی نیک بختی یا بدبختی کا موجب اس کے اچھے اور برے اعمال ہیں جن کے بارے میں وہ اپنی خداداد فطرت کے ذریعہ بھی فیصلہ کرسکتا ہے۔ وحی اور نبوت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے خود ہم انسانوں کی زبان میں اور ہمارے معاشرہ کی مناسبت سے انسانی اعمال کی اچھائی یا برائی بیان کی ہے۔ اس نے ان لوگوں سے جو اچھے کام کرتے ہیں ایک ابدی خوش بختانہ زندگی کا وعدہ کیا ہے جس میں وہ تمام خواہشات پوری ہوں گی جو انسانی کمال سے مطابقت رکھتی ہوں۔ جہاں تک بدکاروں اور ظالموں کا تعلق ہے انہیں ایک ایسی تلخ جاودانی زندگی کی خبر دی گئی ہے جس میں انہیں ہر قسم کی بدبختی اور ناکامی سے دوچار ہونا پڑے گا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کردگار عالم جو ہر لحاظ سے ہمارے تصور سے بالاتر ہے ہماری طرح ایک ایسا انداز فکر نہیں رکھتا جو ایک مخصوص سماجی ڈھانچہ میں ڈھلا ہوا ہو۔ خادم اور مخدوم، حاکم اور محکوم، امر اور نہی اور جزا و سزا کے رشتے ہماری معاشرتی زندگی کے باہر کوئی وجود نہیں رکھتے۔

خدائی نظام تخلیق ہے جس میں ہر چیز کی ہستی اور پیدائش حقیقی روابط کے مطابق اللہ کی خلاقیت سے تعلق رکھتی ہے اور بس۔ علاوہ ازیں جیسا کہ قرآن[۱] اور احادیث نبوی میں اشارہ کیا گیا ہے دین ایسے حقائق اور معارف پر مشتمل ہے جو عام انسانی فہم سے بالاتر ہیں اور جنہیں اللہ تعالیٰ نے ہماری عقل کی سطح کے مطابق اور ایک ایسی زبان میں جسے ہم سمجھ سکیں ہمارے لیے نازل فرمایا ہے۔

۱۔ مثلاً: ''کتاب مبین کی قسم ہم نے اس کتاب کو عربی زبان میں نازل کیا تا کہ تم سمجھو۔ بے شک یہ (قرآن) ام الکتاب میں (بھی جو) ہمارے پاس ہے، محفوظ ہے جو بڑے رتبہ کی اور حکمت سے پُر ہے۔'' (سورہ زخرف، آیت ۲ تا ۴)

اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اچھے اور برے اعمال اور انسان کی آئندہ جاودانی زندگی کے مابین ایک حقیقی رشتہ ہے۔ ایک ایسا رشتہ جو اللہ کی مرضی کے مطابق آئندہ کی خوشگوار زندگی متعین کرتا ہے یا زیادہ سادہ الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر اچھا یا برا فعل انسان کی روح پر ایک حقیقی اثر ڈالتا ہے جس سے اس کی آئندہ زندگی کی نوعیت متعین ہوتی ہے۔ انسان سمجھے یا نہ سمجھے اس کی کیفیت ایک ایسے بچہ کی سی ہوتی ہے جسے تربیت دی جارہی ہو۔ بچہ استاد کی ہدایت سے بجز اس کے اور کچھ نہیں سمجھتا کہ یہ کام کرو یا یہ کام نہ کرو اور جو کام وہ کرتا ہے ان کی حقیقت سے ناآشنا ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ بڑا ہوجاتا ہے تو ان اچھی ذہنی اور روحانی صلاحیتوں کی وجہ سے جو وہ تربیت کے دنوں میں اپنے اندر پیدا کرلیتا ہے وہ ایک خوشگوار معاشرتی زندگی گزارنے کے قابل ہوجاتا ہے تاہم اگر وہ استاد کی ہدایات پر عمل کرنے سے انکارکردے تو سوائے بدبختی کے اسے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ یا انسان ایک ایسے مریض کی مانند ہوتا ہے جو ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق دوائیں اور خوراک استعمال کرتا ہے اور مخصوص ورزش کرتا ہے اور ڈاکٹر کا حکم ماننے کے علاوہ اسے کسی چیز سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ چنانچہ احکام کی اس بجا آوری کے نتیجہ میں اس کے بدن میں ایک توازن پیدا ہوجاتا ہے جو صحت کی بحالی اور ہر قسم کی خوشی اور جسمانی لطف اٹھانے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس ظاہری زندگی کے اندر انسان ایک باطنی یا روحانی زندگی بھی رکھتا ہے جس کا تعلق اس کے اعمال سے ہوتا ہے اور جو ان اعمال کے مطابق نشوونما پاتی ہے اور یہ کہ آخرت میں اس کی خوش بختی اور بدبختی کا انحصار مکمل طور پر اس باطنی زندگی پر ہوتا ہے۔

قرآن مجید بھی اس نظریہ کی تائید کرتا ہے[۱] اور بہت سی آیات کے مطابق اس امر کا قائل ہے کہ ایماندار اور نیکوکار لوگوں کو ایک اور زندگی اور ایک اور روح میسر ہوگی اور وہ زندگی موجودہ زندگی

۱۔ مثلاً یہ آیات: ''ہر شخص (ہمارے سامنے) اس طرح حاضر ہوگا کہ اس کے ساتھ ایک (فرشتہ) ہنکانے والا اور ایک (اعمال کا) گواہ ہوگا (اس سے کہا جائے گا) کہ اس (دن) سے تو غفلت میں مبتلا تھا۔ اب ہم نے تیرے سامنے سے پردے ہٹادیے تو آج بڑی تیز ہے۔'' (سورہ ق، آیات ۲۱۔ ۲۲) ''مرد ہو یا عورت، جو شخص نیک کام کرے گا اور ایماندار بھی ہوگا ہم اسے (دنیا میں بھی) پاک وپاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور (آخرت میں بھی) جو کچھ وہ کرتا تھا اس کا اچھے سے اچھا اجر دیں گے۔'' (سورہ نحل، آیت ۹۷) اے ایمان والو! جب ہمارا رسولؐ تمہیں ایسے کام کے لئے بلائے جو تمہاری روحانی زندگی کا باعث ہوتو تم اللہ اور رسولؐ کا حکم دل سے قبول کرلو۔'' (سورہ انفال، آیت ۲۴) ''(اس دن کو یاد رکھو) جس دن ہر شخص کہ جس نے دنیا میں کوئی نیکی کی ہے اور جو برائی کی ہے اسے موجود پائے گا۔'' (سورہ آل عمران، آیت ۳۰) ''ہم ہی یقیناً مردوں کو زندہ کرتے ہیں اور جو کچھ لوگ پہلے کرچکے ہیں (اسے) اور ان کی (اچھی یا بری باقیماندہ) نشانیوں کو لکھتے جاتے ہیں۔'' (سورہ یٰسین، آیت ۱۲)

سے بہتر اور وہ روح موجودہ روح سے زیادہ درخشاں ہوگی۔ وہ یہ بات بھی وثوق سے کہتا ہے کہ انسان کے اعمال اسکی روح پر باطنی اثرات ڈالتے ہیں جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتے ہیں۔ احادیث نبوی میں بھی متعدد مرتبہ اس نکتہ کی جانب اشارہ کیا گیا ہے مثلاً حدیث معراج میں اللہ تعالیٰ رسول اکرمؐ سے فرماتا ہے:

''جو شخص میری مرضی کے مطابق عمل کرنا چاہے اس میں تین خصوصیتیں ہونی چاہئیں۔ اسے ایسی شکر گزاری کا اظہار کرنا چاہیئے، جس میں جہالت کی آلائش نہ ہو اور ایک ایسی یاد کا جس پر فراموشی کی گرد و نہ جمے اور ایک ایسی محبت کا جس میں وہ مخلوق کی محبت کو میری محبت پر ترجیح نہ دے۔ اگر وہ مجھ سے محبت کرے گا تو میں بھی اس سے محبت کروں گا۔ میں اس کے دل کی آنکھ اپنے جلال کے نظارہ سے کھول دوں گا اور اپنی مخلوق کی صفات اس سے پوشیدہ نہیں رکھوں گا۔ میں اسے رات کے اندھیرے اور دن کی روشنی میں اپنا رازداں بناؤں گا۔ میں اسے فرشتوں کے الفاظ سناؤں گا۔ میں نے جو راز اپنی مخلوق سے پوشیدہ رکھا ہے وہ اس پر ظاہر کردوں گا۔ میں اسے حیاء کی خلعت پہناؤں گا حتیٰ کہ مخلوق اس سے شرمانے لگے گی۔ وہ زمین پر اس حالت میں چلے گا کہ اسے معاف کردیا گیا ہوگا۔ میں اس کے دل کو احساس اور بصیرت بخشوں گا اور اس سے بہشت اور دوزخ کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں رکھوں گا۔ میں اسے اس خوف اور مصیبت سے مطلع کروں گا جس سے لوگ قیامت کے دن دوچار ہوں گے۔''[1]

ابوعبداللہ علیہ السلام نے روایت کی ہے کہ رسول اکرمؐ نے حارث ابن مالک ابن نعمان کو شرف ملاقات بخشا اور اس سے دریافت کیا:

''اے حارث ! تمہارا کیا حال ہے؟''

اس نے جواب دیا:

''یا رسول اللہؐ میں ایک سچے مومن کی طرح زندگی گزار رہا ہوں۔''

آنحضرتؐ نے فرمایا:

''ہر چیز کی اپنی اصلیت ہوتی ہے۔ جو کچھ تم نے کہا ہے اس کی اصلیت کیا ہے؟''

۱۔ بحارالانوار (جلد ۷، صفحہ ۹)

اس نے جواب دیا:

”یا رسول اللہ! میں نے دنیا سے منہ موڑ لیا ہے۔ میری راتیں جاگتے ہوئے اور میرے دن پیاس کی حالت میں گزرتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا میں اپنے پروردگار کے عرش پر نظریں جمائے ہوئے ہوں اور حساب وکتاب طے ہوگیا اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا میں بہشت کے لوگوں کو دیکھ رہا ہوں جو ایک دوسرے سے ملاقات کررہے ہیں اور دوزخ کے لوگوں کی چیخ وپکار سن رہا ہوں۔“

”یہ وہ بندہ ہے جس کے قلب کو اللہ تعالیٰ نے منور کردیا ہے۔“[1]

دوم یہ کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم میں سے ایک شخص دوسرے کی رہنمائی اچھے یا برے کام کی طرف کرتا ہے لیکن جو کچھ وہ کہتا ہے اس پر خود عمل نہیں کرتا۔ تاہم پیغمبروں اور اماموں کے معاملہ میں جن کی ہدایت اور پیشوائی اللہ کے امر کے مطابق ہوتی ہے، اس قسم کی صورت کبھی پیدا نہیں ہوتی۔ وہ جس دین کی جانب لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں، وہ لوگوں کو جس روحانی زندگی کی دعوت دیتے ہیں، وہ ان کی خود کی بھی زندگی ہوتی ہے[2] کیونکہ اللہ تعالیٰ جب تک کسی شخص کی خود ہدایت نہ کرے اس کے ذریعہ دوسروں کی ہدایت ہرگز ممکن نہیں۔ اس بحث سے مندرجہ ذیل نتائج نکلتے ہیں:

۱۔ ہر امت میں اس کے پیغمبر اور امام جس روحانی و دینی زندگی کے کمال کی جانب لوگوں کو دعوت دیتے ہیں اور ان کی رہنمائی کرتے ہیں اس میں وہ خود پہلا مقام رکھتے ہیں کیونکہ جیسا کہ ان کے لئے لازم ہے وہ اپنی تعلیمات پر خود عمل کرتے ہیں اور جس روحانی زندگی پر وہ عقیدہ رکھتے ہیں اس میں خود بھی شریک ہوتے ہیں۔

۲۔ چونکہ وہ لوگوں میں پہلا مقام رکھتے ہیں اور امت کے پیشوا اور رہنما ہوتے ہیں اس لیے وہ سب سے افضل اور کامل انسان ہوتے ہیں۔

۳۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی امت کی رہنمائی پر مامور ہو وہ جس طرح لوگوں کی ظاہری زندگی اور اعمال میں ان کا رہنما ہوتا ہے، اسی طرح روحانی زندگی میں بھی ان کا رہنما ہوتا ہے اور

۱۔ الوافی، ملا محسن فیض کا شانی (جلد ۳، صفحہ ۳۳) مطبوعہ تہران ۱۴، ۱۰، ۱۳۱۰ھ

۲۔ جو شخص دین کی راہ دکھاتا ہے کیا وہ زیادہ حقدار ہے کہ اس کے حکم کی پیروی کی جائے یا وہ شخص جو خود ہی جب تک دوسرا اسے راہ نہ دکھائے راہ نہیں دیکھ سکتا۔ تم لوگوں کو کیا ہوگیا ہے؟ تم لوگ کیسے فیصلے کرتے ہو؟“ (سورہ یونس، آیت ۳۵)

انسانی زندگی کے باطنی پہلو اور دینی اعمال کا انحصار اس کی رہنمائی پر ہوتا ہے۔[۱]

اسلام کے امام اور پیشوا

سابقہ ابواب میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ رسول اللہؐ کی رحلت کے بعد امت مسلمہ میں ہمیشہ ایک امام (یعنی اللہ کا منتخب پیشوا) موجود رہا ہے اور یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ شیعیت میں رسول اکرمؐ کی ایسی بہت سی احادیث نقل کی گئی ہیں [۲] جن سے ائمہ کے اوصاف اور ان کی تعداد کا پتہ چلتا ہے اور اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ان سب کا تعلق قبیلۂ قریش اور اہلبیت رسولؐ سے ہے اور مہدئ موعود بھی انہیں میں سے ہیں اور ان میں سے آخری ہیں۔ علاوہ ازیں حضرت علیؑ کی امامت اور ان کے پہلا امام ہونے کے بارے میں نیز دوسرے ائمہ کی امامت کے متعلق بھی رسول اکرمؐ کے قطعی ارشادات موجود ہیں۔ اسی طرح پیشتر اماموں نے اپنے بعد آنے والوں کی امامت کے متعلق قطعی طور پر بتایا ہے۔[۳]

ان ارشادات کے مطابق جو شیعہ اثنا عشری مآخذ میں موجود ہیں، اماموں کی کل تعداد بارہ ہے اور ان کے اسماء گرامی یہ ہیں:

۱۔حضرت علی ابن ابی طالب المرتضیٰ (ع) ۲۔حضرت حسن ابن علی المجتبیٰ (ع) ۳۔حضرت حسین ابن علی المجتبیٰ (ع)
۴۔حضرت علی ابن حسین السجاد (ع) ۵۔حضرت محمد ابن علی الباقر (ع) ۶۔حضرت جعفر ابن محمد الصادق (ع)
۷۔حضرت موسیٰ ابن جعفر الکاظم (ع) ۸۔حضرت علی ابن موسیٰ الرضا (ع) ۹۔حضرت محمد ابن علی التقی (ع)
۱۰۔حضرت علی ابن محمد النقی (ع) ۱۱۔حضرت حسن ابن علی العسکری (ع) ۱۲۔حضرت محمد ابن حسن المہدی (ع)

۱۔ ہم نے انہیں لوگوں کا پیشوا (امام بنایا جو کہ ہمارے حکم سے (ان کی ہدایت کرتے تھے اور ہم نے ان کے پاس نیک کام... کرنیکی وحی بھیجی۔" (سورۂ انبیاء، آیت ۷۳) "جب وہ ثابت قدم ہوگئے اور ہماری وحی پر پختہ ایمان لے آئے تو ہم نے ان میں سے پیشوا (امام) مقرر کیے جو ہمارے حکم سے ان کی ہدایت کرتے تھے"۔ (سورہ سجدہ، آیت ۲۴) ان آیات سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ ظاہری پیشوا اور رہنما ہونے کے علاوہ امام لوگوں کی رہنمائی کرنے اور انہیں اپنی جانب مائل کرنے کی ایک روحانی طاقت بھی رکھتا ہے جس کا تعلق عالم بالا سے ہے۔ وہ صداقت، نور اور اپنی ہستی کی باطنی کیفیت کی بدولت لوگوں کے دلوں کو متاثر اور مسخر کرتا ہے اور یوں ان کی رہنمائی کمال اور ہستی کے اصلی ہدف کی جانب کرتا ہے۔

۲۔ جابر ابن سمرۃ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا: 'بارہ خلفاء کے دور تک یہ دین طاقتور رہے گا۔' پھر جابر کہتے ہیں کہ لوگوں نے اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا۔ پھر آنخضرتؐ نے کچھ آہستہ سے کہا۔ میں نے اپنے باپ سے پوچھا: "ابا جان! رسول اللہؐ نے کیا فرمایا ہے؟" میرے باپ نے جواب دیا: "رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ تمام خلفاء قریش میں سے ہوں گے۔" سنن ابوداؤد (جلد ۲، صفحہ ۲۰۷ مطبوعہ قاہرہ ۱۳۴۸ھ مسند احمد (جلد ۵، صفحہ ۹۲) ایسی کئی دیگر احادیث بھی ہیں۔ سلمان فارسی نے کہا ہے: "میں رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور دیکھا کہ حسینؑ ان کے گھٹنوں پر بیٹھے ہیں اور آنخضرتؐ ان کی آنکھیں اور منہ چوم رہے ہیں اور فرما رہے ہیں: "تم شریف ابن شریف، امام ابن امام، حجت ابن حجت ہو اور 'نو حجج' کے باپ ہو جن میں سے نواں ان کا سہارا (قائم) ہے۔" (ینابیع المودۃ، صفحہ ۳۰۸)

۳۔ دیکھئے: الغدیر، غایت المرام، اثبات الہداۃ۔ مصنفہ محمد ابن حسن حر عاملی مطبوعہ قم ۳۹، ۱۳۳۷ھ 'ذخائر العقبیٰ۔ مناقب' خوارزمی مطبوعہ نجف ۱۳۸۵ھ تذکرہ الخواص مصنفہ سبط ابن جوزی مطبوعہ تہران ۱۲۸۵ھ۔ ینابیع المودۃ، الفصول المہمہ، دلائل الامامت، مصنفہ محمد ابن جریر طبری مطبوعہ نجف ۱۳۶۹ھ۔ النص والاجتہاد، مصنفہ شرف الدین موسیٰ، مطبوعہ نجف ۱۳۷۵ھ، اصول الکافی (جلد ۱، اور کتاب الارشاد، مصنفہ شیخ مفید، مطبوعہ تہران ۱۳۷۷ھ

عدل الٰہی کے متعلق اسلامی نظریہ

استاد شہید ڈاکٹر سیّد محمّد حسین بہشتی

عدل عمومی

اسلامی ادراک کے مطابق ساری دنیا ایک ایسی حقیقت ہے جو عدالت کی بنیاد پر قائم ہے ۔ آسمان اور زمین عدالت پر قائم ہیں ۔ ہر چیز ایک ضابطہ اور حساب کی تابع ہے۔قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے :

"وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ" (سورہ رحمٰن، آیت ۷)

''اس نے آسمان کو بلند کیا اور ہر چیز کے لئے میزان قائم کی ۔''

ہر چیز ایک ہدف کی جانب رواں دواں ہے : کوئی چیز بیکار اور لا حاصل نہیں۔ ایک زندہ خلیہ کے اندر پوشیدہ اور ایک ایٹم کے قلب میں دکھائی دینے والے نظم سے لیکر اس باہمی تعلق اور پیچیدہ نظم تک جو ایک زندہ موجود کے جسم اور نظام شمسی اور بالآخر کہکشاؤں اور آسمانوں میں موجود ہے اور وہ تمام دقیق اور تعجب انگیز قوانین جو تمام کائنات پر حکومت کرتے ہیں اور جنہیں سائنس دریافت کرتے اور کام میں لانے کی کوشش میں مصروف ہے۔

جس اصول کی نشاندہی ہمیں امام علی علیہ السلام کے ارشاد گرامی سے ہوتی ہے اس کے مطابق عدل اس چیز سے عبارت ہے کہ : '' ہر چیز اپنی جگہ پر رکھی ہو۔''اور اس کے برعکس ظلم یہ ہے کہ : ''کوئی چیز اپنی اصلی جگہ سے ہٹ جائے ۔''

تمام دنیا میں عام نظم وضبط اور اسے قائم رکھنے والے روابط سے انحراف اختلال اور پراگندگی کا موجب بنتا ہے اور اعتدال اٹل فطری قوانین اور روایات کی پیروی کرنے سے حاصل ہوتا ہے تاکہ ہر چیز اپنی جگہ اور اپنی روش اور اپنی تدریجی ترقی کے مخصوص ضابطہ کے مطابق پیش قدمی کرے۔

نظم واعتدال ان جبری اصولوں میں سے ہے جو فطرت پر حکومت کرتے ہیں اور خود طبیعی موجودان روابط کی نوعیت کے انتخاب یا اعتدال کی حفاظت یا اس سے انحراف کا اختیار نہیں رکھتے۔حتیٰ کہ کسی قسم کا اختلال پیدا ہونے سے فطرت میں جو ردعمل اس لئے وقوع پذیر ہوتا ہے کہ فساد کے اسباب اور پیش رفت کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرے، نئے سرے سے نظم وضبط برقرار کرے اور ترقی اور

کمال کیلئے راستہ صاف کرے، وہ بھی فطرت کے جبری اصولوں میں سے ہوتا ہے۔

گو خود اختلال کا بھی ایک مخصوص نظم ہوتا ہے جو بلا شبہ ایک بڑے اعتدلال اور نظم میں خلل ڈال دیتا ہے۔ تاہم خود طبیعت میں تعمیری تضاد کی شکل میں ایسے بیرونی یا اندرونی عوامل ہوتے ہیں جو رکاوٹ دور کردیتے ہیں۔

خرابی سے جنگ کی اس جبری سنت کا ایک نمونہ یہ ہے کہ میکروب اور وائرس انسان کے بدن میں داخل ہوکر اسے بیمار کردیتے ہیں جس سے ہیجان اور شدید تکلیف کی صورت پیدا ہوجاتی ہے اور اس کا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ خون کے سفید اجزا (گلوبولس) یا دوائیاں باہر سے اس جنگ میں مدد کرتی ہیں اور بالآخر عام نظم اور اعتدال اور بدن کی صحت برقرار کردیتی ہیں۔

آزادی ارادہ وعدل ارادی

جیسا کہ ہم تفصیل سے ملاحظہ کرچکے ہیں ارادے میں کامیابی کی خاطر عدل انسان پر ایک خاص شکل میں حکومت کرتا ہے، کیونکہ تمام عوامل میں سے ارادے کا عامل اور انسان کے انتخاب کرنے کی قوت ایک بنیادی کردار ادا کرتی ہیں۔ جبری عوامل اور روایات کے کردار اور انتخابات کے عامل کی حدود کی وسعت کے درمیان موازنہ نے دنیا کے ایک عظیم ترین فلسفیانہ مسئلہ کو جنم دیا ہے۔ یہ کہنا چاہئے کہ یہ انسان کے قدیم ترین اور ساتھ ہی ساتھ حساس ترین خیالات میں سے ہے اور قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس مسئلہ کا حل اور اس میدان میں انسان کی بصیرت کی نوعیت خودسازی اور جامعہ سازی کے سلسلہ میں اس کی کوشش اور عمل کے دائرے اور قابلیت سے براہ راست تعلق رکھتی ہے۔ مسلمانوں میں بھی جبراور اختیار کے بارے میں بحث نے بہت سے جھگڑوں کو جنم دیا اور بہت سی کلامی اور فلسفیانہ بحثیں شروع ہوگئیں۔ایک گروہ نے ان آیات کی روشنی میں جس میں یہ کہا گیا ہے کہ عزت اور ذلت اور ہدایت اور گمراہی خدا کے ہاتھ میں ہے، یہ نتیجہ نکالا کہ انسان خود کسی قسم کا ارادہ یا آزادی نہیں رکھتا۔ درحقیقت وہ اسے خدائے تعالیٰ کی مشیت کے ہاتھ میں ایک بے ارادہ اوزار قرار دیتے ہیں۔

یہ نتیجہ اخذ کرنے کے بعد وہ اسے ایک اور نظریہ کے لئے سند قرار دیتے ہیں اور وہ یہ کہ ہم خدائے تعالیٰ کی جس وسیع حاکمیت اور مطلق تسلط کے قائل ہیں، اس کی روشنی میں توحید پر اعتقاد سے

یہ لازم آتا ہے کہ دنیا کے تمام مظاہر حتیٰ کہ انسانوں کے اعمال اور کردار تک خدا کے ارادے اور مشیت کے اختیار میں ہے اور پروردگار عالم کی مشیت مطلق کے مقابلہ میں کسی ارادے اور اختیار کا وجود نہیں ہے، ورنہ جو کام کوئی اپنی مرضی سے کرے وہ خدا کے دائرہ اختیار سے خارج ہو جائے گا اور یہ صورت اس نظریہ سے سازگار نہیں کہ امر اور ارادہ خداوند عالم کی ذات میں مرکوز ہیں۔

دوسری جانب ان حکومتوں نے جو موقع کی تلاش میں تھیں اس نظریہ کی تائید کی کیونکہ اس طرح لوگ کوئی اعتراض نہیں کر سکتے تھے اور اگر حاکم شان وشوکت اور عیش وعشرت کی زندگی بسر کرتا اور لوگ فقر وفاقہ اور ذلت سے دوچار ہوتے تھے، تو وہ دم نہیں مار سکتے تھے کیونکہ اس صورت حال کی توجیہ یہ کہہ کر کی جاتی تھی کہ ہر چیز خدا کے ہاتھ میں ہے، وہ جسے چاہتا ہے عزت بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل وخوار اور کردیتا ہے۔ بالکل اسی طرح ساسانی شہنشاہ بھی لوگوں کو ان پر عائد بندشوں اور انکی تمام محرومیوں کے ساتھ ان کے طبقوں میں محدود رکھتے تھے اور اس کی توجیہ یہ پیش کرتے تھے کہ چونکہ انکا تعلق ایک مخصوص طبقہ میں منتقل ہونا ممکن نہیں، لہٰذا انہیں چاہئے کہ اونچے طبقوں کے وسیع اختیارات اور بے حد وحساب آسائشوں کے مقابلہ میں اپنے طبقہ سے مربوط ذلت اور دباؤ برداشت کرتے رہیں۔

علاوہ ازیں ہندومت کا طبقاتی نظریہ بھی ان اچھوتوں کی ان شدید قانونی اور سماجی محرومیوں کو جو ان پر جبراً مسلّط کی گئی تھیں، ان کا مقدر قرار دیتا تھا اور ایک طبقہ اور اس سے وابستہ ذلت وتکالیف سے دوسرے طبقہ میں منتقل ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اسلام میں نسلی، قبائلی اور طبقاتی درجہ بندی اور سماجی گروہوں کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی اور تخلیق، سرشت اور والدین کے نقطۂ نظر سے سب انسانوں کو یکساں سمجھا تا ہے۔

تاہم جب یہ نظریہ خاص توجیہ اور تفسیر کے ساتھ پیش کیا گیا کہ خدا کی جبری مشیت لوگوں کے مقدر اور اجتماعی حالات پر حاوی ہے، تو یہ انہیں خاموش رکھنے کے لئے بخوبی موثر ہوسکتا تھا۔ یہی وجہ ہوئی کہ اشاعرہ کا مذہب جس کا جھکاؤ جبر کی جانب تھا عموما حکومت کا سرکاری مذہب قرار پایا اور اس کے مخالفین (معتزلہ) جو کسی حد تک آزادی کے قائل تھے، حکومت کے مد مقابل رہے اور ان پر سختیاں کی گئیں۔

مسلمانوں کے گروہ نے ان آیات کو مدنظر رکھتے ہوئے جن سے اختیار کا پہلو نکلتا ہے، یہ مسلک اختیار کیا کہ انسانوں کے کام خود ان کے سپرد کئے گئے ہیں ۔ وہ خود ہی ارادہ کرتے ہیں اور خود ہی اپنا مقدر بناتے ہیں۔ اس گروہ کے مطابق اس خیال کی تائید پیغمبروں کی آمد ان کے ڈرانے اور خوشخبری دینے اور اس کے علاوہ تکلیف ، معاد، جنت اور دوزخ کے مسئلے سے ہوتی ہے۔

پھر یہ مسئلہ پیش کیا گیا کہ اگر فرض کرلیا جائے کہ مخالفین کا نظریہ درست ہے اور لوگ جو کام انجام دیتے ہیں وہ درحقیقت خدا کے کام ہوتے ہیں تو اس بناء پر لوگوں کے گناہ اور مظالم اور برائیاں بھی اعمال الٰہی تصور کی جانی چاہئیں جبکہ ذات خداوندی ظلم اور دوسرے ناروا کام سے منزہ اور مبرا ہے۔

لہٰذا اشاعرہ کے دلائل کے مقابلہ میں خدائے تعالیٰ کی ''تنزیہ'' کا مسئلہ پیش کیا گیا۔

مذہب عدل

مذہب عدل شیعہ نقطہ نگاہ ہے ، وہ اسلام کی صحیح تعلیم کے پیش نظر ، مذکورہ بالا دونظریات کی افراط و تفریط کے مابین معتدل عقیدہ اور حد واسط کا قائل ہے۔

چنانچہ جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا ہے :'' نہ جبر ہے اور نہ تفویض (خود مختاری) بلکہ دونوں کے درمیان ایک راہ ہے۔''

اس نظریہ کی وضاحت کے لئے مندرجہ ذیل مسائل پر توجہ دینا ضروری ہے:

۱۔توحید کے اصول کو اس کے تمام پہلوؤں کے ساتھ ہم نے ''توحید'' کے باب میں سمجھ لیا ہے اور خدائے تعالیٰ کے امر اور فرمان اور اس کی وسیع اور مطلق حاکمیت کے بارے میں واقفیت حاصل کرلی ہے۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ پوری کائنات کی ہر چیز خدائے تعالیٰ کے ارادے کے دائرہ میں ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

''وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضَ'' (سورہ البقرہ آیت ۲۵۵)اس کا دائرہ حکومت تمام آسمانوں اور زمین کو گھیرے ہوئے ہے۔

۲۔ امر الٰہی ایسے اصولوں کی شکل میں ہے جو فطرت اور انسان اور دنیا کے فطری علل وعوامل اور

روابط پر حکومت کرتے ہیں۔

۳۔ انسان کی روش بھی کچھ عوامل کا مظہر ہے جس میں سے ایک انسان کا ''ارادہ'' ہے۔ یہ ''ارادہ'' بھی خدا کی سنت ہے یعنی اس نے چاہا کہ انسان ارادہ کر سکے۔ یوں انسان کی آزادی بھی خدائے تعالیٰ کے امر کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا ''توحید'' کے مسئلہ میں کوئی دقت پیش نہیں آتی اور انسان سمیت تمام موجودات پر خدا کا بطور مطلق محیط ہونا برقرار ہے۔

۴۔ بلاشبہ انسان کا ''ارادہ'' مطلق آزادی کی شکل میں نہیں ہے بلکہ ایک ایسی خواہش ہے جو بہت سی فطری، ماحولیاتی، وراثتی اور ذاتی شرائط سے مشروط ہے جس کی تفصیل آگے بیان کی جائے گی لہٰذا تفویض بھی مطلق نہیں ہے بالخصوص جب یہ بات ذہن میں رکھی جائے کہ انسان کو اپنے ارادہ سے کسی چیز کا انتخاب کرنے کے لئے کئی ایک شرعی اور اعتقادی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے مثلاً وحی الٰہی، دینی قوانین وضوابط کا وجود، اوامر ونواہی اور مسئلہ معاد اور قطعی عملی نتیجہ۔

۵۔ یہ خود انسان ہے جو اختیار کا غلط استعمال کر کے شر اور فساد پیدا کرتا ہے۔ پس اگر معاشرہ میں ظلم اور فساد کا وجود ہے تو یہ خدائے تعالیٰ کے ارادے کی مخلوق نہیں بلکہ انسان کے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ پروردگار عالم کی ذات ہر قسم کی آلودگی اور فساد سے پاک ہے اور فساد اور شر کا تعلق لوگوں سے ہے۔

ممکن ہے یہ سوال کیا جائے کہ خدائے تعالیٰ نے ایسے انسان پیدا ہی کیوں کئے جو زمین پر شر وفساد پھیلاتے ہیں؟ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ وہ ایسے لوگ پیدا کرتا جو کسی برائی کے مرتکب نہ ہوتے اور سبھی انسان نیک اور صالح ہوتے! تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایسے لوگ پیدا کئے جاتے تو وہ مجبور اور بے ارادہ موجودات ہوتے۔ ایک آزاد موجود ہی کبھی نیک عمل کرتا ہے اور کبھی شر کا مرتکب ہوتا ہے۔ کچھ لوگ نیک راستہ پر چلتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جو فساد کا راستہ اپناتے ہیں اور یہی آزادی کی خاصیت ہے۔ لہٰذا سوال کی صورت یہ ہونی چاہئے کہ:

اگر انسان ایک بے ارادہ، مجبور اور محکوم موجود کی شکل میں پیدا کیا جاتا ہے تو بہتر ہوتا یا موجودہ شکل میں (یعنی ایک آزاد اور ارادے اور تشخیص کی قوت رکھنے والی ہستی کی حیثیت سے) اس کی تخلیق بہتر ہے؟

اس سوال کا جواب واضح ہے یعنی انسان کا آزاد اور آگاہ موجود ہونا یقیناً بہتر ہے۔ اسی کے ساتھ

یہ نتیجہ بھی قبول کرنا پڑتا ہے کہ دنیا بھلائی اور برائی، ظلم و عدل، حق اور باطل، آزادی اور غلامی اور اسی طرح کے لاتعداد دوسرے تضادات سے بھری پڑی ہے اور اس مقصد کے لئے تیار ہے کہ انسان اپنی آزادی اور علم پر مبنی کردار ادا کرے۔

۶۔ یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب صورت حال یہ ہے تو ان آیات کا کیا مقصد ہے کہ اے خدا تو حکومت اور قدرت دیتا ہے، تو حکومت اور قدرت چھین لیتا ہے، تو عزت دیتا ہے، تو ذلت دیتا ہے، ہر چیز تیرے ہاتھ میں ہے یا یہ کہ اے خدا تو ہدایت دیتا ہے اور تو گمراہ کرتا ہے، وغیرہ۔ اگر انسان آزاد ہے اور اپنے مقدر کا انتخاب اور تعمیر خود کرتا ہے تو عزت اور ذلت خود اس کے ہاتھوں میں کیوں نہیں ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ دنیا میں ہر مظہر بعض اصولوں کے تابع ہے اور وہ اصول تخلیق کی ترکیب اور خداوند عالم کا امر ہیں۔ عزت اور ذلت، غریبی اور امیری، فتح و شکست، ہدایت اور گمراہی، موت اور زندگی، قدرت اور محکومیت، اور باقی سب چیزیں مظاہر ہیں۔ اور یہ ممکن نہیں کہ وہ بے حساب ہوں اور کسی قانون، نظام اور اصول کے تحت نہ ہوں۔ کسی فرد یا قوم کو عزت بلاوجہ نہیں مل جاتی۔ اقتصادی ترقی خود بخود حاصل نہیں ہوتی۔ موت کی کوئی وجہ ہوتی ہے۔ شکست و فتح کی کوئی وجہ ہوتی ہے۔ انسان کو چاہئے کہ ان اصولوں کو پہچانے اور جہاں تک ممکن ہو انہیں اختیار کر کے کمال کے راستہ کا انتخاب کرے۔

خداوند متعال عزت دیتا ہے لیکن ان لوگوں کو جو عزت حاصل کرنے کے اصولوں کو پہچانتے ہیں اور ان پر گامزن ہوتے ہیں۔ خدا نے مسلمانوں کو فتح مکہ سے ہمکنار کیا لیکن یہ ہجرت کے آٹھویں سال میں ہوا جب وہ کئی سال جنگیں لڑ چکے تھے اور انہوں نے اس فتح کے لئے تمام تدابیر اختیار کر لی تھیں۔ دوسرے لفظوں میں لوگوں نے ایک فتح حاصل کرنے کے لئے تمام ضروری اصولوں اور قوانین پر عمل کیا اور اس کے حاصل اور معلول کے طور پر خدا نے انہیں کامیابی عنایت کی۔

بلاشبہ خدا گندم کے دانوں سے بھری ہوئی بالیاں اس کی ڈنڈی سے پیدا کرتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ کسان نے فصل کی پرورش اور اسے آفات سے بچانے کے لئے تمام ضروری تدابیر اختیار کی ہوں۔

عدل اور معاد

معاد میں عدل الٰہی کا اظہار خاص طور پر ہوتا ہے ۔ جزا اور سزا میں عدل اور انسانوں کے اعمال اور مراتب کی درجہ بندی اور صفوں کی ایک دوسرے سے دقیق جدائی اور انسانی فطرت وخصلت کا اظہار جیسا کہ ہوتا ہے، اور معاد کے بارے میں وہ تمام دوسری باتیں جن کا پتہ ہمیں قرآن مجید سے چلتا ہے، معاد سے عدل کا تعلق ظاہر کرتی ہیں۔

جب یہ طے کرلیا جائے کہ انسان کا عمل خود اس کے لئے اپنے آزاد ارادہ کا حاصل ہے، اور جب انسان کو اپنے عمل اور مستقبل کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے، اور وہ پیغمبروں کی دعوت اور عقل اور وجدان کی ہدایت کی بدولت کافی حد تک عمل کی قدر و قیمت اور ماحصل یا اس کے منفی اثرات سے باخبر ہوجائے، اور اس بنا پر اپنے علم اور ارادے سے کام انجام دے یا اپنی روحانی خصلتوں کو شکل دینے اور ان کا رخ متعین کرنے اور اپنی اندرونی خواہشات کو اعتدال پر لانے یا ان سے کنارہ کش ہونے کی کوشش کرے تو بالآخر وہ اپنی اور معاشرہ کی بہتری یا بربادی کے لئے جو کچھ بھی کرنا چاہئے، کرے۔ اس صورت میں کامل عدالت یہ ہے کہ پاداش کے تعین میں اعمال کی صحیح حدبندی کی جائے اور جن حالات میں وہ انجام دئے گئے ہوں، ان کا لحاظ رکھا جائے اور ان کے مثبت اور منفی اثرات کو بھی ملحوظ رکھا جائے تاکہ وہ پاداش متناسب اور دقیق ہو۔

” اور لوگوں نے جیسے کام کئے ہوں گے ان کے مطابق درجے ہوں گے اور یہ اس لئے تاکہ خدا انکو ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے اور ان پر کوئی ظلم نہ کیا جائے گا“ (سورہ آل عمران، ۲۵)

کسی شخص کا کوئی اقدام فراموش نہیں کیا جاتا اور تمام اعمال مکمل طور پر محفوظ رہتے ہیں حتیٰ کہ وہ اعمال جنہیں خود متعلقہ افراد بھلا چکے ہیں۔” جب خدا انہیں دوبارہ اٹھائے گا تو انہیں ان کے اعمال سے آگاہ کر دے گا ۔ اگرچہ یہ لوگ ان کو بھول گئے ہیں، لیکن خدانے ان کو یاد رکھا ہے۔ (سورہ مجادلہ، ٦)

خدا لوگوں کو انکے ہر عمل سے آگاہ کرے گا خواہ وہ کتنا ہی چھوٹا ہواور کسی بھی شکل میں یا کسی بھی حالت میں انجام دیا گیا ہو۔

چنانچہ حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو وصیتیں کیں۔ ان کے سلسلہ میں قرآن مجید فرماتا ہے:

''اے بیٹے ! اس میں شک نہیں کہ وہ عمل (اچھا ہو یا برا) اگر رائی کے دانے کے برابر بھی ہو جو کسی سخت پتھر کے اندر یا آسمانوں میں یا زمین میں چھپا ہوا ہو تو خدا اسے (قیامت کے دن) باہر نکال لائے گا۔ بے شک خدا بڑا باریک بین اور واقف کار ہے۔'' (سورہ لقمان)

اور عمل کے ماحصل اور خود عمل میں اس قدر ہم آہنگی اور تناسب ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے گویا خود عمل ظاہر ہو رہا ہے:

جس دن ہر شخص اس نے جو کچھ نیکی (دنیا میں) کی ہے اور جو کچھ برائی کی ہے اس کو موجود پائے گا۔'' (آل عمران، ۳۰)

اور پھر ہر شخص خود اپنے عمل کا ذمہ دار ہوگا نہ کہ کوئی اور شخص جس کا اس کے ارتکاب میں کوئی حصہ نہ ہو:

''کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔'' (سورہ الانعام، ۱۶۵)

''جو شخص اچھا کام کرتا ہے اس میں خود اس کا فائدہ ہے اور جو شخص برائی کرتا ہے اس میں خود اس کا نقصان ہے۔'' (حم السجدہ، ۴۶)

حتی کہ اس بارگاہ عدل میں رتبہ، خاندان، معاشرہ میں رسوخ، مال و دولت، خفیہ سازش، پارٹی بازی یا سفارش کا کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتی:

''وہ دن جب دولت اور اولاد سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔'' (سورہ الشعراء، آیت ۸۸)

''اس وقت نہ تو سرکشوں کا کوئی سچا دوست ہوگا اور نہ کوئی ایسا سفارش کرنے والا جس کی بات مان لی جائے۔'' (سورہ المومن، ۱۸)

''جو رزق تمہیں دیا گیا ہے اس میں سے خرچ کرو اس سے پیشتر کہ وہ دن آئے جب سوداگری، دوستی اور سفارش کسی کام نہ آئے گی۔'' (سورہ البقرہ، آیت ۲۵۴)

پھر جس وقت صور پھونکا جائے گا اس دن نہ تو لوگوں میں قرابت داریاں رہیں گی نہ وہ ایک دوسرے کی بات پوچھیں گے۔ (سورہ المومنون، آیت ۱۰۱)

بلاشبہ وہاں نفس انسان، اپنے ایمان، عمل اور مکمل نفسانی کیفیت کے ساتھ موجود ہوگا اور اس کے اعمال کی جانچ ''دقیق حساب'' اور ''میزان عدل'' کے ذریعہ انجام پائے گی۔ یہ جانچ صراط مستقیم میں اور اس دستاویز کی بنیاد پر ہوگی جو زندگی کی کتاب ہے اور جس میں تمام اونچ نیچ درج ہے اور فیصلہ

اس خدا کے ہاتھ میں ہوگا جو عادل، خبیر، اور غنی مطلق ہے اور ہر قسم کی طرفداری، سود جوئی، دھمکی اور لالچ کے مقابلہ میں کمزوری اور جھکاؤ سے برتر ہے۔

اور گواہ بھی خود انسان ہوگا اور جو کچھ اس نے کیا ہے وہ اسکے تمام وجود سے پھوٹ کر نکلے گا اور پیشانی اور چہرہ سے ظاہر ہوگا اور یہ ضروری نہیں کہ زبان بولے بلکہ تمام بدن خود بولے گا اور انسان کے کردار اور عادات کا مظہر ہوگا۔

ہجرت کے چھٹے سال کے واقعات:
باغیان بنی المصطلق

آیت اللہ جعفر سبحانی

ہجرت کے چھٹے سال مسلمانوں کی فوجی طاقت میں غیر معمولی اضافہ ہو چکا تھا۔ صورت حال یہ ہوگئی تھی کہ ان لوگوں کی خصوصی جماعت کی آمدورفت شہر مکہ کے قریب تک ہوگئی تھی اور یہ لوگ بڑے اطمینان سے اس علاقہ میں آنے جانے لگے تھے لیکن انہیں اپنی فوجی طاقت کو قبائلی علاقوں کو فتح کرنے اور لوگوں کی املاک پر قبضہ جمانے کے لئے استعمال نہیں کرنا تھا۔

اگر مشرکین نے مسلمانوں سے ان کی آزادی نہ سلب کی ہوتی اور ماحول کو ان کی تبلیغی سرگرمیوں کے لئے سازگار رہنے دیا ہوتا تو پیغمبر اسلامؐ نے اسلحوں کی خریداری اور فوجیوں کی روانگی کا حکم ہرگز جاری نہ کیا ہوتا لیکن چونکہ مسلمانوں اور ان کی تبلیغی جماعت کے لوگوں کو دشمن کی طرف سے ہمیشہ خطرہ لگا رہتا تھا لہٰذا اسلام کے رہبر عالیقدر کے لئے یہ لازمی تھا کہ وہ عقلی تقاضہ کو پورا کرتے ہوئے اسلام کی دفاعی طاقت میں اضافہ کریں تاکہ دشمن کے احتمالی حملہ کا مقابلہ کیا جاسکے۔

ہجرت کے چھٹے سال تک ہی نہیں بلکہ پیغمبرؐ کی زندگی کے آخری دن تک جو جنگیں رونما ہوئیں اس کی بنیادی وجہ اور حقیقی سبب یہ تھا:

۱۔ مشرکین کے بزدلانہ حملوں کے جواب میں یہ دفاعی جنگیں ہوئیں جیسے جنگ بدر، جنگ احد اور جنگ خندق۔

۲۔ مسلمانوں اور ان کی تبلیغی جماعت سے وابستہ لوگوں پر دور افتادہ علاقوں اور جنگلوں میں قتل کردینے یا اذیت پہونچانے والے لوگوں کی تنبیہ کے لئے بھی یہ جنگیں ہوئیں۔ اس کے علاوہ ایسے لوگوں کی تنبیہ کے لئے بھی جنگ لازمی تھی جو معاہدہ شکنی کرتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کے لئے طرح طرح کے خطرے پیدا کرتے رہتے تھے جس میں بنی لحیان اور تین یہودی قبائل کے خلاف ہونے والی جنگ کو مثال اور نمونہ کی حیثیت سے پیش کیا جاسکتا ہے۔

۳۔ تیسرا سبب یہودی قبیلوں میں ابھرتے ہوئے اس جوش وخروش کو ختم کرنا تھا جس کے سایہ میں ان لوگوں نے مدینہ پر دھاوا بولنے کے لئے اسلحوں اور سپاہیوں کو جمع کرنا شروع کردیا تھا۔ چنانچہ اکثر چھوٹی اور سطحی جنگیں اسی وجہ سے رونما ہوا کرتی تھیں۔

غزوہ بنی المصطلق:

بنی المصطلق درحقیقت قبیلہ خزاعہ کی ایک کڑی تھے جو قریش کے پڑوسی تھے۔ مدینہ میں یہ اطلاع ملی کہ قبیلہ کا سردار ''حارث بن ابی ضرار'' شہر مدینہ کا محاصرہ کرنے کے لئے سپاہیوں اور اسلحوں کی فراہمی میں ہمہ تن سرگرم ہے ۔ چنانچہ پیغمبر اکرمؐ نے فیصلہ کیا کہ اس فتنہ کو ابتدائی مرحلہ میں ہی ختم کردیا جائے ۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنے ایک صحابی ''بریدہ'' کو معاملہ کی مکمل تحقیق کے لئے اس علاقہ میں روانہ کردیا۔ انہوں نے ایک انجان آدمی کی حیثیت سے قبیلہ کے سردار سے رابطہ قائم کیا اور اس سلسلہ کی مکمل اطلاعات حاصل کرلیں اور اس کے بعد مدینہ میں پیغمبرؐ سے ملاقات کی اور انہیں جو اطلاعات حاصل ہوئی تھیں ان کی تصدیق کردی۔ پیغمبرؐ فوراً ہی اپنے اصحاب کے ہمراہ قبیلہ ''بنی المصطلق'' کی طرف روانہ ہوگئے اور ''مریسیع'' نامی کنویں کے قریب ان لوگوں سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ دونوں گروہوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ مسلمانوں کی جانبازی اور عرب قبیلوں پر طاری مسلمانوں کے رعب ودبدہ کی وجہ سے تھوڑے ہی عرصہ میں دشمنوں کے دس فوجی مارڈالے گئے اور دشمن کی فوج میں بھگدڑ مچ گئی۔ اس لڑائی میں غلطی سے ایک مسلمان سپاہی بھی کام آگیا۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو بہت سی املاک بطور مال غنیمت حاصل ہوئیں اور ان کی عورتوں کو جنگی قیدی کی حیثیت سے گرفتار کرلیا گیا۔[۱]

اس جنگ کے سبق آموز پہلوؤں میں وہ سیاسی اتھل پتھل شامل ہے جن کا پیغمبرؐ نے بعد میں رونما ہونے والے حوادث میں باقاعدہ استعمال کیا۔

پہلی بار پیغمبر اکرمؐ کو مہاجر وانصار جماعت کے درمیان اختلاف کی چنگاری دکھائی دی اور اگر پیغمبرؐ کی تدبیر شامل حال نہ ہوتی تو اختلاف کی یہ آگ بھڑکتے ہوئے شعلوں میں تبدیل ہوجاتی اور ان لوگوں کا سارا اتفاق واتحاد مٹھی بھر لوگوں کی سطحی خوشی کی نذر ہوجاتا۔

۱۔تاریخ طبری، جلد ۲، ص ۲۶۰

اختلاف کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ جنگ کے خاتمہ کے بعد دو مسلمانوں کے درمیان جن میں سے ایک ''جہجاہ مسعود'' نامی مہاجر اور ''سنان جہنی'' نامی انصار تھا، نہر کے کنارے کسی بات پر اختلاف پیدا ہوگیا۔ ان لوگوں نے اپنی مدد کے لئے اپنے قبیلہ والوں کو پکارنا شروع کردیا اور اس کمک طلبی کے نتیجہ میں ایسا لگتا تھا کہ مسلمان اپنے مرکز سے دور ایک دوسرے کی جان کے پیچھے پڑ جائیں گے اور ایک دوسرے کو تباہ و برباد کر ڈالیں گے۔ اسی دوران پیغمبرؐ کو اس اختلاف کی اطلاع حاصل ہوگئی۔ انہوں نے حکم صادر فرمایا کہ ان دونوں لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دو کیونکہ کمک طلبی کی آواز درحقیقت نہایت نفرت انگیز ہے۔[۱] یہ دور جاہلیت کی دعوت کی طرح ہے اور ایسا لگتا ہے کہ دور جاہلیت کے منحوس آثار ابھی ان لوگوں کے دلوں میں برقرار ہیں۔

ان دونوں لوگوں کو اسلام کے اس منصوبہ کی اطلاع نہیں ہے کہ اسلام نے تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا ہے اور ہر وہ آواز جو تفرقہ واختلاف کا باعث ہو، توحید پرستی کی نظر میں کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی۔[۲]

ایک منافق جنگ کی آگ بھڑکا دیتا ہے:

اس طرح پیغمبر اسلامؐ نے اختلاف کی آگ بھڑکنے نہیں دی اور دونوں گروہوں کو ایک دوسرے پر حملہ کرنے سے روک دیا۔ لیکن ''عبد اللہ بن ابی'' نامی شخص نے، جو مدینہ میں حزب نفاق کا سردار اور مذہب اسلام سے غیر معمولی بغض و کینہ وعداوت رکھتا تھا اور مال غنیمت کے لالچ میں اسلامی جہاد میں شریک رہا کرتا تھا، اس موقع پر اپنی کینہ پروری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے ارد گرد جمع لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''یہ سب کچھ ہم لوگوں کی وجہ سے ہے۔ ہم لوگوں نے خود ہی یہ مصیبت مول لی ہے۔ ہم مدینہ والوں نے مہاجرین مکہ کو اپنی سرزمین میں پناہ دی۔ دشمنوں کے شر سے ان لوگوں کی بھرپور حفاظت کی اور اب ہم لوگوں کا یہ حال ہوگیا ہے کہ ہمارے ٹکڑوں پر پلا ہوا کتا ہمیں کاٹنے دوڑ رہا ہے۔ خدا کی قسم مدینہ پہونچتے ہی ہم لوگوں کو پہلی فرصت میں ان کمزور و بے سہارا مہاجروں کو اپنی سرزمین سے باہر نکال دینا چاہیئے''۔

۱۔ ''دعوھا فانھا منتنة'' ۲۔ ''تعالیق سیرة ابن ہشام نقل از سھیلی''

عبد اللہ کی ان باتوں کا اس کے ارد گرد جمع افراد پر بہت بُرا اثر پڑا کیونکہ ان لوگوں کے دل ودماغ میں ابھی جاہلانہ فکر اور عربی تعصب باقی تھا۔ اس منافقانہ تقریر کی وجہ سے ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ مسلمانوں کے درمیان جو اتحاد واتفاق قائم ہوگیا تھا اسکا شیرازہ منتشر ہوجائے گا۔

خوش قسمتی کی بات تھی کہ ”زید بن ارقم“ نامی ایک غیرت دار مسلمان نوجوان ان لوگوں کے درمیان موجود تھا۔ اس نے نہایت موثر اور بھرپور انداز میں اس منافق کی شیطانی باتوں کا جواب دیتے ہوئے کہا:

”خدا کی قسم! خوار وذلیل تو تو ہے۔ جس شخص کی خود اپنے لوگوں اور رشتہ داروں کے درمیان کوئی قدر وقیمت نہیں ہے، وہ تو ہے۔ لیکن محمدؐ تو پوری امت مسلمہ کی نگاہوں میں عزیز ومحترم ہیں اور لوگوں کے دل میں ان کی محبت بھری ہوئی ہے۔“

اس کے بعد زید بن ارقم اس جگہ سے اٹھے اور سپہ سالار لشکر اسلام یعنی پیغمبر اکرمؐ کو عبد اللہ کی کینہ پروری سے باخبر کردیا۔ پیغمبرؐ نے ماحول کو نگاہ میں رکھتے ہوئے تین بار زید کی باتوں کی طرف نہ صرف کوئی خاص توجہ کی بلکہ ان سے کہا کہ ہوسکتا ہے تم نے اس کی بات سننے میں غلطی کی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تم غیض وغضب اور غیر معمولی غصہ وناراضگی کی وجہ سے کہہ رہے ہو۔ ہوسکتا ہے اس نے تمہیں چھوٹا اور بیوقوف سمجھ کر ایسی باتیں کہی ہوں، لیکن درحقیقت اس کا مقصد یہ نہ رہا ہو۔ لیکن زید نے پیغمبرؐ کی ان تمام باتوں کا منفی جواب دیا۔ ایسا ہرگز نہیں تھا بلکہ اس نے اختلاف پیدا کرنے اور مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ونفاق کی آگ بھڑکانے کے لئے یہ تمام باتیں کہی تھیں۔

خلیفہ دوم نے پیغمبرؐ سے درخواست کی کہ ”عبد اللہ بن ابی“ کے قتل کا حکم جاری کردیجئے۔ لیکن پیغمبرؐ نے فرمایا کہ سردست ایسا کرنا مصلحت کے مطابق نہیں ہے کیونکہ لوگ یہ کہیں گے کہ محمدؐ اپنے اصحاب کو قتل کررہے ہیں۔“[۱]

۱۔ خلیفہ دوم کے حالات زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جنگ کے میدان اور محاذ پر اپنی طاقت وشجاعت کا مظاہرہ نہیں کیا کرتے تھے اور ہمیشہ متقاعدین کی صف میں ہوا کرتے تھے۔ لیکن جب مسلمان مجاہدین دشمن کو قیدی بنا کر سامنے لاتے تھے تو وہ پہلی فرصت میں اور سب سے آگے بڑھ کر پیغمبرؐ سے یہ مطالبہ کرنے لگے تھے کہ اس کی گردن مار دینے کا حکم جاری کردیا جائے۔ مثال کے طور پر ذیل میں ان حوادث کی نشاندہی کی جارہی ہے جہاں انہوں نے دشمن کے فوری قتل کا مطالبہ کیا تھا۔ الف۔ ایک یہی موقع تھا جس میں انہوں نے عبد اللہ کی گردن زونی کا مطالبہ کیا تھا۔ ب۔ فتح مکہ کے موقع پر ”حاطب بن بلتعہ“ نے مشرکین کے لئے جاسوسی کی تھی۔ اس مجرمانہ حرکت کی سزا کے طور پر انہوں نے پیغمبرؐ سے مطالبہ کیا کہ اس کی گردن اڑادی جائے۔ ج۔ جب ابوسفیان کو پیغمبرؐ کے چچا عباس نے اسلامی سپاہ کے درمیان لاکر کھڑا کردیا تو خلیفہ دوم نے فرمایا کہ اس شخص کو فوراً ہی قتل کردینا چاہئے۔ اس کے علاوہ بھی متعدد مقامات پر ان کا یہ مطالبہ دیکھا جاسکتا ہے۔

عبد اللہ کو پیغمبر اکرمؐ اور زید بن ارقم کے درمیان ہونے والی گفتگو کا پتہ چل گیا۔ وہ فوراً خدمت پیغمبرؐ میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے میں نے تو یہ سب کبھی نہیں کہا ہے۔ کچھ خیر اندیش لوگوں نے عبد اللہ کی حمایت کرتے ہوئے فرمایا کہ ''عبد اللہ'' سے نقل قول کے دوران زید کو قدرے غلط فہمی سی ہوگئی ہے۔ اس کے کہنے کا مقصد یہ نہیں تھا۔

لیکن معاملہ اسی جگہ ختم نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس قسم کی وقتی خاموشی درحقیقت طوفان سے قبل چھا جانے والی خاموشی ہوا کرتی ہے۔ جس پر ہرگز اعتماد نہیں کیا جاسکتا ہے بلکہ رہبر عالیقدر کو کوئی ایسا کام انجام دینا چاہیئے جس کی وجہ سے یہ دونوں واقعہ کو پوری طرح بھول جائیں۔ چنانچہ انہوں نے اسی مقصد سے، اگرچہ ابھی کوچ و روانگی کا وقت نہ تھا پھر بھی انہوں نے کوچ کا حکم جاری کردیا ''اسید بن حضیرؓ'' پیغمبرؐ کی خدمت میں شرف یاب ہوئے اور کہنے لگے۔

''یہ کوچ کا وقت تو نہیں ہے۔ آپ نے یہ حکم کیوں جاری کردیا؟''

پیغمبرؐ نے کہا۔'' کیا تم کو''عبد اللہ'' کے ذریعہ تفرقہ واختلاف کی بھڑکائی گئی آگ کا علم نہیں ہے؟'' ''اسید'' نے قسم کھائی اور کہا: 'اے پیغمبر عزیزؐ! طاقت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ اس شخص کو فوری طور پر باہر نکال دیں۔ آپ تمام لوگوں کے درمیان عزیز وگرامی قدر ہیں اور وہ تو ذلیل وخوار رہا ہے۔ آپ تو اسے ایک شکست خوردہ انسان خیال کیجئے۔ مدینہ میں آپ کی مہاجرت سے قبل اوسیان وخزرجیان نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس کو مدینہ کا حاکم بنادیں۔ لوگ جواہرات جمع کرنے میں لگے ہوئے تھے تاکہ اس کی تاج پوشی کا اہتمام کرسکیں لیکن ستارۂ اسلام کے نمودار ہوتے ہی اس کا سارا کام بگڑ گیا اور اس کے اردگرد جمع لوگ تتر بتر ہوگئے۔ درحقیقت وہ آپ کو اس انتشار وپراگندگی کا سبب خیال کرتا ہے۔

کوچ کا فرمان جاری ہوگیا۔ سپاہیان اسلام ۲۴ گھنٹے سے زیادہ عرصہ تک راستہ طے کرتے رہے اور نماز کے علاوہ کسی بھی کام سے راستہ میں کسی جگہ پر توقف اختیار نہیں کیا۔ دوسرے روز گرمی بہت زیادہ تھی اور کسی میں ایک قدم چلنے کی طاقت نہیں رہ گئی تھی لہٰذا پڑاؤ کا حکم جاری ہوگیا۔ غیر معمولی تھکاوٹ کی وجہ سے لوگ اپنی سواریوں سے اترتے ہی گہری نیند میں سوگئے اور تمام تلخ یادیں ان کے ذہن سے دور ہوگئیں اور اس طرح اختلاف کی آگ ٹھنڈی ہوگئی۔[۱]

۱۔ تاریخ طبری، جلد ۲، ص ص ۲۶۱ و ۲۶۲، مجمع البیان جلد ۱، ص ص ۲۹۲۔ ۲۹۵

ایک سپاہی اور ایمان وجذبات کی کشمکش:

''عبد اللہ'' کا بیٹا ایک پاکدل' مومن اورنوجوان مسلمان تھا۔ اسلامی تعلیمات کی وجہ سے وہ اپنے منافق باپ سے بھی بڑی محبت کرتا تھا۔ اور اس پر بہت مہربان بھی تھا ۔ اس کو اپنے والد سے متعلق حادثہ کا علم ہوگیا تھا اور اس کو اس بات کا یقین بھی ہوگیا تھا کہ پیغمبرؐ اس کے قتل کا حکم صادر کریں گے۔

لہٰذا وہ پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا'' اگر یہ بات طے ہو چکی ہے کہ میرے والد کو قتل کر دیا جائے تو میں بذات خود اس حکم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے حاضر ہوں۔میری خواہش ہے کہ آپ اس کام کو کسی دوسرے آدمی کے سپرد نہ کریں!

کیونکہ مجھے یہ ڈر ہے کہ عربی حمیت اور پدری محبت کی وجہ سے میرے صبر کا دامن چھوٹ جائے اور بعد میں میں اپنے والد کے قاتل کو قتل کرکے اپنے ہاتھوں کو ایک مسلمان کے خون سے آلودہ کرلوں اور آخر کار اس کام کی وجہ سے میں اپنی زندگی برباد کرڈالوں۔

اس نواجوان کی گفتگو سے ایمان کی بلند ترین تجلی دکھائی دیتی ہے۔ نوجوان بیٹا پیغمبرؐ سے یہ سفارش نہیں کرتا کہ میرے والد کی خطا پر زیادہ توجہ نہ دیں بلکہ اسے درگزر کردیں؟! ایسی سفارش نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس نوجوان کا یہ عقیدہ وایمان تھا کہ پیغمبر اکرمؐ ہر کام حکم خداوندی کے بموجب انجام دیتے ہیں۔ بہرحال عبد اللہ کا بیٹا ایک انتہائی حیرت انگیز روحانی کشمکش میں مبتلا تھا۔

باپ سے غیر معمولی محبت اور عربی غیرت وحمیت اس نوجوان کو اپنے والد کے خون کا بدلہ لینے کے لئے آمادہ کرتی ہے جس کے نتیجہ میں ایک مسلمان کا قتل یقینی ہوجاتا ہے۔

لیکن اس کے برخلاف بعض دیگر عوامل مثلاً اسلامی ماحول میں امن وسکون کے قیام کے لئے یہ بات لازمی ہوجاتی ہے کہ اس جوان کے باپ کو قتل کردیاجائے ۔ اس کشمکش سے تنگ آکر اس نے تیسرا راستہ اختیار کرلیا تاکہ اعلیٰ اسلامی مفاد ومصالح بھی محفوظ رہ جائیں اور اس نوجوان کے جذبات بھی مجروح نہ ہونے پائیں اور یہ کام وہ خود اپنے ہی ہاتھوں سے انجام دے۔

اگرچہ یہ عمل انتہائی جگر خراش اور جانکاہ ہے لیکن ارادہ الٰہی کے سامنے سرتسلیم خم کردینے کی خواہش اور اس کی ایمانی طاقت اسے بڑھ کر سہارا دے رہی تھی ۔لیکن پیغمبرؐ مہربان نے اس نوجوان سے کہا کہ ایسا فیصلہ نہیں کیا گیا ہے اور ہم لوگ اس معاملہ کو طے کرلیں گے۔

یہ بات درحقیقت پیغمبرؐ کی روحانی عظمت کی دلیل تھی جس کو دیکھنے کے بعد تمام مسلمان حیران رہ گئے اور عبد اللہ کی طرف لعنت وملامت کا سیلاب امنڈ پڑا اور وہ لوگوں کی نظر میں اتنا ذلیل و رسوا ہوا کہ لوگ اس کی طرف سے بالکل لاپرواہ ہوگئے۔

پیغمبرؐ نے اس واقعہ کے دوران مسلمانوں کو نہایت سبق آموز درس سے مالامال کردیا۔ انہوں نے اپنے اس عمل سے اسلام کی دانشمندانہ سیاست کی ایک ہلکی جھلک پیش کردی۔ اس کے بعد منافقون کے سردار عبداللہ نے معاشرہ میں کبھی سر اٹھا کر بات نہیں کی اور ہر معاملہ میں وہ لوگوں کے اعتراض وتنفر کا نشانہ ہوا کرتا تھا۔ ایک دن پیغمبرؐ نے خلیفہ دوم سے کہا: جس دن تم نے مجھ سے عبد اللہ کو قتل کردینے کی بات کہی تھی اس وقت لوگ اس کے قتل کی خبر سنتے ہی غمگین ومتاثر ہوجاتے اور اس کی حمایت میں آواز بھی بلند کرتے لیکن آج لوگ اس سے اس قدر متنفر ہیں کہ اگر میں اس کے قتل کا حکم جاری کردوں تو لوگ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اسے قتل کرڈالیں گے۔

بابرکت شادی باغیان بنی مصطلق کے سردار:

''حارث بن ضرار'' کی بیٹی قیدیوں میں شامل تھی۔ اس کا باپ فدیہ لئے ہوئے اپنی بیٹی کی تلاش میں آیا تاکہ اسے قید سے آزاد کراسکے۔ جب وہ بیابان عقیق پہونچا تو اس نے فدیہ کی خاطر لائے گئے اونٹوں میں سے دو اونٹ منتخب کئے اور انہیں پہاڑ کی گھاٹی میں چھپادیا۔ جب وہ رسول خداؐ کی خدمت میں حاضر ہواتو کہنے لگا کہ میں اپنی بیٹی کا فدیہ لایا ہوں۔ پیغمبرؐ نے حارث کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا کہ ہاں! مجھے معلوم ہے تم نے دو اونٹ پہاڑ کی فلاں گھاٹی میں چھپا رکھے ہیں۔

حارث اس غیبی خبر کو سننے کے بعد بوکھلا گیا۔ اس کے ساتھ اس کے دو بیٹے بھی آئے تھے وہ لوگ بھی حیران رہ گئے۔ آخر کار ان لوگوں نے اسلام قبول کرلیا۔ اس کے بعد حارث نے اپنے لڑکوں سے وہ اونٹ منگوائے اور انہیں پیغمبرؐ کی خدمت میں پیش کردیا۔ اس طرح اس کی بیٹی آزاد ہوگئی اور اس نے بھی اسلام قبول کرلیا۔ اس کے بعد پیغمبرؐ نے اس لڑکی سے شادی کی خواہش ظاہر کی اور باپ نے خوشی خوشی چارسو درہم پر اپنی بیٹی پیغمبرؐ کے عقد میں دیدی۔ حارث قبیلہ مصطلق کا سردار تھا چنانچہ اس کی بیٹی کے ساتھ پیغمبرؐ کی شادی کی خبر تمام مسلمانوں میں پھیل گئی۔ اس شادی کی وجہ سے بنی مصطلق کے سو گھرانے آزاد ہوگئے اور تمام لوگ اپنی زبان سے یہ جملہ دہراتے دکھائی دے رہے تھے کہ اس

لڑکی کی طرح کوئی دوسری لڑکی اپنے قوم کے لئے اتنی بابرکت ثابت نہیں ہوئی۔ آخر کار قبیلہ بنی مصطلق کے تمام لوگ مردوزن یکے بعد دیگر آزاد ہوکر اپنے قبیلہ والوں میں شامل ہوگئے۔[۱]

فاسق رسوا ہوجاتا ہے:

بنی مصطلق گروہ سے وابستہ لوگوں کی اسلام سے رغبت درحقیقت ایک حقیقی رغبت تھی کیونکہ قید واسیری کے زمانہ میں ان لوگوں نے خوش اخلاقی، نیکی اور درگذشت ومعافی کے علاوہ کچھ نہ دیکھا تھا یہاں تک کہ ان کے سبھی قیدی کسی نہ کسی بہانہ سے آزاد ہوگئے اور مکمل امن وامان کے ساتھ اپنے قبیلہ والوں کے پاس چلے بھی گئے۔ پیغمبر اکرمؐ نے ''ولید بن عقبہ'' کو زکات وصول کرنے کے لئے ان لوگوں کے پاس روانہ کیا۔ جیسے ہی ان لوگوں نے رسول خداؐ کے نمائندہ کی آمد کی خبر سنی اپنے گھوڑوں پر سوار ہوکر ان کے استقبال کے لئے پہونچ گئے۔ پیغمبرؐ کے نمائندہ نے یہ خیال کیا کہ یہ لوگ انہیں قتل کرنے کے ارادہ سے آئے ہیں۔ پس وہ فوراً مدینہ واپس چلے گئے اور دروغ گوئی سے کام لیتے ہوئے یہ کہا کہ وہ لوگ ہمیں قتل کردینا چاہتے تھے اور زکات ادا کرنے سے انکار کردیا ہے۔

ولید کی یہ خبر تمام مسلمانوں میں پھیل گئی۔ ان لوگوں کو ''بنی مصطلق'' سے ایسی امید نہ تھی۔ اسی عرصہ میں ان لوگوں کا ایک وفد مدینہ آیا اور رسول خداؐ کو حقیقت سے آگاہ کردیا۔ ان لوگوں نے بتایا کہ ''ہم لوگ اس کے استقبال کے لئے گئے تھے اور نہایت احترام واہتمام کے ساتھ ان کی خدمت میں زکات کی رقم پیش کرنا چاہتے تھے لیکن اچانک وہ اس علاقہ سے غائب ہوگئے اور ہم لوگوں کو پتہ چلا کہ وہ مدینہ واپس چلے گئے ہیں۔ بعد میں ہم لوگوں کو یہ بھی معلوم ہوا کہ انہوں نے آپ سے دروغ بیانی بھی کی ہے۔ اسی موقع پر سورہ حجرات کی چھٹی آیہ کریمہ نازل ہوئی جس میں بنی مصطلق قبیلہ کی تائید کرتے ہوئے ولید کو ایک مرد فاسق کی حیثیت سے متعارف کیا گیا ہے۔ آیہ کریمہ کا مضمون حسب ذیل ہے:

''اے ایمان والو! اگر ایک فاسق آدمی تم لوگوں کے پاس کوئی خبر لائے تو توقف سے کام لو اور خوب اچھی طرح تحقیق کرلو کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی بات پر اعتماد کرتے ہوئے تم لوگ کوئی ایسا کام کرڈالو جس کی وجہ سے بعد میں تمہیں شرمندہ وپشیمان ہونا پڑے۔''

۱۔ سیرہ ابن ہشام جلد ۲، ص ۲۹۵، تفسیر قمی، ص ۶۸۱ اور تاریخ طبری، جلد ۲، ص ۲۶۴

امام خمینیؒ اور شرح چہل حدیث

ڈاکٹر سید حسنین اختر شاہوار

آیت اللہ خمینی کی شخصیت دنیا کے لئے محتاج تعارف نہیں ۔ یہ وہ عظیم شخصیت تھی جس نے استعماری اور سامراجی طاقتوں کے انسانیت سوز منصوبوں پر پانی پھیر دیا اور سرزمین ایران سے ان کی جڑیں کھود دیں۔ اس نابغۂ روزگار کی ولادت با سعادت ۲۰؍ جمادی الثانی ۱۳۲۰ھ کو خمین نامی مقام کے ایک علمی خانوادہ میں ہوئی۔ آپ کے والد بزرگوار آیۃ اللہ سید مصطفیٰ موسوی جلیل القدر عالم دین سید احمد موسوی مرحوم کے صاحبزادہ تھے۔ آپ کی عمر صرف پانچ ماہ کی تھی۔ آپ سایۂ پدری سے محروم ہو گئے۔

آپ کا بچپن خمین میں گزرا۔ وہیں آپ نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹ برس کی عمر میں آپ مزید تعلیم کے لئے اراک تشریف لے گئے اور حوزۂ علمیہ اراک میں آپ نے اپنے وقت کے جید عالم آیۃ اللہ العظمی شیخ عبدالکریم حائری یزدی کی زیرنگرانی تعلیم حاصل کی۔ جب آیت اللہ حائری اراک سے قم تشریف لائے تو امام خمینی بھی اپنے استاد گرامی کے ہمراہ مذہبی شہر قم منتقل ہو گئے۔ وہاں انھوں نے آیت اللہ حائری کے علاوہ آیت اللہ شاہ آبادی اور آیت اللہ بروجردی سے کسب فیض کیا۔ آپ اپنے علمی ذوق وشوق اور اپنی غیر معمولی لیاقت کی بدولت بہت جلد اجتہاد کے بلند درجہ پر فائز ہو گئے۔[۱]

ابھی آپ نوجوان ہی تھے کہ آپ کی علمیت وقابلیت اور ذہانت کے چرچے عام ہو گئے۔آپ قم کی دینی درس گاہ میں فلسفہ، فقہ اور اصول فقہ کا درس دیا کرتے تھے۔ آیۃ اللہ حائری یزدی کی وفات کے بعد امام خمینی کا درس فلسفہ حوزۂ علمیہ، قم میں سب سے بڑا تدریسی حلقہ ہوا کرتا تھا جس میں پانچ سو سے زائد طلبہ کسبِ فیض کے لئے حاضر ہوتے تھے۔

رضا شاہ پہلوی کی ظالم و جابر حکومت سے آپ کے اختلاف کی وجہ صرف اور صرف اس کے غیر

---

۱. Biography & Bibliography of Imam Khomeini. Tehran, pp.7-9 اور رسالہ ''راہ اسلام'' شمارہ ۱۸۵ ص ص ۷۔ ۸

اسلامی اور غیر انسانی قوانین تھے۔ اس نے قانون سے اسلام لفظ کو خارج کر دیا اور قرآن سے حلف برداری کی رسم کو ختم کر دیا۔ چنانچہ تمام علماء نے اس کی مخالفت کی لیکن جو شخص اس تحریک میں سب سے آگے آگے تھا وہ تھے امام خمینی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ۔ آپ نے اپنی بے پناہ شجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑی بے باکی سے استعمار اور اس کی کٹھ پتلی رضا شاہ کی حکومت کے خلاف آواز بلند کی اور اپنی شعلہ بار تقریروں کے ذریعہ ایرانی عوام کو خواب غفلت سے بیدار کر دیا۔ یہ سب باتیں حکومت وقت کو کس طرح بھاتیں۔ چنانچہ حکومت نے آپ کو جلا وطن کر دیا۔ جلا وطنی کے زمانہ میں آپ ترکی، عراق اور فرانس میں رہے، لیکن بالآخر فتح حق کی ہوئی اور امام خمینی نے تقریباً پندرہ سال کی جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے کے بعد یکم فروری ۱۹۷۹ء کو ایران کی سرزمین پر قدم رنجہ فرمایا۔ اور اس طرح ظالم و جابر رضا شاہ کے بھاگنے کے بعد اس دنیا میں سیکڑوں برس کے بعد ایک بار پھر اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔امام خمینی نے تقریباً ساڑھے دس سال تک ایران میں اسلامی حکومت کی قیادت و رہبری فرمائی۔ امام خمینیؒ ۳؍جون ۱۹۸۹ء کو اس دارفانی کو الوداع کہہ کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے، لیکن اپنے پیچھے ایک اعلیٰ فکر و فلسفہ سے لبریز علمی خزانہ کتابوں کی شکل میں اور عملی تدبر چھوڑ گئے اور یہ گرانقدر کتابیں رہتی دنیا تک عالم انسانیت کے لئے علم وعرفان کی روشنی پھیلاتی رہیں گی۔

امام خمینی نے عربی و فارسی زبانوں میں تقریباً ۲۵ کتابیں تالیف کیں۔جو فقہ، اصول، حدیث، فلسفہ،عرفان، اخلاق،عقائد اور تفسیر کے موضوعات پر مشتمل ہیں۔ یہاں ہم اختصار کی خاطر صرف چند کا ذکر کریں گے۔

۱۔کتاب البیع : یہ کتاب عربی زبان میں ہے اور پانچ جلدوں میں ہے۔ اس کتاب میں جو بحثیں کی گئی ہیں، اس کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب اسلامی احکام حقوق کی انسائیکلوپیڈیا ہے۔

۲۔تحریر الوسیلۃ : یہ کتاب بھی عربی زبان میں ہے اور ۳ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کی اصل آیت اللہ سید ابوالحسن اصفہانی کی کتاب وسیلۃ النجاۃ ہے جس پر امام خمینی کی تعلیقات ہیں۔ علاوہ ازیں آپ نے اس میں کچھ ایسے ابواب جو وسیلۃ النجاۃ میں نہیں تھے مثلاً

کتاب الحج و الجہاد و، والامر بالمعروف ونہی عن المنکر، الحدود و القصاص والدیات کا اضافہ فرمایا۔ آپ نے یہ کتاب ترکی میں اپنی جلا وطنی کے زمانہ میں تالیف کی تھی۔[۱]

۳۔المکاسب المحرمۃ : یہ کتاب بھی عربی زبان میں ہے۔ اس کتاب کا موضوع فقہ ہے اور یہ دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ امام خمینیؒ اپنے علمی اسلوب کی بناء پر فقہاء کے درمیان ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ نے یہ کتاب استاذ الفقہاء و المجتہدین الشیخ الاعظم الشیخ مرتضیٰ انصاری کی مشہور ومعروف کتاب ''المکاسب'' کے نہج پر تالیف کی ہے جس میں مفید اضافے اور عمدہ تحقیقات شامل ہیں۔

۴۔شرح چہل حدیث : اس کتاب میں چالیس احادیث کی شرح بہت مفصل اور مبسوط طریقہ سے کی گئی ہے۔ اصلاً یہ کتاب فارسی میں ہے لیکن اس کی مقبولیت کے پیش نظر اس کے عربی و اردو زبانوں میں ترجمے ہوکر منظر عام پر آچکے ہیں۔

رسول اللہؐ کی مشہور حدیث '' من حفظ علی امتی اربعین حدیثاً و ینتفعون بھا بعثه الله یوم القیامة فقیهاً عالماً'' کو مدنظر رکھتے ہوئے متعدد علماء نے چالیس حدیثوں کو جمع کر کے ان کی شرح کی ہے۔ شیخ آغا بزرگ تہرانی نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف الذریعہ الی تصانیف الشیعہ میں چوتھی صدی ہجری سے لے کر چودھویں صدی ہجری تک کے علماء وفقہاء ومحدثین کی ۷۷ ایسی کتابوں کا تذکرہ کیا ہے جن کا نام الاربعون حدیثاً یا چہل حدیث ہے[۲] جو مختلف موضوعات پر مشتمل ہیں۔ مثلاً کسی کا موضوع مناقب فقراء ہے تو دوسری کا امامت، کسی کا موضوع فضائل امیر المؤمنینؑ علی بن ابی طالب ہیں تو کسی کا احکام و اخلاق۔ اسی طرح کوئی فضیلت علم کی حامل ہے تو کوئی طب سے مخصوص ہے۔

امام خمینی کی شرح چہل حدیث کے عربی مترجم محمد العزوی نے اپنے مقدمہ میں عدد اربعین کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا یہاں ذکر کرنا قارئین کے لئے یقیناً دلچسپی کا باعث ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں :[۳]

۱۔ المکاسب المحرمۃ مقدمہ ص ۷، ۲۔الذریعہ جلد ۱، ص ۴۰۱، تہران ۱۹۸۷ء ۳۔الاربعون حدیثاً مقدمہ دار الکتاب الاسلامی، قم، ایران

"لا يعرف احد السرالدفين فی عدد الأربعين و فلسفته الوجودية و امتيازه على الاعداد الأخرى و الارقام الثانية، حيث نواجه فی الأحاديث الماثورة عن رسول اللهؐ وأهل بيته الكرام، تركيزاً كثيراً فی شتى المجالات و المواضيع على هذا العدد : "الأربعين" بالذات ممّا يسترعى الانتباه والوقوف امام هٰذه الظاهرة الفريدة بين الاعداد والأرقام۔ كماأن القرآن عند سرده لقصص بعض الانبياء العظام يؤمي الىٰ دور هٰذا العدد فی حياة النبی عليه السلا م۔"

ترجمہ: ''کوئی شخص بھی عدد اربعین کے مدفون و پوشیدہ راز اس کے وجودی فلسفہ اور دوسرے اعداد پر اس کے امتیاز کو نہیں جانتا جبکہ ہم رسولؐ اللہ اور ان کے اہل بیت کرام کی احادیث میں اس عدد کے بارے میں مختلف مقامات پر بہت زیادہ زور پاتے ہیں جس سے دوسرے اعداد کے درمیان اس عدد کی اہمیت کی طرف توجہ مبذول ہوتی ہے۔ پھر قرآن مجید بھی انبیاء عظام کے واقعات بیان کرتے وقت نبی علیہ السلام کی زندگی میں اس عدد کے رول کی طرف اشارہ کرتا ہے۔''

فاضل مترجم کی یہ بات واقعاً قابل غور ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے آیات قرآنی اور احادیث رسول و ائمہ معصومین بھی پیش کی ہیں، جن کا یہاں ذکر باعث تطویل ہوگا۔ علاوہ ازیں ان کا یہ اشارہ بھی بڑا لطیف ہے کہ امام خمینی نے اس کتاب کی تالیف ایران میں اسلامی انقلاب کی کامیابی سے تقریباً چالیس سال قبل کی تھی، کیونکہ امام نے کتاب کے آخر میں لکھا ہے : مؤلف فقیر کے دست فانی سے عصر بروز جمعہ ۴ محرم الحرام ۱۳۵۸ھ کو یہ رسالہ تمام ہوا۔ ۱۳۵۸ھ، ۱۹۳۹ء کے مطابق ہے اور ایران میں اسلامی انقلاب کی کامیابی ۱۹۷۹ء میں انجام کو پہنچی۔ اس حساب سے اسلامی انقلاب سے تقریباً چالیس سال قبل امام خمینی نے شرح چہل حدیث کی تکمیل کی تھی۔

امام خمینی کی اس کتاب پر گفتگو سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ وضاحت کر دی جائے کہ شیعوں کے نزدیک حدیث کی کیا تعریف ہے؟ اس سلسلہ میں موجودہ دور کے ایک ہندوستانی شیعہ عالم مولانا سید ذیشان حیدر جوادی کی کتاب اصول علم الحدیث سے چند اقتباسات پیش ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :[1]

۱۔ اصول علم الحدیث، ص ۲۲ تا ۲۴

''.......اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ ہونا چاہیئے کہ ائمہ معصومین کے جملہ ارشادات، احادیث رسولؐ ہی کی حیثیت رکھتے ہیں اور رسول اکرمؐ کے ارشادات سے ہٹ کر ان حضرات کا کوئی بیان نہیں ہے۔...... اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ائمہ معصومین نے بار بار اس حقیقت کا اعلان فرمایا ہے کہ ''حدیثنا حدیث جدّنا'' ہماری حدیث درحقیقت ہمارے جد کی حدیث ہے اور ہمارا ہر بیان رسول اکرمؐ کے بیان پر مبنی ہے۔....... کتب شیعہ میں اگر سلسلہ حدیث ائمہ معصومین پر رک جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ یہ ائمہ معصومین کے ذاتی خیالات یا ارشادات ہیں بلکہ درحقیقت یہ سب احادیث رسولؐ ہیں جن کا اظہار ائمہ معصومین کی زبان سے ہوا ہے اوران میں خود حضرات ائمہ کا کوئی دخل نہیں ہے۔..... واضح لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح کتب احادیث میں صاحب کتاب سے لے کر رسول اکرم تک راویوں کو دیکھا جاتا ہے اور آج کے دور سے امام بخاری یا شیخ کلینی کے دور تک کے راویوں کا حساب نہیں کیا جا تاہے، کہ یہ کتابیں قطعی طور پر اپنے مؤلفین کی ہیں اور ان کی اشاعت کے بعد سے اب ان کی سند کی کوئی ضرورت نہیں رہ گئی ہے۔صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ صاحب کتاب سے لے کر صاحب حدیث تک کی سند کا جائزہ لے لیا جائے اور روایت کے اعتبار یا عدم اعتبار کا فیصلہ کر دیا جائے۔..... اسی طرح مذہب شیعہ میں روایت کا سلسلہ صاحب کتاب سے امام معصوم تک دیکھا جا سکتا ہے اور اس کے بعد مزید تحقیق کی ضرورت نہیں ہوتی ہے کہ یہ بات مسلمات میں شامل ہے کہ معصوم کا بیان رسول اکرمؐ کا بیان ہے اور ان دونوں کے درمیان کا سلسلہ معصوم ہے لہٰذا کسی تحقیق وتفتیش کا محتاج نہیں ہے۔''

اس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شیعوں کے نزدیک حدیث امام معصوم بھی حدیث رسول اکرمؐ کے زمرہ میں آتی ہے۔

جیسا کہ پہلے مذکور ہوا کہ رسول اکرمؐ کی حدیث اربعین کو ملحوظ رکھتے ہوئے متعدد علماء فقہاء اور محدثین نے اربعون حدیثاً یا چہل حدیث کے نام سے کتابیں تالیف کیں۔لیکن تقریباً یہ سبھی کتابیں کسی ایک مخصوص موضوع کی احادیث پر مبنی ہیں۔کسی کتاب میں فضائل امیر المؤمنین حضرت علی بن ابی طالبؑ

سے متعلق حدیثیں جمع کی گئی ہیں تو کسی کا موضوع احکام و اخلاق ہے تو کسی کا طب وغیرہ، لیکن امام خمینی کا یہ انتخاب کئی جہات سے مذکورہ بالا کتابوں سے مختلف و ممتاز ہے۔ ان کی اس تالیف کے ذریعہ امام خمینی کی شخصیت بحیثیت ایک عمدہ شارح حدیث کے ہمارے سامنے آتی ہے۔ اتنی مبسوط شرحیں شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ شرح کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب مختلف موضوعات پر مستقل مقالے ہیں جن کا سرنامہ اس موضوع سے متعلق حدیث کو بنایا گیا ہے۔ انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں جو باتیں کارآمد ہیں بیشتر اس کتاب میں مل جاتی ہیں۔ آیۃ اللہ خمینی اس کے مقدمہ کے شروع میں لکھتے ہیں :[۱]

''یہ بندۂ ناچیز وضعیف ایک مدت سے یہ سوچا کرتا تھا کہ اہل بیت عصمت و طہارت علیہم السلام کی ان احادیث میں سے جو علماء رضوان اللہ علیہم اجمعین کی معتبر کتابوں میں درج ہیں ان میں سے چالیس حدیثوں کو اکٹھا کر کے ان کی ایسی شرح کروں جو عوام الناس کی حالت سے مناسب ہو۔''

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا کہ امام خمینی کے اس انتخاب میں کسی ایک مخصوص موضوع پر احادیث نہیں ہیں بلکہ اس میں ہمیں مختلف و متعدد مباحث ملیں گے مثلاً بعض آیات قرآنی کی تفسیر، اصول دین، اخلاق اور بعض ان مشہور روایات کی تشریح جن کا فہم و ادراک عام لوگوں کے لئے دشوار ہے۔ حضرت امام نے اس کتاب میں حدیث شریف کا مطالعہ مختلف و متعدد زاویوں سے کیا ہے۔ مثلاً احکام فقہیہ، عرفانیہ، فلسفیہ، لغویہ اور علم اصول فقہ۔ اس طرح انھوں نے اس مطالعہ کو کسی ایک زاویہ تک محدود نہیں کیا ہے۔ احادیث کے موضوعات اس طرح ہیں :

۱۔ جہاد نفس : یہ پہلی حدیث ہے۔

امام خمینی نے اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے نفس کے تین مقام متعین کئے ہیں :

(الف) مقام اول : مملکت ظاہری یعنی بدن

(ب) مقام دوم : مملکت باطنی

(ج) مقام سوم : مقام عقل

۱۔ مقدمہ شرح چہل حدیث

ان مقامات میں سے دو کی شرح بیان فرمائی ہے اور تیسرے کی چھوڑ دی ہے۔ وہ آخر میں لکھتے ہیں:
''میں چاہتا تھا کہ نفس کے مقام سوم اور اس کی کیفیت جہاد کا بھی ذکر کروں اور شیطان کی مکاریوں کا ذکر کروں لیکن میں نے مناسب نہیں سمجھا اس لئے اس سے صرف نظر کر کے خداوند عالم سے تائید و توفیق کا طلبگار ہوں کہ اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ لکھ سکوں۔''

۲۔ریاکاری: اس ضمن میں آپ نے عقائد میں ریاکاری، اخلاق میں ریاکاری اور اعمال میں ریاکاری کی برائیوں کی طرف روشنی ڈالی ہے۔

۳۔عُجب یا خود پرستی: اس ذیل میں خود پسندی کے درجات، اہل فساد و کفر کی خود پسندی، خود پسندی کے مفاسد اور خود پسندی کے منشا سے بحث کی گئی ہے۔

۴۔تکبر: چوتھی حدیث کا عنوان تکبر ہے۔ اس میں خود پسندی اور تکبر کا فرق، تکبر کے درجات، علماء وفقہا، حکما اور صوفیا کا تکبر، تکبر کے مفاسد، تکبر کے اسباب اور تکبر کے علاج پر سیر حاصل بحث ہے۔

۵۔حسد: اس میں بعض موجبات حسد کا تذکرہ، مفاسد حسد، اخلاقی مفاسد کی جڑیں اور حسد کے علمی و عملی علاج پر بہت وقیع و دلآویز بحث ہے۔

۶۔حب دنیا: اس حدیث کی شرح میں دنیا و آخرت کے معنی، انسان کے دل میں محبت دنیا کے زیادہ ہونے کا سبب، قلب کے اندر دنیوی حظوظ کے برے اثرات اور آخر میں جمیل مطلق کی طرف فطری عشق اور کمال طلبی کی فطرت کے بارے میں مفصل اور سیر حاصل بحث ہے۔

۷۔غضب یا غصہ: اس عنوان کے تحت بھی بہت دلچسپ اور مفید بحث کی گئی ہے۔ جس میں قوت غضبیہ کے فوائد، غضب کی زیادتی کے نقصانات، غصہ کا پی جانا اور غصہ کا علاج شامل ہیں۔

۸۔عصبیت: اس ذیل میں ممدوح و مذموم عصبیت، عصبیت کے نقصانات، تعصب کی ملکوتی صورت اور اہل علم کی عصبیت اور اس کی برائیوں کے بارے میں بڑی عمدہ بحث ہے۔

۹۔نفاق: نویں حدیث کا موضوع نفاق ہے، جس میں قولی و عملی نفاق، نفاق کے مراتب، نفاق کی

ملکوتی صورت، نفاق کا علمی و عملی علاج اور خدا سے نفاق کے بارے میں لوگوں کو خوبصورت و دلآویز ڈھنگ سے آگاہ کیا گیا ہے۔

۱۰۔خواہش و درازی آرزو : اس موضوع کے تحت حدیث کی تشریح کرتے ہوئے آپ نے خواہشات نفس کی پیروی کرنے والوں کی مذمت، گوناگوں خواہشات نفسانی اور راہ حق کے ذریعہ ان کی روک تھام، درازی آرزو کی مدت وغیرہ پر عارفانہ طریقہ سے بحث کی ہے۔

۱۱۔فطرت : اس حدیث کی شرح میں فطرت کے معنی ،احکام فطرت کی تشخیص، اصل وجود مبداء عقیدہ کا فطری ہونا، کمال مطلق کا عشق تمام علائق و اشتیاق کا محور ہے، توحید کا فطری ہونا اور معاد کا عقیدہ فطری ہے، کے ذیل میں بڑی فلسفیانہ اور عالمانہ بحثیں ہیں۔

۱۲۔تفکر: اس میں فکر کی تعریف بیان کرنے کے بعد تفکر کی فضیلت، ذات حق کے بارے میں ممدوح وممنوع تفکر، آفرینش میں تفکر، لطائف صنعت اور دقائق خلقت کے بارے میں تفکر، احوال نفس کے بارے میں غور وفکر، نماز شب کی فضیلت اورتقویٰ عامہ پر منطقی انداز سے عارفانہ بحثیں کی گئی ہیں۔

۱۳۔توکل : اس میں توکل کے معنی اور اس کے درجات، توکل و رضا کا فرق اورتفویض و توکل وثقہ کا فرق بہت عمدہ طریقہ سے واضح کیا گیا ہے۔

۱۴۔خوف ورجا: اس حدیث کی تشریح میں انسان عارف کے یہاں خوف و رجا،خوف و رجا کے مراتب، رجا وغرور کا فرق اور رجا میں توازن اور خوف کی حکمت پر سیر حاصل گفتگو ہے۔

۱۵۔مومنوں کا امتحان و آزمائش : اس حدیث کی تشریح میں امتحان کے معنی اور اس کا نتیجہ، انبیاء اولیاء اور مومنوں کی آزمائش، انبیاء کے جسمانی امراض میں مبتلا ہونے کے ذکر کے ساتھ ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا دارثواب وعقاب نہیں ہے۔

۱۶۔صبر : اس موضوع کے تحت حدیث کی شرح میں خواہشات کی اطاعت،شہوتوں کی پیروی کی برائیوں کے ساتھ صبر کا مطلب، اس کے فوائد ونتائج،صبر کے درجات اور اہل معرفت کے درجات صبر کا بیان ہے۔

۱۷۔توبہ : اس میں حقیقت توبہ، شرائط توبہ، استغفار کے نتائج اور توبہ نصوح کا مطلب بڑے عارفانہ طریقہ سے سمجھایا گیا ہے۔

۱۸۔ذکر خدا : اس حدیث کی شرح کے ذیل میں خدا کے احاطۂ قیومی، ذکر خفی کی فضیلت، محبت فی اللہ کا مرتبہ، منزل تفکر و تذکر کا فرق، قبولیت اعمال کے معیار کے سلسلہ میں عرفانی بحثیں ہیں۔ اس کے علاوہ فضیلت ذکر میں دوسری احادیث بھی پیش کی گئی ہیں۔

۱۹۔غیبت : غیبت جو ایک بہت بڑی برائی ہے، اس کے بارے میں امام خمینی نے اس کے نقصانات پر سیر حاصل بحث کی ہے جس میں غیبت کی حقیقت ،قولی وغیرقولی غیبت پر بحث، غیبت کا گناہ، غیبت کا اجتماعی ضرر، غیبت کا علاج علاوہ ازیں ان مقامات کا بھی ذکر ہے جہاں غیبت جائز ہے لیکن یہ بتایا گیا ہے کہ وہاں بھی غیبت نہ کرنا اولیٰ ہے۔

۲۰۔اخلاص و نیت : اس ذیل میں خلوص کی تعریف مختلف علماء وعرفاء کی آراء کی روشنی میں، عمل کے بعد کا خلوص اور حقیقی توحید پر بہت سبق آموز بحث کی گئی ہے۔

۲۱۔شکر : اس سلسلہ میں رسول اکرمؐ کی بخششوں کی عرفانی توجیہ، شکر کی حقیقت، شکر کے مرتبے، اولیاء کا شکر حمد وشکر اور طٰہ کے معنی کی تحقیق پر سیر حاصل بحث ہے۔

۲۲۔موت سے کراہت : موت سے کراہت کی وجہ، تصدیق عقلی و ایمان قلبی کا فرق، جنت و دوزخ کے موجود ومخلوق ہونے کا اختلاف اور شیطان کی گمراہ کن چالوں پر بڑی عمدہ بحث کی گئی ہے۔

۲۳۔اقسام طالبان علم : یہ امام صادقؑ کی حدیث ہے کہ طالبان علم کی تین قسمیں ہیں : ایک تو وہ جو جہالت و جھگڑے کے لئے علم حاصل کرتے ہیں،دوسرے وہ جو اپنی برتری جتانے اور دھوکہ دینے کے لئے علم حاصل کرتے ہیں اور تیسری وہ جو دانش وبینش کے لئے علم حاصل کرتے ہیں۔....الخ۔ انہی کی شرح اقسام طالبان علم میں کی گئی ہے۔

۲۴۔اقسام علم : رسولؐ خدای حدیث ہے کہ علم صرف تین ہیں : ایک آیۃ محکمۃ کا علم، دوم فریضۂ

عادلہ کا علم اور سوم سنت قائمہ کا علم۔ امام خمینیؒ نے علم کی بڑے عالمانہ اور فاضلانہ طریقہ سے شرح کرتے ہوئے نفع بخش علوم کی تقسیم کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ علوم انبیاء کا انحصار یہی علوم سہ گانہ ہیں۔ اس کے علاوہ حدیث نبوی کی علوم سہ گانہ سے تطبیق، تقسیم علوم میں حدیث نبوی کی تطبیق وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے۔

۲۵۔شک و وسوسہ : جو لوگ نماز، وضو اور غسل و طہارت کے سلسلہ میں شکوک و وساوس کے شکار ہوتے ہیں، ان کے لئے یہ حدیث اور اس کی شرح نہایت مفید اور کارآمد ہے۔ جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ وسوسہ اور شک شیطانی القائیات ہیں۔ پھر اس کے علمی و عملی علاج کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

۲۶۔طالب علم : اس حدیث کی شرح میں علم کی فضیلت، علوم دنیوی و اخروی کا فرق اور طالب علم کے اعلیٰ مرتبہ کو بیان کیا گیا ہے۔

۲۷۔حضور قلب : اس حدیث شریف کی شرح میں دوران عبادت فراغت وقت و قلب، حضور قلب کے فوائد، حضور قلب کے مراتب، حضور قلب کے حصول کا طریقہ اور استخفاف نماز کی برائیوں پر مفصل بحث کی ہے۔

۲۸۔لقاء اللہ : اس حدیث کی تشریح میں لقاء اللہ کی کیفیت، احاطۂ قیومی حق کا مشاہدہ، خدا اور اس کے اسماء و صفات کی معرفت، موت کے وقت کے حالات اور خدا سے محبت و بغض کے مطلب پر عرفانیات سے لبریز بحث ہے۔

۲۹۔وصیۃ النبی لعلی : یہ رسول اکرمؐ کی حضرت علیؑ کے لئے وصیت ہے جس میں احکام شرعیہ کو بیان کیا گیا ہے، جن میں جھوٹ کے مفاسد، تقویٰ کی حقیقت، خیانت کے مفاسد، خوف خدا، نوافل کی تعداد، تلاوت قران کی فضیلت، رفع یدین، مسواک کی فضیلت، اخلاقی اچھائیوں اور برائیوں وغیرہ کا ذکر ہے۔

۳۰۔اقسام قلوب : اس حدیث کی شرح میں اصلاح نفس کی ترغیب، تقسیم قلوب، قلوب کے حالات، قلب مومن و قلب منافق کے فرق پر عرفانی بحثیں ہیں۔

۳۱۔حقیقی معرفت خدا و رسول و ائمہ معصومینؑ : امام محمد باقرؑ کی حدیث ان الله عزوجل لا یوصف و کیف یوصف الخ کی تشریح کرتے ہوئے امام خمینیؒ نے فلسفیانہ طریقہ سے کلامی و عرفانی بحث کی ہے۔

۳۲۔یقین و رضا : امام جعفر صادقؑ کی حدیث'' من صحة یقین المرء المسلم ان لا یرضی الناس بسخط الله ولا یلومهم علی مالم یوته الله.. ۔ الخ یعنی مسلمان مرد کے صحیح یقین کی علامت یہ ہے کہ خدا کو ناراض کر کے لوگوں کو راضی نہ کرے اور خدا نے اس کو جو نہیں دیا ہے اس پر لوگوں کی ملامت نہ کرے۔۔ ۔ الخ۔ کی تشریح میں روزی کے مقدر ہونے، یقین کی علامتیں اور رزق مقسوم کے بارے میں اشاعرہ، معتزلہ اور شیعہ نظریات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

۳۳۔ولایت اہل البیت علیہم السلام : اس حدیث کی تشریح میں امام نے یہ بتایا ہے کہ قبولیت اعمال کی شرط ولایت ہے۔

۳۴۔مقام مومن : اس حدیث کی تشریح میں خدا کے نزدیک مومن کے مقام پر شیخ [۱] بہائی، محقق طوسی [۲] اور علامہ مجلسی [۳] کے اقوال کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔

۳۵۔اسماء حق کی معرفت اور مسئلہ جبر و تفویض : اس حدیث کی تشریح میں اسماء حق سبحانہ و تعالیٰ کے دو مقام یعنی مقام اسماء و صفات ذاتیہ اور مقام اسماء و صفات فعلیہ کا بیان نیز مسئلہ جبر و تفویض پر بحث ہے۔

۳۶۔صفات حق : اس حدیث کی شرح میں عینیت ذات و صفات، صفات حق کی تقسیم میں حکماء کا کلام، بیان علم قبل الایجاد، سمیع و بصیر کا مطلب اور صفات ثبوتیہ و سلبیہ کا ذکر فلسفیانہ اور عارفانہ طریقہ سے کیا گیا ہے۔

۱۔ شیخ بہاء الدین محمد بن حسین بن عبد الصمد (۹۵۲۔۱۰۰۲ھ)۔

۲۔ محمد بن حسن طوسی (۵۹۷۔۶۷۲ھ) جو خواجہ نصیر اور محقق طوسی کے لقب سے مشہور ہیں، اسلام کے معروف ترین حکماء و، دانشوروں میں تھے۔ آپ کی تصانیف میں تجرید، تحریر اقلیدس، تحریر مجسطی اور اخلاق ناصری مشہور ہیں۔ ۳۔ ملا محمد باقر بن ملا محمد تقی مجلسی اصفہانی (۱۰۳۷۔۱۱۱۱ھ) شیعوں کے بزرگ ترین علماء میں سے تھے۔ بہت سے علوم میں مہارت کامل رکھتے تھے۔ آپ کی کتابوں میں بحار الانوار، مراۃ العقول، حیاۃ القلوب، زاد المعاد، حلیۃ المتقین اور الاربعون حدیث قابل ذکر ہیں۔

۳۷۔معرفت خدا و رسولؐ : اس شرح میں علم و عرفان کا فرق، اعرفو اللہ کا مطلب، اس سلسلے میں علماء کی آراء، سیر عقلی و علمی و عرفانی اور کلام ائمہ کی جامعیت پر بحث کی گئی ہے۔

۳۸۔آدم کی تخلیق خدا کی صورت پر : اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُورَۃٖ کی تشریح میں فلسفہ صورت کے مختلف معانی کا بیان اور صورت خدا پر تخلیق کے مطلب پر بحث ہے۔

۳۹۔خیر و شر : اس میں خیر و شر کی تحقیق اور اس کے بارے میں علامہ مجلسی کے قول اور مذہب حکماء و متکلمین پر فلسفیانہ بحث ہے۔

۴۰۔تفسیر سورۂ توحید و ابتدائی آیات سورۂ حدید : اس سے پہلے بھی گیارہویں حدیث کی تشریح میں عرفانی انداز سے سورۂ توحید کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ اس حدیث کی شرح میں بھی سورۂ توحید کی تفسیر کی طرف مختصراً اشارہ کے ساتھ اس سورۂ کی عظمت سورۂ حدید کی آیتوں کے بارے میں ملا صدرا کا بیان[۱]، بسم اللہ کے معنی ،ھو وصمد کا مطلب اور سورۂ حدید کی اجمالی تفسیر شامل ہے۔

اس فہرست سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کتاب کا ھدف وعظ ونصیحت، تعلیم و ارشاد، اخلاق حسنہ اور زہد وتقویٰ اختیار کرنے کی ترغیب ہے۔ مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ اول و آخر ہدف السیر الی اللہ تعالیٰ سبحانہ ہے۔

کتاب میں متعدد مقامات پر علماء سلف کی تشریحات و توضیحات سے بھی استفادہ کیا گیا ہے جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے، جن میں شیخ صدوق، شیخ بہائی، مرحوم شاہ آبادی[۲]، علامہ مجلسی، محقق طوسی، ملا صدرا، خواجہ عبداللہ انصاری[۳]، اور شہید ثانی[۴]، قابل ذکر ہیں۔

۱۔محمد بن ابراہیم شیرازی (۹۷۹ھ۔۱۰۵۰ھ) ملقب بہ صدا الدین وصدر المتألہین معروف بہ صدرا و ملا صدرا۔ ان کا شمار بزرگ حکماء اسلامی میں ہوتا ہے۔ فلسفہ میں بے مثال آراء کے مالک ہیں۔ آپ کے بعد کے اکثر حکماء اسلام آپ ہی کے مکتب کے پیرو شمار کئے جاتے ہیں۔ آپ کی سب سے اہم تصنیف اسفار اربعہ ہے جس میں وسیع پیمانہ پر آپ کے نظریات موجود ہیں۔ دیگر تصانیف میں تفسیر القرآن، شرح اصول کافی، مبداء و معاد اور مفاتیح الغیب وغیرہ ہیں۔ (شرح چہل حدیث اردو ترجمہ، ص ۲۷۹)

۲۔شیخ عارف کامل محمد علی شاہ آبادی، ۳۔خواجہ عبداللہ بن محمد انصاری (۳۹۶ھ۔۴۸۱ھ) محدثین عرفاء میں سے تھے ان کے آثار میں منازل السائرین ۔ زاد العارفین اور رسالہ دل و جان قابل ذکر ہیں۔ شرح چہل حدیث، ص ۲۷۸ ۴۔شیخ زین الدین شہید ثانی جنہوں نے فقہ کی مشہور کتاب اللمعہ کی شرح کی جو آج بھی شیعہ مدارس میں پڑھائی جاتی ہے۔ علم الدرایہ کے موضوع پر ''الرعایہ فی علم الدرایہ'' آپ کی شیعوں میں سب سے پہلی کتاب ہے۔ آپ کی شہادت ۶۵۵ھ میں ہوئی۔ اصول علم الحدیث، ص ۱۵۲۔

ایک مقام پر شیخ صدوق کی روایت سے ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے ان کا اس طرح ذکر کرتے ہیں۔۱

''میں تمہارے لئے شیخ جلیل القدر صدوق طائفہؒ کی ایک حدیث شریف نقل کرتا ہوں تا کہ تم سمجھ لو کہ مطلب کیا ہے؟ اور مصیبت کتنی عظیم ہے؟ حالانکہ یہ حدیث دوزخ سے متعلق ہے جو تمام جہنموں سے سرد تر ہے۔ پہلے تو تم یہ سمجھ لو کہ شیخ صدوقؒ جن کی یہ حدیث ہے وہ بزرگوار ہیں جن کے سامنے تمام علمائے اعلام اپنے کو چھوٹا سمجھتے ہیں۔ اور ان کی جلالت قدر کے قائل ہیں۔ (دوسرے یہ کہ) یہ وہ بزرگوار ہیں جو امام علیہ السلام کی دعا سے پیدا ہوئے ہیں۔ (تیسرے یہ کہ) یہ وہ عظیم شخص ہیں جو امام زمانہ علیہ السلام عجل اللہ تعالیٰ فرجہ کے مورد لطف و کرم رہے ہیں۔اور میں علمائے امامیہ کے بزرگوں سے متعدد طریقوں سے جو شیخ صدوق رحمۃ اللہ علیہ سے متصل ہوتے ہیں اس حدیث کو نقل کرتا ہوں اور ہمارے شیخ صدوقؒ کے درمیان جتنے مشائخ (واسطہ) ہیں وہ سب کے سب بزرگوں میں سے اور اصحاب ثقافت میں سے ہیں۔ لہٰذا اگر آپ مومن ہیں تو اس حدیث پر عقیدت مند رہئے۔''

کتاب میں احادیث کی شرح کرتے ہوئے جگہ جگہ کارآمد و مفید لغوی بحثیں بھی کی گئی ہیں۔ لغت کی شرح میں اکثر مقامات پر اسماعیل بن حماد الجوہری ۲ (۳۳۲۔ ۳۹۳ھ) کی کتاب الصحاح کا حوالہ بھی دیا گیا ہے۔ جو کتب لغت کی مشہور ترین کتابوں میں سے ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹ویں حدیث کی شرح کرتے ہوئے غیبۃ و اغتیاب کے بارے میں لکھتے ہیں ۳، حدیث اس طرح ہے:

عَنِ السّکوني‌م عن ابي عبدالله، عليه السلام، قال قال رسول الله صلى الله عليه وآله : الغيبة اسرع في دين الرجل المسلم من الاكلة فی جوفه"

"قال و قال رسول الله صلى الله عليه وآله :الجلوس فی المسجد انتظار الصلاة عبادة مالم يحدث۔ قيل : يا رسول الله ومايحدث۔ قال الاغتياب۔''

ترجمہ: سکونی کا بیان ہے: حضرت امام صادقؑ نے فرمایا: رسولؐ خدا کا ارشاد ہے:''مسلمان کے دین میں غیبت مرض ''اکلہ'' سے زیادہ سریع ہے اور یہ بھی فرمایا کہ: رسولؐ خدا نے فرمایا ہے: نماز کے

۱۔ حدیث نمبر ۱، ص ۴۴، ۲۔ الجوہری اہل لغت ادیبوں کا پیشوا ہے کلام و اصول میں بھی متبحر تھا۔ ۳۔شرح چہل حدیث اُردو ترجمہ، ص ۳۸۳

انتظار میں مسجد میں بیٹھنا عبادت ہے جب تک احداث نہ کرے۔ پوچھا گیا: اے رسولؐ خدا کس چیز کا احداث نہ کرے؟ فرمایا غیبت کا۔

شرح : غیبت ''غاب'' کا مصدراور ''اغتیاب'' کا (اسم) مصدر ہے جیسا کہ لغت میں ہے قال الجوہری:

"اغتابه اغتياباً، اذا وقع فيه، والاسم الغيبة۔ وهو أن يتكلم خلف انسان مستور بما يغمه لو سمعه۔ فان كان صدقاً سمي غيبةً، وإن كان كذباً سمي بهتاناً۔

جوہری نے کہا جب کوئی کسی کی برائی کرے تو اغتابہ اغتیابا بولا جاتا ہے اور اس کا اسم مصدر الغیبۃ آتا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی کے پیٹھ پیچھے ایسی بات کرنا کہ اگر وہ سن لے تو اس کو غم ہو۔ اگر وہی کہی گئی بات سچ ہو تو اس کو غیبت اور جھوٹ ہو تو بہتان کہا جاتا ہے۔

محقق محدث مجلسی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں : یہ لغوی معنی ہیں۔ مگر بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوہری نے اصطلاحی معنی بیان کئے ہیں نہ کہ لغوی معنی۔ اس لئے کہ ''غاب'' اور ''اغتاب'' اور اس کی تمام گردانوں کے لغوی معنی یہ نہیں ہیں۔ بلکہ اس سے عام معنی مقصود ہوتے ہیں اور کبھی خود اہل لغت شرعی یا اصطلاحی معنی کو اپنی کتابوں میں ذکر کر دیا کرتے ہیں۔

صاحب قاموس سے منقول ہے کہ ''غاب'' کو ''عاب'' کے معنی میں لیا گیا ہے اور مصباح منیر میں ہے "اغتابه اذا ذكره بما يكرهه من العيوب، وهو حق۔" جب کسی کے ناپسندیدہ عیوب کا ذکر کیا جائے تو ''اغتابہ'' بولا جاتا ہے اور یہی حق ہے۔

میرے نزدیک متن میں ذکر شدہ تمام چیزوں میں سے کوئی بھی معنی لغوی معنی نہیں ہے بلکہ ہر ایک میں ایک قید کا اضافہ کر دیا گیا ہے جس سے اصطلاحی معنی سے اختلاط پیدا ہو گیا ہے۔ بہر حال لغوی معنی کے اطراف میں بحث زیادہ فائدہ مند نہیں ہے۔ سب سے عمدہ بات شرعی موضوع کا حاصل کرنا ہے جو متعلق تکلیف ہے اور بظاہر یہ مورد کچھ ایسے شرعی قیود کا حامل ہے جو فہم عرفی اور معنی لغوی سے الگ ہے۔ اس کے بعد اطراف موضوع کے سلسلہ میں بیان پیش کیا جائے گا۔

("والاكلة"، كفرحة، داء فى العضو يا تكل منه۔ كما فى القاموس وغيره۔ وقد يقر

بمد الهمزة علیٰ وزن فاعلة، ای العلة التی تاکل اللحم۔ والاول اوفق باللغة۔کذا قال المجلسی۔)

اکلۃ فرحۃ کے وزن پرایک مرض ہوتا ہے جو اس کو کھاتا رہتا ہے۔ کمانی القاموس وغیرہ اور کبھی ہمزہ کو مد دے کر''فاعلۃ'' (یعنی آکلۃ) کے وزن پر بھی پڑھا گیا ہے۔ اس وقت مطلب ہوگا وہ بیماری جو گوشت کھاتی ہے۔مگر پہلا مطلب لغت سے زیادہ مناسب ہے جیسا کہ مجلسی نے بھی ذکر کیا ہے۔

بہر حال مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ مرض جب عضو میں خصوصاً اعضائے لطیفہ جیسے باطن میں پیدا ہو جاتا ہے تو اس کو جلدی کھا لیتا ہے اور فنا کر دیتا ہے۔ اسی طرح غیبت انسان کے دین کو اس سے بھی جلدی کھا لیتی ہے اور فاسد و فنا کر دیتی ہے۔

اور'' مالم یحدث''باب افعال سے ہے اور اس میں ضمیر مستتر جالس کی طرف راجع ہے جو اس جلوس سے مستفاد ہے جو اس میں مذکور ہے اور اغتیاب منصوب ہے اور فعل مقدر کا مفعول ہے جو کلام سائل سے مفہوم ہے اور بعض نسخوں میں'' مایحدث'' کے بجائے'' مالحدث'' آیا ہے اس لئے اغتیاب بنا بر خبریت مرفوع ہے۔

کہیں علمائے سلف سے اختلاف بھی کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو بیسویں حدیث کی شرح میں آیۃ کریمہ:

"تَبَارَکَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْکُ وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ اَلَّذِی خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔"

کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:[1]

بلا کے معنی امتحان اور تجربہ کے ہیں۔ جیسا کہ صحاح میں آیا ہے:

''بلوته بلوی، کے معنی جربته اور اختبرته کے ہیں۔ (یعنی میں نے اس کا تجربہ اور اختبار کیا) وبلاه الله بلاء، وابلاه ابلاء حسنا۔ وابتلاه، ای اختبره۔"

''اَیُّکُمْ'' علامہ مجلسی نے فرمایا ہے یہ''لِیَبْلُوَکُمْ'' کا دوسرا مفعول ہے۔ اور''لِیَبْلُوَکُمْ'' علم کے معنی پر متضمن ہے۔مگر یہ درست نہیں ہے کیونکہ'' ای'' استفہامیہ فعل کو عمل کرنے سے معلق کر دیتا

ا۔ شرح چہل حدیث، اردو ترجمہ،

ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ: ''اَیّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلاً'' مبتدا وخبر سے مل کر جملہ ہے اور معنا فعل (بلویٰ) کا مفعول ہے۔ البتہ اگر ایٌ کو موصولہ مان لیا جائے تو علامہ مجلسیؒ کا کلام صحیح ہے۔ مگر ایٌّ کا استفہامیہ ہونا اظہر ہے۔

وعظ ونصیحت سے متعلق چند مثالیں بھی پیش کر دینا ضروری ہیں۔ حالانکہ مثالوں کا انتخاب بہت دشوار ہے مگر پھر بھی چند مثالیں پیش ہیں۔

دوسری حدیث کی شرح میں عبادات میں ریاکاری سے اجتناب اور اخلاص کی دعوت دیتے ہوئے امام لکھتے ہیں: [۱]

''لہٰذا میرے عزیز! اپنے کاموں میں اور زیادہ دقت سے کام لو۔ اپنے نفس سے اپنے ہر عمل کا حساب لو، اور ہر کام سے پہلے اس سے پوچھو کہ اس کا یہ اقدام خیرات اور امور شریفہ کے لئے ہے (یا نہیں)؟ وہ نماز شب کے مسائل کیوں پوچھ رہا ہے؟ وہ مسئلہ سمجھنے کے لئے یا مسئلہ بیان کرنے کے لئے پوچھ رہا ہے؟ یا اپنے کو نماز شب پڑھنے والوں کی شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے؟ وہ آخر اپنے زیارتی سفر کو کیوں کسی نہ کسی طرح لوگوں کے سامنے بیان کرتا ہے؟ انتہا یہ ہے کہ سفر زیارت کی تعداد بھی بتاتا ہے۔ پوشیدہ طور سے دیئے گئے صدقہ کو کیوں کسی پر ظاہر کرتا ہے؟ جس راستہ سے ممکن ہوتا ہے اس کا ذکر کر کے لوگوں کو بتاتا ہے۔ اگر یہ کام خدا کے لئے ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اس کو دیکھ کر دوسرے بھی اس کی پیروی کرنے لگیں اور وہ "الدال علیٰ الخیر کفاعله" کا مصداق بننا چاہتا ہے، تب تو درست ہے۔ اور اس کو اس اقدام پر شکر خدا کرنا چاہئے کہ اس کو خدا نے ایسا صاف ضمیر اور پاک دل عطا کیا ہے۔ لیکن متوجہ رہنا چاہئے کہ کہیں نفس نے اس کو دھوکہ نہ دیا ہو! اور ریاکاری کو تقدس کی صورت میں نہ پیش کیا ہو! لیکن اگر یہ کام خدا کے لئے نہیں ہے تو پھر اس کا اظہار نہیں کرنا چاہئے کیونکہ ایسی صورت میں وہ ''سمعہ'' لوگوں کو سنانے کے لئے ہو جائے گا۔ اور ریاکاری کے شجرہ ملعونہ کا پھل سمعہ ہوتا ہے۔ خداوند منان اس عمل کو قبول نہیں کرتا۔ خدا (اپنے ملائکہ کو) حکم دیتا ہے کہ اس عمل کو سجین میں ڈال دو۔

۱۔ شرح چہل حدیث، اردو ترجمہ، ص ۷۵۔

نفس کی مکاریوں کی برائیوں سے خدا کی پناہ مانگنی چاہئے کیونکہ نفس کی مکاریاں بہت ہی دقیق ہوتی ہیں۔ البتہ ہم کو اجمالاً اتنا ضرور معلوم ہے کہ ہمارے اعمال خالص نہیں ہیں۔ اور اگر ہم (واقعی) خدا کے بندے ہیں تو پھر شیطان کا ہمارے اوپر اتنا قابو کیوں ہے؟ جبکہ اس نے خدا سے عہد کر لیا ہے کہ ''تیرے مخلص بندوں سے کوئی تعلق نہ رکھوں گا اور ان کی طرف ہاتھ بھی نہ بڑھاؤں گا۔''

بیان ایسا ہے کہ جیسے کہ یہ سب ہمارے سامنے کی باتیں ہیں اور ہم اپنے اندر جھانکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

سترھویں حدیث:

"عن معاوية بن وهب، قال سمعت ابا عبدالله، عليه السلام، يقول: اذا تاب العبد توبةً نصوحاً، احبه الله، فستر عليه فی الدنيا والاخرة۔ فقلت: و كيف يستر عليه؟ قال ينسى ملكيه۔ ما كتبا عليه من الذنوب، ثم يوحى الى جوارحه: اكتمى عليه ذنوبه۔ ويوحی الیٰ بقاع الارض، اكتمى عليه ما كان يعمل عليك من الذنوب۔ فيلقى الله حين يلقاه وليس شئی يشهد عليه بشئٍ من الذنوب۔'' کی شرح کرتے ہوئے امام توبہ کے بارے میں لکھتے ہیں:[۱]

''یہ جان لو کہ اہم اور مشکل ترین منازل میں سے (ایک) توبہ ہے۔ توبہ کا مطلب ہے: گناہوں اور نافرمانی کی کدورت کی وجہ سے روحانیت اور فطرت کا نور جو طبیعت کی تاریکی میں چھپ چکا تھا، پھر سے نفس کی روحانیت کی طرف پلٹ آئے۔''

اس اجمال کی بالجملہ تفصیل یہ ہے کہ ابتدائے فطرت میں نفس ہر قسم کے کمال و جمال نور و بہجت سے خالی ہوتا ہے اور ان کے مقابل کی چیزوں سے بھی خالی ہوتا ہے۔ یعنی بالکل ایک سادہ ورق ہوتا ہے، نہ اس میں روحانی کمالات ہوتے ہیں، نہ اس کے مخالف صفات ہوتے ہیں۔ البتہ ہر مقام کے حصول کی لیاقت و صلاحیت اس میں ودیعت رہتی ہے۔ اس کی فطرت استقامت پر اور اس کا ضمیر انوار ذاتیہ سے گویا خمیر کیا ہوتا ہے۔ پھر جب وہ گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں تاریکی پیدا ہونے

۱۔ شرح چہل حدیث، اردو ترجمہ، ص ۳۵۲

لگتی ہے۔ گناہ جتنا زیادہ ہوگا تاریکی اتنی زیادہ ہوگی۔ یہاں تک کہ گناہ کرتے کرتے قلب بالکل تاریک و سیاہ ہو جائے گا اور نور فطرت بجھ جائے گا اور وہ شقی ابدی ہو جائے گا۔ لیکن اگر ان حالات کے درمیان تمام قلب کے سیاہ ہونے سے پہلے وہ خواب غفلت سے بیدار ہو گیا اور بیداری کی منزل کے بعد توبہ کی منزل پر بھی پہونچ گیا، اور اس منزل کے شرائط ''جن کا اجمالاً ذکر کیا جائے گا'' کو بھی پورا کر لیا، تو تاریکی اور فطری کدورت سے نکل کر دوبارہ فطرت اصلی کے نور اور اپنی ذاتی روحانیت کی طرف پلٹ آئے گا اور لوح دل پھر کمالات وان کے اضداد سے خالی ہو جائے گی جیسا کہ حدیث میں مشہور ہے:

"التّائب من الذنب کمن لا ذنب له۔" ''گناہوں سے توبہ کرنے والا اس شخص کے مثل ہے جس نے گناہ ہی نہ کئے ہوں۔''

گناہان کبیرہ اور مہلکات کے ارتکاب کے بعد زیادہ تر انسان توبہ سے غافل ہو جاتا ہے۔ اگر دل کی کھیتی میں گناہوں کا درخت ثمر آور و طاقتور ہو جائے اور اس کی جڑیں مضبوط ہو جائیں تو پھر اس کے نتائج بہت ہی خراب ہوتے ہیں: ان میں سے ایک یہ ہے کہ انسان بالکل ہی توبہ سے منحرف ہو جاتا ہے اور اگر کبھی توبہ کی یاد آ جاتی ہے تو وہ کاہلی اور آج وکل، اس ماہ اور آئندہ ماہ کر کے ٹالتا رہتا ہے اور اپنی جگہ کہتا ہے آخری عمر اور بڑھاپہ میں صحیح توبہ کر لیں گے۔ حالانکہ یہ خدا سے مکاری ہے جس سے وہ غافل ہے: '' وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰاكِرِيْنَ'' (خدا سب سے بہتر مکاری کی توڑ کرتا ہے۔)

یہ گمان نہ کرو کہ گناہوں کی جڑوں کے مضبوط ہو جانے کے بعد انسان توبہ کر سکتا ہے یا توبہ کے شرائط پورے کر سکتا ہے۔ بہار توبہ تو جوانی ہی میں ہے، جب گناہوں کا بار کم، دل کی کدورت قلیل، ظلمت باطن ناقص اور شرائط توبہ سہل و آسان ہوا کرتے ہیں:''

عصبیت وتعصب جو دنیا کی اہم ترین برائیوں میں سے ہے، بلکہ یوں کہا جائے کہ اکثر برائیوں کی جڑ ہے جس کی وجہ سے آج کی دنیا میں جگہ جگہ قتل و غارتگری ہو رہی ہے۔ اس کی طرف امام خمینی اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: [۱]

۱۔ شرح چہل حدیث، اردو ترجمہ، ص ۱۹۶

''فقیر (امام خمینیؒ) عرض کرتا ہے، عصبیت ایک نفسانی و باطنی صفت ہے جس کے آثار میں سے اپنے رشتہ داروں (بلکہ) متعلقین کی حمایت و دفاع کرنا ہے۔ متعلقین میں چاہے وہ لوگ ہوں جو دینی، مذہبی یا مسلکی تعلق رکھتے ہوں یا وطنی و آبی و خاکی تعلق رکھتے ہوں یا کسی اور قسم کا تعلق رکھتے ہوں، سب ہی مراد ہیں۔ مثلاً ہم پیشہ ہوں، استادی شاگردی کا تعلق ہو یا اور کوئی ۔ عصبیت اخلاق فاسدہ اور ملکات رذیلہ میں سے ہے اور اس سے بہت سے اخلاقی و اعمالی مفاسد پیدا ہوتے ہیں۔ عصبیت بذات خود مذموم ہے، چاہے وہ حق کے لئے ہو یا کسی دینی امر کے لئے ہو بشرطیکہ اس کا مقصد اظہار حق نہ ہو۔ بلکہ اس کا مقصد اپنا یا اپنے ہم مسلک یا اپنے سے وابستہ کسی شخص کا غلبہ ہو۔''

امام عصبیت سے اجتناب اور اعمال صالحہ کی ترغیب دیتے ہوئے آگے لکھتے ہیں :

''پس میرے عزیز یہ بات سمجھ لو کہ تعصب شیطان کی صفت ہے اور اس کا مغالطہ اور باطل قیاس اسی حجاب (تعصب) کی بنا پر تھا۔ یہ تعصب ایسا حجاب ہے جو تمام حقائق کو ختم کر دیتا ہے بلکہ تمام رذائل کو محاسن کی صورت میں پیش کرتا ہے اور دوسروں کے تمام محاسن کو عیب بنا کر ظاہر کرتا ہے اور یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ انسان جب تمام چیزوں کو غیر واقعی صورت میں پیش کرے تو اس کا انجام کیا ہوتا ہے؟ یہ عصبیت خود تو ایک ایسی خبیث صفت ہے جو انسان کو ہلاک کر دیتی ہے لیکن خود اس کی وجہ سے اتنے نفسانی رذائل اور اعمالی و اخلاقی مفاسد پیدا ہوتے ہیں کہ ان کا ذکر بھی موجب ملال ہے۔.....اس لئے جو عقلمند انسان اس خبیث صفت کے مفاسد کو سمجھ لے اور صادق مصدوق رسولؐ اکرم و ان کے اہل بیتؑ گرامی کی بات مانتا ہو کہ یہ صفت انسان کو ہلاک کر دیتی ہے اور جہنم رسید کر دیتی ہے، اس کو اس کا علاج کرنا چاہیئے اور اگر خدانخواستہ اس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تعصب ہو تو اپنے کو اس سے پاک کر لینا چاہیئے تا کہ اس دنیا سے عالم آخرت کی طرف جاتے ہوئے پاک و پاکیزہ ہو اور صاف و شفاف نفس کے ساتھ جائے۔ مگر یہ بھی سمجھ لے کہ وقت بہت کم ہے کیونکہ معلوم نہیں موت کب آ جائے؟''

ہر شئی کی بازگشت اللہ کی طرف ہے، وہی مالک حقیقی اور معشوق حقیقی ہے جس سے ہر انسان کو ملنا ہے لہٰذا ہمیں دنیا کی آرائش و زیبائش کے دھوکہ میں نہ آنا چاہیئے اور دنیا پرستی کے جال سے نکل کر

اللہ سے ملاقات کی تیاری کرنی چاہئے۔ گیارہویں حدیث :ا

"عن زرارة، قال سالت أبا عبدالله، عليه السلام، عن قول الله عز و جل : "فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِی فَطَرَ النّٰاسَ عَلَيْهٰا۔" قال فطر هم جميعاً على التّوحيد۔"

کی شرح کرتے ہوئے "وجود خدا فطری ہے" کے ذیل میں لکھتے ہیں :

"ایک وہ فطری بات جو تمام بنی نوع انسان کے خمیر میں شامل ہے اور دنیا کا کوئی بھی فرد بشر اس کی مخالفت نہیں کر سکتا اور نہ عادتوں، مذہبوں، مسلکوں، اخلاق وغیرہ کے اختلاف سے اس میں کوئی تغیر پیدا ہو سکتا ہے اور نہ خلل پیدا ہو سکتا ہے اور وہ ہے فطرتاً کمال سے عشق۔ ہاں تشخیص کمال اور یہ کہ کس چیز میں کمال ہے اور محبوب و معشوق کہاں ہے؟ اس میں البتہ لوگوں میں اختلاف ہے۔ ہر شخص نے اپنے معشوق کو ایک الگ چیز میں پایا ہے۔ اسی کو امیدوں کا مرکز بنایا ہے اور دل و جان سے اس کو چاہا ہے (مثلاً) اہل دنیا، دنیا اور زیبائش دنیا کو کمال سمجھتے ہیں اور اپنے معشوق کو دنیا میں پاتے ہیں۔ لہٰذا اس کے حاصل کرنے کے لئے جان و دل سے عاشقانہ خدمت کرتے ہیں اور جو شخص بھی جس شعبہ میں ہے چونکہ اسی کو کمال سمجھتا ہے لہٰذا اسی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اسی طرح صنعت والے اور اہل علوم اپنے دماغ کی وسعت کے اعتبار سے جس چیز کو کمال سمجھتے ہیں اسی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اسی کو اپنا معشوق سمجھتے ہیں۔اہل آخرت و ذکر و فکر دوسری چیز کو معشوق سمجھتے ہیں.....خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سب کمال کی طرف متوجہ ہیں اور جب اس کمال کو کسی موجود یا موہوم میں مشخص کر لیتے ہیں تو اسی سے عشق کرتے ہیں۔لیکن یہ بھی جان لینا چاہئے کہ ان تمام چیزوں کے باوجود ان میں سے کسی سے محبت و عشق جن کے بارے میں گمان ہے "کہ ان سے محبت کرتا ہے" حقیقی نہیں ہے۔ اور جس کے بارے میں محبت کا خیال ہے وہ معشوق اور کعبۂ امید نہیں ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جو شخص بھی اپنی فطرت کی طرف رجوع کرے گا تو اس کا دل گواہی دے گا کہ وہ شخص جس کی طرف بھی وہ متوجہ ہے اگر اس کو اس سے بالاتر مل گیا تو اس کا دل بالاتر کی طرف پلٹ جائے گا......خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ تمام سلسلۂ بشر چاہے جس رشتہ وطریقہ کا ہو وہ جس درجہ تک پہنچے گا

ا۔شرح چہل حدیث، اردو ترجمہ، ص ۲۳۷

اس کا شوق اس سے کامل تر کی طرف متعلق ہوگا ۔مگر آتش شوق کسی منزل پر ٹھہرے گی نہیں بلکہ ہر خوب سے خوب تر کو دیکھ کر اس کی طرف متوجہ ہو جائے گی۔ پس اسی نور فطرت نے ہم کو بتایا کہ تمام سلسلۂ بشر کے قلوب انتہائے بلاد افریقہ کے بسنے والوں سے لے کر دنیا کے متمدن ترین ممالک تک اور طبیعی و مادی لوگوں سے لے کر اہل ملل ونحل تک، سب ہی فطرۃً ایک ایسے کمال کے متمنی ہیں جس میں کوئی نقص نہ ہو اور ایسے جمال کے عاشق ہیں جس میں کوئی عیب نہ ہو، اور ایسے علم کے خواہشمند ہیں جس میں جہل نہ ہو، ایسی قدرت و سلطنت کے طالب ہیں جس کے ہمراہ عاجزی نہ ہو ، ایسی زندگی کے دلدادہ ہیں جس کے لئے موت نہ ہو، یعنی ہر ایک کا معشوق ''کمالِ مطلق'' ہے۔ تمام موجودات اور بشری خانوادہ ایک دل و ایک زبان ہو کر چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ ہم ''کمال مطلق'' کے عاشق ہیں۔ ہم ''جلال و جمال مطلق'' سے محبت رکھتے ہیں۔ ہم ''قدرتِ مطلقہ'' اور ''علمِ مطلق'' کے طالب ہیں۔ اب آپ ہی بتایئے کیا ذات مقدس مبداء عالم جلّت عظمتہ کے علاوہ عالم تصور وخیال میں بھی اس پورے سلسلۂ کائنات اور تجویزات عقلیہ و اعتباریہ میں کوئی ایسا موجود ہے جو کمال مطلق اور جمال مطلق رکھتا ہے؟ اور کیا بے نقص جمیل علی الاطلاق اس محبوب مطلق کے علاوہ کوئی اور ہے؟......اے وادی حیرت کے سرگشتہ لوگو! اے گمراہی کے جنگل کے گمراہ لوگو! نہیں نہیں بلکہ اے شمع جمال جمیل مطلق کے پروانو، بے عیب و بے زوال محبوب کے عاشقو! ذرا تھوڑا سا کتاب فطرت کی طرف رجوع کرو، اپنی کتاب ذات کی ورق گردانی کرو تو دیکھو گے کہ قدرتِ فطرت الٰہی کے قلم سے اس میں لکھا ہوا ہے : ''وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ۔'' کیا یہ ''فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا'' فطرت توجہ بہ محبوب مطلق ہے؟ کیا یہ نہ بدلنے والی فطرت ''لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰه'' فطرت معرفت ہے؟ اس فطری عشق خداداد اور اس امانت الٰہی کو کب تک باطل خیالات میں ادھر ادھر صرف کرتے رہو گے؟ اگر تمہارا محبوب یہی ناقص جمال اور محدود کمال ہوتا تو پھر اسکے حصول کے بعد تمہاری آتش شوق بجھی کیوں نہیں؟ اور شعلۂ شوق زیادہ کیوں ہوا؟...... ہاں ذرا خواب غفلت سے اٹھو، خوشخبری دو، خوشی مناؤ کہ تمہارا محبوب ایسا ہے جس کو زوال نہیں ! ایسا معشوق ہے جس میں نقص نہیں، ایسا مطلوب ہے جس میں عیب نہیں، ایسا منظور ہے جس کا نور طلعت

(اَللّٰہُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ) ہے۔ ایسا محبوب ہے کہ جس کے احاطہ کی وسعت (لو دلّیتم بحبل الی الارضین السفلی لھبطتم علی الله) ہے۔......پس تمہارا یہ فعلی عشق معشوق فعلی کو چاہتا ہے۔ یہ خیالی اور وہمی نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ ہر موہوم ناقص ہوتا ہے اور فطرت کامل کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ لہٰذا عاشق فعلی اور عشق فعلی بغیر معشوق کے نہیں ہوسکتا اور ذات کامل کے علاوہ کوئی ایسا معشوق نہیں ہے جو فطرت کا متوجہ الیہ ہو۔ اس لئے کامل مطلق کے عشق کا لازمہ کامل مطلق کا وجود ہے اور یہ بات پہلے واضح کی جا چکی ہے کہ فطرت اور اس کے لوازم کے احکام سب کے سب تمام بدیہیات سے واضح و روشن تر ہیں۔(أَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ۔)"

توحید اور خدا کی دوسری صفات فطری ہیں۔ اس بارے میں امام خمینیؒ لکھتے ہیں:[۱]

"پروردگار عالم کی توحید اور اس کی ذات کا تمام صفاتِ کمال کا مستجمع ہونا بھی فطریات سے ہے کیونکہ یہ جان لو کہ ان فطرتوں میں کہ جن پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، ایک فطرت نقص سے نفرت بھی ہے۔ انسان جب کسی میں عیب یا نقص پاتا ہے تو اس سے متنفر ہوتا ہے۔ پس عیب و نقص فطرت کے لئے اسی طرح باعث نفرت ہے، جس طرح کمال مطلق باعث تعلق ہے۔ اس لئے فطرت ہمیشہ "واحد" اور "احد" کی طرف متوجہ ہوگی کیونکہ کثرت و مرکب ناقص ہوا کرتا ہے اور کثرت غیر محدود نہیں ہوتی ہے۔ پس جب یہ معلوم ہوا کہ کثرت و مرکب ناقص ہے تو یہ فطرت کے لئے قابل نفرت ہوگی نہ کہ قابل توجہ۔ پس ان دونوں فطرتوں، تعلق فطرت بہ کمال اور نفرت فطرت از نقص سے توحید بھی ثابت ہوتی ہے بلکہ یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ خدا جمیع کمالات کا مستجمع اور تمام نقائص سے مبرا و منزہ ہے اور سورۂ توحید جو خدا کی نسبت کو بیان کرتا ہے وہ (ہمارے شیخؒ بزرگوار کے حسب فرمائش) ہویت مطلقہ ہے جس کی طرف فطرت متوجہ ہوا کرتی ہے اور سورۂ توحید کے شروع میں کلمہ "ھو" کہہ کر چھ صفت پر دلیل کی طرف اشارہ ہے۔ جو "ھو" کے بعد مذکور ہے۔ چونکہ ذات پروردگار ہویت مطلقہ ہے اور ہویت مطلقہ کو کامل مطلق ہونا چاہئے ورنہ پھر ہویت محدودہ ہو جائے گی۔ اور "جب کامل مطلق ہے تو" مستجمع جمیع کمالات بھی ہے۔ پس لفظ ھو کے بعد لفظ "اَللّٰہُ" ہے اور خدا جامع جمیع کمالات ہونے کے ساتھ بسط بھی ہے۔ ورنہ ہویت مطلقہ نہ ہوگی۔ اس کے بعد

۱۔ شرح چہل حدیث، اردو ترجمہ، ۲۴۴

''احد'' ہے اور احدیت کا لازمہ واحدیت ہے اور چونکہ ہویت مطلقہ جامع جمیع کمالات ہے، اس لئے تمام نقائص سے مبرا ہو گی کیونکہ تمام نقائص کی بازگشت ماہیت کی طرف ہوا کرتی ہے۔......اس کے بعد ذات خدا ''صمد'' ہے۔ درمیان خالی نہیں ہے اور چونکہ ہویت مطلقہ ہے اس لئے کوئی نہ اس سے پیدا و منفصل ہوسکتا ہے اور نہ وہ کسی سے متولد و منفصل ہوسکتا ہے بلکہ وہ تمام چیزوں کا مبداء اور تمام اشیاء موجودات کا مرجع ہے۔ مگر ہاں انفصال نام کی کوئی چیز نہیں ہے جو مستلزم نقص ہو۔ نیز ہویت مطلقہ کا کوئی کفو بھی نہیں ہے۔ کیونکہ کمال صرف میں تکرار کا تصور نہیں ہوسکتا۔ پس سورۂ مبارکہ توحید فطرت کے احکام سے ہے اور اس میں خدا کی نسبت ہے۔''

اس حدیث کی شرح کی ابتدا میں امام خمینی نے فطرت کے معنی، احکام فطرت کی تشخیص اور احکام فطرت کی طرف اجمالی اشارہ کیا ہے۔ آخر میں معاد کے سلسلہ میں بحث کی ہے کہ معاد کا وجود بھی فطریات میں سے ہے، جو انسانی خمیر میں شامل ہے۔

امام خمینی نے جگہ جگہ انسانی نفس کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے اور انسان کو خواہشات نفسانی سے دور رہنے کی ترغیب دلائی ہے۔ اس سلسلہ میں ان کے یہاں تکرار بھی پائی جاتی ہے۔ ایک جگہ وہ خود لکھتے ہیں:[۱]

'' اگرچہ ان اوراق میں جو مطالب بیان کئے گئے ہیں وہ شائع ومشہور ومعروف ہیں اورانہیں مکررات سے شمار کرنا چاہئے۔ لیکن اس تکرار میں کوئی حرج نہیں ہے۔ نفس کو یاد دہانی اور حق بات کی تکرار اچھی بات ہے۔ اسی لئے وظائف و اوراد، عبادات و مناسک میں تکرار مطلوب ہے۔ اور اس تکرار کا اصلی مقصد نفس کو عادی بنانا اور ریاضت کا پابند بنانا ہے۔ لہٰذا میرے عزیز تکرار سے رنجیدہ نہ ہو اور یہ جان لو کہ جب تک انسان نفس اور اس کی شہوتوں کا اسیر ہے اور شہوت وغضب کا طولانی سلسلہ اس کی گردن میں ہے کسی بھی مقام معنوی و روحانی تک نہیں پہنچ سکتا اور نہ نفس کی باطنی سلطنت اور اس کا نافذ ارادہ ظاہر ہوسکتا ہے اور عزت نفس و مقام استقلال جو کمال روحانی کا بزرگ ترین مقام ہے انسان کے اندر پیدا ہوسکتا ہے۔ بلکہ اس اسیری کی وجہ سے انسان کبھی بھی اور کسی بھی حال میں نفس کی اطاعت سے سرپیچی نہیں کرسکتا۔''

۱۔ شرح چہل حدیث، اردو ترجمہ، ۳۳۷

مثالیں تو بہت ہیں لیکن اختصار کوملحوظ رکھتے ہوئے ہم اس سلسلہ کو یہی روک رہے ہیں۔ اس کتاب میں ایسی ایسی عالمانہ، فاضلانہ، فلسفیانہ اور عارفانہ بحثیں شامل ہیں کہ لگتا ہے کہ علم وعرفان کا ٹھاٹھیں مارتا ایک سمندر ہے اور ایک عارف کامل عرفان و آگہی کے گہر آبدار لٹا رہا ہے، ایک معلم اخلاق اخلاق حسنہ کی تعلیم دے رہا ہے، ایک فلسفی فلسفہ کی گتھیاں سلجھا رہا ہے، ایک عابد و زاہد اس طرح سے وعظ ونصیحت کر رہا ہے جو دل میں اتر جانے والی ہے۔ اور وہ لوگوں کو اصلاح نفس کی دعوت دے رہا ہے۔ مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب شرح احادیث کے باب میں ایک اہم اضافہ ہے۔

شاہ ہمدان کی فارسی غزلیات

پروفیسر شریف حسین قاسمی

میر سید علی ہمدانی معروف بہ حضرت شاہ ہمدان (متولد ۱۲ رجب ۷۱۴ھ/ ۲۲ اکتوبر ۱۳۱۴ء، متوفی: ۶ ذی الحجہ ۷۸۶ھ/ ۱۹ جنوری ۱۳۸۵ء) چودھویں صدی عیسوی کے ایک عظیم صوفی اور مبلغ ہیں۔ کشمیر میں آپ کی تبلیغی سرگرمیاں اور اس کے نتائج کی روداد آج بھی زبان زد خاص وعام ہیں۔ شاہ ہمدان کی ہمہ جہت شخصیت کے بے شک کئی تابناک پہلو ہیں۔ لیکن وہ سب کے سب ان کی داعیانہ حیثیت کے تابع ہیں۔ ان کے قلم سے جو کچھ بھی صادر ہوا ہے وہ ان کی داعیانہ شخصیت کا پرتو ہے اور اس کی مناسب افہام وتفہیم اور قدر ومنزلت کے تعین کے لئے یہی بات بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

اس معروف صوفی ومبلغ کے بارے میں اظہار نظر کرنے والوں نے ان کی تصانیف کی تعداد سو، ڈیڑھ سو یا ایک سواسی لکھی ہے۔ جہاں شاہ ہمدان کی زندگی کے بارے میں ان کے معتقدین نے بعض ایسی باتیں کہی ہیں جو شاہ ہمدان سے ان کے بے پناہ جوشِ عقیدت کا نتیجہ ہیں، وہاں یہ تعداد بھی بظاہر مبالغہ آمیز نظر آتی ہے۔ یہ بات بھی دلچسپ ہے کہ کسی نے حضرت شاہ ہمدان کی ان تمام تصانیف کے نام درج نہیں کیے ہیں۔

بنابر شہرت منہاج العارفین، اوراد فتحیّہ، مکتوبات، رسالۂ مناجات، شرحِ فصوص الحکم، سیر الطالبین، آداب المریدین، رسالۂ معرفت زہد، رسالہ اورادیّہ، رسالۂ ذکریہ، رسالۂ حمدانیہ، رسالۂ قدسیہ، رسالۂ خواطر احادیث، رسالۂ فتوحات کے علاوہ ذخیرۃ الملوک ان کی تصانیف کی فہرست میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ چند رباعیات اور چہل اسرار کے نام سے چالیس غزلوں کا مجموعہ بھی شاہ ہمدان سے منسوب ہے۔

ان چالیس غزلوں کے بارے میں روایات یہ ہے کہ شاہ ہمدان رمضان المبارک کے مہینہ میں ایک دن اپنی خانقاہ میں تشریف رکھتے تھے۔ آپ کے چالیس مرید، یکے بعد دیگرے، آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سب نے آپ کو اپنے اپنے ہاں کھانے کی دعوت دی۔ آپ نے سب کی دعوت

منظور کرلی۔ آپ کے خلیفہ شیخ قوام الدین بدخشی یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اور حیرت میں تھے کہ ان کے مرشد کس طرح ایک ہی وقت میں چالیس لوگوں کے گھر جا کر کھانا کھائیں گے۔ لیکن وہ اس بارے میں استفسار کی جرأت نہیں کر سکے۔ افطار کے بعد شاہ ہمدان خانقاہ معلیٰ میں واقع اپنے حجرہ خاص میں داخل ہوئے اور دروازہ بند کرلیا۔ عشاء کے وقت کے لئے باہر آئے اور نماز ادا کی۔ اگلے روز عقیدت مند اور مرید حسب معمول خانقاہ میں جمع ہوئے۔ ان میں وہ چالیس مرید بھی تھے جن سے ایک دن قبل شاہ ہمدان نے ان کے گھروں پر کھانا کھانے کا وعدہ کیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک نے بتایا کہ شاہ ہمدان گذشتہ رات ان کے مہمان رہے تھے۔ اور ہر ایک نے ایک ایک غزل بھی پیش کی جو شاہ ہمدان نے ان کے گھروں پر کھانے کے بعد انہیں تحفتاً عنایت کی تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شاہ ہمدان اس رات اپنے حجرہ سے مطلق باہر ہی نہیں نکلے تھے۔

بہر حال انہی چالیس غزلوں کے مجموعہ کو چہل اسرار کے نام سے جمع کر دیا گیا ہے۔

اس کے قدیم قلمی نسخے غالباً دستیاب نہیں ہیں۔ میرے دوست ڈاکٹر محمد منور مسعودی، پروفیسر شعبہ فارسی، کشمیر یونیورسٹی نے ان چالیس غزلوں کا فارسی متن، ان کا اردو، انگریزی اور کشمیری ترجمہ ۱۹۹۶ء میں شائع کیا ہے۔ ڈاکٹر مسعودی کو بھی چہل اسرار کا کوئی قدیم نسخہ دستیاب نہیں ہوسکا۔ انہوں نے اس کا فارسی متن تین قلمی نسخوں کی مدد سے مرتب کیا ہے۔ ان تینوں نسخوں پر سال کتابت درج نہیں ہے۔ ان کے جو کوائف ڈاکٹر مسعودی نے بیان کیے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ یہ غالباً بہت بعد کے دور میں مرتب ہوئے ہوں گے۔

فارسی شعرا کے متعدد تذکرے فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں۔ ان میں بعض عمومی نوعیت کے تذکرے بہت ضخیم بھی ہیں۔ جن حضرات نے ان تذکروں کا توجہ اور تفصیل سے مطالعہ کیا ہے ان پر یہ حقیقت روشن ہے کہ ان میں بہت سے ایسے شعرا کا ترجمہ بھی شامل ہے جو باقاعدہ شاعر نہیں تھے اور محض تفننِ طبع کے طور پر دو چار شعر کہہ لیتے تھے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ تذکرہ نگاروں کا یہ عام طریقہ رہا ہے کہ انہوں نے معمولی سے معمولی شاعر کے احوال بھی اپنے اپنے تذکروں میں درج کیے ہیں، لیکن شاہ ہمدان کا ذکر ایک شاعر کی حیثیت سے تذکروں میں مشکل ہی سے نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ شاہ ہمدان کا منظوم کلام ان کی دسترس سے باہر رہا ہو یا پھر یوں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ شاہ ہمدان خود اپنے زمانہ میں یا اس کے بعد ایک شاعر کی حیثیت سے معروف

ہی نہیں تھے۔ یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ شاعر نہ ہونے کی وجہ سے شاہ ہمدان کی عالمانہ، عارفانہ اور داعیانہ حیثیت پر کوئی حرف نہیں آتا، وہ مسلم ہے۔

ان چالیس غزلیات کا شاہ ہمدان سے انتساب ایک پر اسرار معاملہ ہے۔ یہ غزلیں حقیقت میں ان کی ہیں یا نہیں، یہ خود تحقیق کا ایک اہم موضوع اور دقت طلب مسئلہ ہے۔ اس پر کام ہونا باقی ہے۔

راقم نے ان غزلیات کا ایک مختصر جائزہ لیا ہے اور یہ سوچ کر جائزہ لیا ہے کہ جب تک یہ واضح طور پر معلوم نہ ہوجائے کہ یہ غزلیں کس شاعر کی ہیں، شاہ ہمدان سے ان کے انتساب کو قبول کر لینا چاہئے۔

چہل اسرار کی غزلوں میں علی اور علایی تخلص استعمال ہوئے ہیں۔ ان تمام غزلوں پر گہرا عارفانہ رنگ غالب ہے۔ زبان آسان اور انداز بیان سلیس اور والہانہ ہے۔ جو کچھ کہا گیا ہے، وہ کہنے والے کے اپنے ذاتی احساسات ومشاہدات پر مبنی ہے۔ وہ تاریخ اسلام سے بخوبی واقف ہے، تفسیر، فقہ اور حدیث پر اس کی گہری نظر ہے۔ بنیادی طور پر صوفی ہے۔ اس لیے عرفان وتصوف کے جملہ امور سے خوب آشنا ہے اور اس وسیع میدان عمل میں جو کچھ اس پر بیتی ہے وہ اسے بے کم وکاست بیان کر رہا ہے۔ چوں کہ یہ آپ بیتی ہے اس لیے بیان میں صراحت بھی ہے، ایقان کی کیفیت بھی اور تاثیر بھی۔ غزلیں محض عشق حقیقی کی سرگذشت ہیں جن میں عشق مجازی کی جھلک بھی نہیں۔ ان غزلوں میں بعض ایسے عرفانی تجربات ومشاہدات کا ذکر بھی ہے جن سے شاہ ہمدان سے پہلے کے عظیم عرفأ بھی دوچار ہوئے تھے۔ تجربات و مشاہدات کی یہ تکرار ان کے برحق ہونے کا ثبوت ہیں۔ ایک شعر ملاحظہ فرمائیے۔ جو چہل اسرار کی غزلوں میں سب سے پہلی غزل کا مطلع ہے۔

ای گرفتاران عشقت فارغ از مال و منال
والہان حضرتت را از خود و جنت ملال

تیرے عشق میں گرفتار، دنیوی مال ومتاع کے متمنی نہیں، جو تیرے والہ وشیدا ہیں، تجھ سے وصل کی خواہش میں خود اپنے آپ یعنی نفس اور جنت سے بیزار ہیں۔

یہ شعر ہمیں رابعہ بصری سے متعلق اس دلچسپ اور سبق آموز واقعہ کی یاد دلاتا ہے جو اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ عالم اسلام کی یہ معروف شخصیت ایک روز ایک ہاتھ میں پانی اور دوسرے میں

آگ لیے، جاتی ہوئی نظر آئی۔ کسی نے پوچھا، اس حال میں کہاں جارہی ہیں ؟ جواب دیا۔ پانی سے جہنم کی آگ بجھانے اور آگ سے جنت کو بھسم کرنے جارہی ہوں تاکہ لوگ خدا کی عبادت جہنم کے خوف اور جنت کی آرزو میں نہ کریں بلکہ خالق حقیقی سے محبت ہی اس عبادت کی وجہ ہو، یہ حقیقت شناس عرفا کا مسلمہ عقیدہ ہے کہ حوروقصور کی جنت عاشق ربانی کا مقصود نہیں۔اسی غزل کا ایک اور شعر ہے :

کشتگان تیغ عشقت ، زندگان جاودان
صید شاہین غمت شاہان ملک بی زوال

حقیقی عشق کے مارے ہوئے، ہمیشہ زندہ رہتے ہیں ، اور تیرے غم کے شاہین کے شکار ہمیشہ باقی رہنے والے ملک کے بادشاہ ہوجاتے ہیں۔ یہ عشق حقیقی کی کارسازی ہے۔

یہ شعر ہمیں جام زندہ کے اس شعر کی یاددلاتا ہے جس نے مجلس سماع میں وہ عالم وجد پیدا کردیا تھا کہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکی نے اپنی جان ، جان آفرین کے سپرد کردی تھی ، زندہ بیل کا شعر ہے:

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زمان از غیب جانی دیگر است

ایک غزل میں شاہ ہمدان عاشقان خدا کے اخلاق ، ان کی مشکلات ، ان کے بلند مقام ، ان کی حرکات وسکنات وغیرہ کا فصیح زبان اور مترنم انداز میں ذکر کرتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں ارباب ذوق اور عاشقان خدا دنیوی مال ومتاع سے بے نیاز صرف اپنے خالق کے تصور میں محو رہتے ہیں۔ عشق کے شکنجہ نے انہیں دنیوی آلودگیوں سے پاک وصاف کردیاہے۔ وہ حسن ازلی کا صرف ایک بھید ہی جان لینے کے عوض حوران بہشتی کو کوڑیوں کے بھاؤ بھی نہیں خرید تے۔ اس غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے :

ارباب ذوق در غم تو آرمیدہ اند
وز شادی و نعیم دو عالم رمیدہ اند
پالودۂ شکنجۂ عشقند زان سبب
زآلودگان جیفۂ دنیا بریدہ اند
از ناز یار و محنت اغیار فارغند
چون در سرادقات جلالش رسیدہ اند

جو صوفیا نغمۂ توحید سے سرمست ہوتے ہیں، ان میں بڑی رواداری ہوتی ہے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیا نے جمنا کے کنارے غیر مسلموں کو اپنے طور طریقہ پر عبادت میں مصروف دیکھ کر سراہنے کے انداز میں کہا تھا:

ہر قوم راست راہی، دینی و قبلہ گاہی

ایسے صوفیا کا خیال ہے کہ مسلم اور غیر مسلم بلا امتیاز مذہب وملت اس کے فیض سے سرشار ہیں۔ سچ یہ ہے کہ جذبۂ توحید کے پیدا ہونے کے بعد تمام مسائل حیات کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ موحد کائنات کے ورق پر حقیر ذرہ کو بھی اسی کی بارگاہ میں سربہ سجود دیکھتا ہے۔

ہمدانی کہتے ہیں:

دید علایی عیان بر ورق کائنات　　جملۂ ذرّات کون پیش رخش در سجود

ایک موحد زندگی، جسم، کفر اور دین کو سلوک میں رکاوٹ گردانتا ہے۔ وہ ان مواقع سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے اور عشق خداوندی کے اتاہ سمندر میں غرق ہوجانا چاہتا ہے۔ ہمدانی کہتے ہیں:

جان و تن بنداست و کفر و دین حجاب اندر رہش
جملہ را برہم زن و باعشق او ہمراز شو

یہاں جو غمزۂ حسنِ ازل کا شکار ہوا وہ نام وننگ اور کفرودین کے تصور سے کلی طور پرآزاد ہوجاتا ہے:

کسی کز غمزۂ حسنش چو زلف او پریشان شد
زنام و ننگ و کفر و دین بکلی بی خبرباشد

اور جب عشق کا ارغوان توحید کے نغمہ سے ہم سازوھم آواز ہوجاتا ہے تو مطرب اس کے جمال کے شوق میں موزوں نغمے بکھیرنے لگتا ہے۔

ارغنون عشق چون با نغمۂ توحید ساخت
مطرب از شوق جمالش نالۂ موزوں زند

شاہ ہمدان متعدد جگہ نفس کو عرفان حقیقی کے راستہ کا پتھر قرار دیتے ہیں۔ انسان کا پندار یعنی ’’میں‘‘ اسے سعادتِ عرفان سے دور رکھتا ہے:

شارح ادبار ما پردۂ پندار ما
ہر کہ ازین پردہ رست گوی سعادت ربود

جنھوں نے نفس کو کچل دیا، وہ لامکاں میں حتیٰ فرشتوں سے زیادہ بلند مرتبہ حاصل کر لیتے ہیں:

از ہوای نفس گر یک رہ خلاصی باشدش
درہوای لامکان لاف از ملک افزون زند

جہان خدا سورج کی روشنی کی طرح ہر جگہ موجود ہے۔ وہاں ہماری ہستی نفس کی بدبختی ہے، جو روشنی پر پردہ ڈالے رہتی ہے:

ادبار ہستی ما شد پردۂ جمالش
ور نہ ز راہ تحقیق خورشید نیست پنہاں

شاہ ہمدان ابن عربی کے مکتب فکر سے وابستہ تھے۔ آپ نے فصوص الحکم کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ ابن عربی وحدۃ الوجود کے قائل تھے۔ ان کی پیروی میں شاہ ہمدان بھی اسی عقیدہ کے حامی اور مبلغ رہے۔

ہمارے بزرگ عرفا نے علم کو بڑی اہمیت دی ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جو صوفی صاحب علم نہیں وہ بہ آسانی مسخر شیطان ہوجاتا ہے۔ اسی عقیدہ کے اثبات کے لئے شاہ ہمدان کہتے ہیں کہ اگر تم روضۂ دل کو علم کے پانی سے سیراب کروگے تو آخرکار تمھیں باغ وصال تک رسائی حاصل ہوجائے گی۔

تو روضہ دل اگر ز آب علم تازہ کنی   بہ عاقبت ز ریاض وصال بر یابی

اس ضمن میں شاہ ہمدان کا ایک دوسرا شعر بھی دلچسپ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جہالت نے ہی انسان کو بارگاہ قرب سے دور رکھا ہے ورنہ انسان سے زیادہ کوئی بھی اس سے نزدیک نہیں۔

خواب جہل از حرم قرب مرا دور افکند   ورنہ نزدیک تر از دوست کسی ہیچ ندید

دنیوی شعائر ورسوم کے مقابلہ میں حکمت ودین اور اصل روحانیت پر نظر رکھنے والے وسیع النظر اور وسیع المشرب ہوتے ہیں۔ محض اختلاف رسوم کی بناپر دوسروں کو مطلقاً گمراہ نہیں سمجھے۔ شاہ ہمدان اسی سلسلہ میں کہتے ہیں کہ جو مجازی رسوم کے بندھن سے آزاد ہوگیا، اسے فنا کے زہر میں بھی بقا کا خوشگوار شربت حاصل ہوجاتا ہے:

چو از رسوم مجازی فنا شد کلی   درون زہر فنا شربت بقا یدہ
ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم   ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

ایک پوری غزل میں شاہ ہمدان نے انسان کی عظمت کو خراج تحسین پیش کیا ہے، انسان جو اشرف المخلوقات ہے اس کا کیا مقام ہے؟ اس کی کیا صفات ہیں؟ یہ ساری کائنات کس طرح اس کی خدمت میں لگی ہوئی ہے؟ اسکی استعداد صلاحیت کیا ہے وہ کیسے کیسے رازوں کا امین ہے؟

تو کان گوہر کافی و جوہر نونی
چہ کاف و نون ز کاف و نون تو افزونی
محیط گنبد افلاک را تویی مرکز
صفای صافی اسرار را تو استونی
ز دور دایرہ گر بہ سوی مرکز آیی باز
یقین بود کہ ز ہر وصف و وہم بیرونی
سپہر مطلع انوار و آفتاب جلال
بہ گرد نقطہ ذات تو کردہ گردونی
ظہور سر کمالات سرمدی از تست
اگرچہ خازن اسرار را تو مخزونی
قبای غیرت او بود ہرچہ جمال تو شد
تویی کہ در صدف علم دُرّ مکنونی

علامہ اقبال نے بھی انسان کو اس دنیا میں اس کے اعلیٰ مرتبہ کی یاددلائی ہے۔ اقبال شاہ ہمدان اور ان کے عقاید وخیالات سے خوب واقف تھے۔ اسی طرح انھوں نے شاہ ہمدان کی زندگی ان کے عقاید اور تعلیمات سے فائدہ بھی اٹھایا تھا۔ ان کی نظم ''زیارت امیر کبیر حضرت سید علی ہمدانی'' اپنے دور کے اس عظیم المرتبت صوفی وعارف سے ان کی محبت اور ذہنی طور پر ان کے افکار وخیالات سے ہم آہنگی کی ترجمانی ہے۔

معرفی کتاب (تازہ ترین کتابوں کا تعارف)

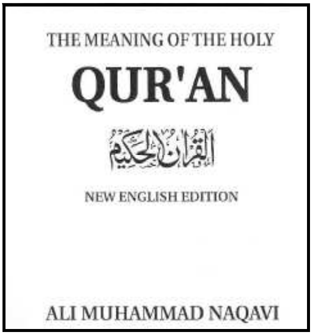

نام : **جدید تفسیر قرآن کا ایک تنقیدی جائزہ**
تالیف : مولانا علی محمد نقوی
صفحات : ۳۲۸
ناشر : آئی آئی ڈی ای پبلیکیشنس۔
مین آفس: ۱۹ نیشنل کالونی، علیگڑھ

قرآن کریم وحی الٰہی کا نقطۂ مختتم اور خالق کائنات کی بے پناہ رحمتوں کا مظہر ہے۔ یہ پیغمبر اسلامؐ حضور ختمی مرتبت کا ایک زندہ جاوید معجزہ اور اپنی زبان و بیان اور موضوعات کی ندرت کے اعتبار سے بے مثل و بے نظیر ہے۔ اس کتاب ہدایت نے گذشتہ چودہ صدیوں سے بھی زیادہ عرصہ میں انسانی سماج پر جو اثرات مرتّب کئے ہیں اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ قرآن کریم کے علاوہ دنیا کی کسی دوسری کتاب نے انسان کی زندگی میں کبھی اتنی بڑی تبدیلی نہیں پیدا کی۔ اس کتاب نے ایک نہایت مختصر سے عرصہ میں ایک جاہل، توہم پرست، بداخلاق اور پسماندہ سماج کو ایک بیدار، باشعور اور تعلیم یافتہ قوم میں تبدیل کر دیا۔

ویسے تو ہر مسلمان سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ عربی زبان میں کم سے کم اتنی صلاحیت ضرور حاصل کرلے گا کہ قرآن مجید کے معنیٰ ومفاہیم اور اسکے موضوعات سے براہ راست فائدہ حاصل کر سکے۔ مگر پھر بھی قرآن کی آفاقیت کا یہ تقاضہ ہے کہ اسکا دنیا کی تمام زبانوں میں ترجمہ کیا جائے تاکہ اس کا لازوال پیغام اس کرۂ ارض کے کونے کونے تک پہنچ جائے، کیونکہ یہ کسی ایک ملک وملت کے لئے نہیں بلکہ یہ پوری دنیائے بشریت کی ہدایت کے لئے نازل کیا گیا ہے۔

لہٰذا ہمیشہ اس بات کی بھی ضرورت رہی ہے کہ اس آخری الٰہی کتاب کی کماحقہ اس طرح

تفسیر کی جائے کہ وقت کی ضرورت اور بدلتے حالات میں انسانی مسائل کا حل دریافت کیا جا سکے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اسی خیال کہ مدنظر پیغمبر اسلامؐ کی وفات کے بعد قرآن کریم کے متعدد ترجمے اورتفسیریں منظر عام پر آتی رہی ہیں۔

جہاں تک قرآن کے انگریزی ترجموں کا سوال ہے، تو زیادہ تر ترجمہ مشنریز یا پھر مستشرقین ہی نے کئے ہیں۔ پچھلے پچاس سالوں میں قرآن کریم کے متعدد ترجمہ اورتفسیریں مسلمان علماء اور مستشرقین دونوں کے ذریعہ سامنے آئی ہیں اور یقیناً قرآن کے پیغام اور اسکے مشن کی تبلیغ و ترویج میں بہت معاون ثابت ہوئی ہیں۔ چونکہ قرآن ایک الہامی کتاب ہدایت ہے جو علامتی زبان میں نازل ہوئی ہے لہٰذا اسکا ترجمہ بھی یقیناً ایک بے حد مشکل اور دشوار امر ہے۔ اس لئے اسکے زیادہ تر ترجموں میں کسی نہ کسی پہلو سے کمی واضح طور پر نظر آتی ہے۔ انگریزی زبان کے تعلق سے یہ کام اور بھی مشکل نظر آتا ہے، کیونکہ اردو یا فارسی کے برعکس انگریزی زبان اپنے مزاج اور جملوں کی ساخت کے اعتبار سے عربی سے مختلف ہے۔قرآن کریم کے زیادہ تر انگریزی ترجمے اس لئے بے جان نظر آتے ہیں کہ یا تو وہ بائبل کے انداز میں کئے گئے ہیں یا پھر بالکل لفظی ترجمے ہیں۔ لفظی ترجمہ کرنے کے نتیجہ میں قرآن کی ادبیّت، روانی، بلاغت اور دلکش انداز بیان مفقود ہوجاتے ہیں۔ اس لئے ایسے ترجمے انسان کے روحانی شعور میں وہ تلاطم اور انقلابی فکر پیدا کرنے سے قاصر ہیں جو قرآن ہرمخاطب کے دل میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ قرآن کے لفظی ترجمہ کو پڑھ کر ہر قاری کو حیرت ہوتی ہے کہ کیا یہ وہی کتاب ہے جس نے پوری دنیا کو اپنا نظیر پیش کرنے کا چیلنج دیا ہے؟ دوسری جانب کچھ انگریزی ترجمۂ جناب این۔ جے۔ داؤد کے ترجمہ سمیت خوبصورت اور ادبی تو ہیں مگر وہ اصل متن سے اتنے آزاد ہیں کہ انہیں ترجمہ سے زیادہ ترجمانی کہنا بہتر ہوگا۔ مولانا علامہ سید علی محمد نقوی صاحب نے اپنے ترجمہ (The meaning of the holy Quran) میں اس بات کی جانب خاص توجہ دی ہے کہ یہ ترجمہ نہ تو بالکل لفظی ہو اور نہ ہی بالکل آزاد۔ اس ترجمہ کے ساتھ ایک جامع تفسیر بھی ہے۔ مولانا کا منصوبہ اسے تیس جلدوں میں مکمل کرنے کا ہے جس میں سے پہلی جلد منظر عام پر آچکی ہے، ترجمہ کے سلسلہ میں مولانا کی روش یہ ہے کہ اسے اصل متن کی روح سے دور نہ ہونے دیا جائے۔ مولانا کے مطابق ’’قرآن کی مقدس آیتوں کا ترجمہ کرتے وقت یہ بات ملحوظ

خاطر رہنا چاہئے کہ یہ ایک ''کتاب ہدایت'' ہے۔ اس کا ''کتاب ہدایت'' ہونا خود اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کا ترجمہ ایسا ہو جسے لوگ باآسانی سمجھ سکیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی معجزاتی بلاغت اور ادبی چاشنی کو بھی کسی قیمت پر قربان نہیں کرنا چاہئے''۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ علامہ نقوی کا یہ ترجمہ سادگی اور قرآنی پیغام کو بھرپور انداز میں پیش کرنے کے اسلوب کا ایک اچھا امتزاج ہے۔ ثانیاً، ہمیں معلوم ہے کہ قرآن نہ تو مکمل نثر ہے اور نہ ہی مکمل نظم کیونکہ اس کے اندر دونوں کی خصوصیات پائی جاتی ہیں، یعنی قرآنی آیات نثر کی سنجیدگی، بلاغت اور نظم کی مٹھاس سمیٹے ہوئے ہیں۔ اپنے منفرد انداز کے علاوہ قاری اور سامعین پر ہونے والے اثر کے لحاظ سے بھی یہ کتاب بے مثال ہے۔ قرآن کے مترجم کو بھی اپنے ترجمہ میں اس اسلوب اور طرز کو اپنانا چاہئے تاکہ اس کا ترجمہ روح قرآن سے زیادہ قریب رہ سکے۔ اس کے جملوں کی ساخت اور الفاظ کے انتخاب میں ایک شاعرانہ جھلک ضرور آنی چاہئے۔ علامہ نقوی کے ترجمہ میں ہمیں اس خیال کی تائید نظر آتی ہے کیونکہ موصوف نے آیتوں کا ترجمہ ایک ایسے انداز سے کیا ہے جو شاعری نہیں تو اس کے بہت قریب ضرور ہے۔ علاّمہ کے اس ترجمہ میں اصل عربی متن کو بھی انگریزی میں منتقل کیا گیا ہے اور اس کے لئے انہوں نے اپنا ایک خاص نظام بنایا ہے جو اب تک مروّجہ نظام سے زیادہ بہتر اور سمجھنے میں آسان ہے۔ ابھی تک عربی کو انگریزی میں لکھنے کا جو نظام چل رہا تھا وہ مغربی مفکرین کی ایجاد ہے۔ جیسے مسائل کے استنباط پر خاص زور دیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ بہت سی تفسیریں ایسی بھی ہیں جو بنیادی طور پر قرآنی آیات کے مفصّل شان نزول اور آنحضرتؐ کے دور رسالتؐ میں لڑی گئی اسلامی جنگوں کے حالات بیان کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر ''اللہ نے بدر کے دن تمہاری بڑی مدد کی''۔ اب اس آیت کے ذیل میں جنگ بدر کا پورا واقعہ مع تاریخی شواہد کے درج کیا گیا ہے۔

ان مثالوں کے یہاں بیان کرنے کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے کہ ان موضوعات کی اہمیت کو ذرّہ برابر بھی کم کیا جائے، یقیناً یہ تمام باتیں تفسیر قرآن کے لئے نہایت اہم اور ضروری ہیں، اور ہم ان مفسرین اور جلیل القدر علماء کے علمی کارناموں سے انکار نہیں کر سکتے جنھوں نے ان مضامین کے سلسلہ میں سخت محنت اور تحقیق سے کام لیا اور ہمارے لئے ایک قیمتی اثاثہ چھوڑا۔

یہاں توجہ دینے کی بات یہ ہے کہ بدقسمتی سے جس موضوع پر سب سے زیادہ زور دینا چاہئے تھا، وہ اکثر مفسرین کی نگاہوں سے پوشیدہ رہ گیا یعنی قرآنی آیتوں سے سماجی اور انفرادی زندگی کے اصول ہدایت اور موجودہ زمانہ کے مسائل کا حل دریافت کرنا! یہی وہ موضوع ہے جس پر سب سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔علامہ علی محمد نقوی نے اس موضوع کو اپنی تفسیر کے لئے اصل اصول قرار دیا ہے۔ اپنے مقدمہ میں سب سے پہلے انہوں اسی بات کو اٹھایا ہے۔ انہیں کے الفاظ میں:'' قرآن مجید نہ تو تاریخ کی کتاب ہے اور نہ ہی قصص انبیاء کی، یہ نہ تو قانون اور فقہ کی کتاب ہے اور نہ محض ایک ادبی شاہکار، البتہ بنیادی طور پر یہ ایک کتاب ہدایت ہے۔ اس میں مذکورہ بالا تمام عناصر پائے جاتے ہیں،مگر اسی حدتک جہاں تک مقصد ہدایت پورا ہو جائے۔ اس کتاب کا اولین مقصد اسلامی نظام کی علمی اور اخلاقی بنیاد نہایت واضح انداز میں فراہم کرنا ہے۔ ایک مکمّل اسلامی طریقہ زندگی کے لئے قرآن کا طرز ہدایت ایسا ہے جس کے لئے دقیق قوانین اور اس کے مختلف شعبوں ی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایک نظریاتی خاکہ بنانے کی ضرورت ہے جو کہیں کہیں علامتی بھی ہوسکتا ہے۔

قرآن کریم صرف جزیرہ عرب کے لئے نہیں بلکہ تمام اقوام عالم کے لئے منبع ہدایت ہے۔ قرآن نے کبھی صرف عربوں کی ہدایت کا دعوی نہیں کیا بلکہ خودکو پوری نسل انسانی کے لئے باعث ہدایت قرار دیا ہے جیسا کہ سورہ بقرہ میں ارشاد ہوا ''یہ(قرآن) ماہ رمضان میں نازل ہوا اورتمام انسانوں کے لئے ہدایت ہے''۔

یقیناً قرآن پوری دنیائے انسانیت کے لئے کتاب ہدایت ہے۔لیکن یہ بھی یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ قرآن کے اولین مخاطب اہل عرب ہی ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن انہیں کی زبان ، ماحول، تاریخ اور مزاج کے مطابق گفتگو کرتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مروجہّ نظام میں علامتیں اتنی مشکل ہیں کہ عام قاری کے لئے انہیں پڑھنا خاصا دشوار ہوجاتا ہے۔ مثال کے طور پر'ع' اور'ا' کی علامتیں۔علامّہ نقوی نے عربی کو انگریزی میں اس طرح منتقل کرنے کی کوشش کی ہے کہ عربی حروف کو جاننے والے حضرات آسانی کے ساتھ انگریزی میں اس کی تلاوت کر سکتے ہیں اورانہیں ہرعلامت پہچاننے کے لئے فہرست دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑیگی۔

تفسیر

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ کے انتقال کے بعد سے ابتک ہر صدی میں قرآن مجید کی مختلف تفسیریں لکھی جاتی رہی ہیں، ان میں سے زیادہ تر تفسیریں عربی زبان میں لکھی گئی ہیں اور باقی دوسری زبانوں میں بھی۔ بیسویں صدی میں قرآن کی درجنوں تفسیریں سامنے آئی ہیں جن میں انگریزی زبان کی تفسیریں بھی شامل ہیں۔ حالانکہ میری محدود معلومات کے مطابق انگریزی میں ابھی تک کوئی مفصّل تفسیر قرآن شائع نہیں ہوئی۔ مگر پھر بھی اگر تمام زبانوں میں لکھی گئی تفسیروں کو یکجا کیا جائے تو انکے متعلق چند باتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ اوّلاً یہ کہ اکثر قرآن مجید کی تفسیریں اس کے تاریخی پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھی گئیں ہیں۔ قرآنی واقعات اور اس میں مذکورہ شخصیتوں کی چھان بین میں کئی کئی جلدیں صرف کی گئی ہیں۔ قوم بنی اسرائیل کے عقائدو اعمال کی تحقیق میں ہزار ہاصفحات سیاہ کئے گئے ہیں نیز انجیل، زبور، اور توریت سے اسکے موازنہ پر بھی کافی کچھ لکھا گیا ہے، مثال کے طور پر مولانا عبدالماجد دریا بادی کی تفسیر۔

دوسری چیز جس پر مفسرین نے اپنی تفسیروں میں بہت زیادہ توجہ دی ہے وہ قرآن کا زبانی اور ادبی پہلو ہے۔ علامّہ زمخشری کی ’’الکشاف‘‘ سے لے کر آج کی بہت سی تفسیروں تک قرآن کی ادبیت اور اسکے الفاظ ان علماء کی توجہات کے خاص محور رہے ہیں۔ الفاظ کی ابتدا، ان کے استعمال اور صرف ونحو کے لحاظ سے ان کی اہمیت پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔

تیسری طرح کی بہت سی تفسیریں ایسی ہیں جو خالص فقہی طرز فکر کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔ جیسے نکاح، طلاق، وضو، غسل وغیرہ کا بیان۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آفاقی حقیقتوں کو اپنے دامن میں سمیٹنے والی آیتوں سے نظام حیات انسانی کے بنیادی اصول مستنبط کئے جائیں اور انہیں قرآنی تعلیمات کے پیرایۂ میں ڈھال کر اس طرح پیش کیا جائے کہ انسانی زندگی کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے۔ اس تفسیر میں مولانا کی کوشش یہی ہے کہ قرآنی تعلیمات کے ذریعہ دورحاضر کے مسائل کا حل ڈھونڈھا جائے اور اس نظام پر روشنی ڈالی جائے جو ہماری زندگی کے لئے قرآن نے پیش کیا ہے۔ اپنے مقدمہ میں مولانا سخن طراز ہیں ’’ قرآن کریم ہمارے سامنے ایک مکمّل نظام حیات پیش کرتا ہے جس سے سماجی اور انفرادی زندگی کا کوئی بھی پہلو

اچھوتا نہیں ہے۔قرآن اپنے آپکو مادی یا روحانی دنیاوی یا اخروی جیسے خانوں میں قید نہیں کرتا بلکہ واحد اور ناقابل تقسیم نظام کی تشکیل کرتا ہے اور ہم اسے طرز فکر سے تعبیر کرتے ہیں۔''

علامّہ علی محمد نقوی کے مطابق قرآن مجید کا انداز بیان نظم یا مثنوی کے مقابلہ میں غزل سے زیادہ ملتا جلتا ہے۔ اس طرح قرآن کے معنیٰ تک پہنچنے کے لئے کبھی کبھی ایک آیت یا چند آیتیں کافی ہوسکتی ہیں۔ جبکہ مولانا حمید الدین فراہی کے عقیدۂ نظم قرآن کے مطابق، قرآن کے اصل ابواب اسکے مختلف سورے ہیں جو آپس میں ایک دوسرے سے مرتبت ہیں۔اس سلسلہ میں مولانا نقوی خود تحریر فرماتے ہیں:'' (علامہ فراہی) کے بعد کے زیادہ تر مفسرین نے نظم قرآن ہی پر زیادہ زور صرف کیا ہے جبکہ ہماری ناچیز رائے میں نظم قرآن سے زیادہ اہم کام نظام قرآن کی تبلیغ و ترویج ہے، جبکہ ہوتا یہ ہے کہ بعض مقامات پر ہم نظم کے پھیر میں پڑ کر نظام کو قربان کردیتے ہیں۔ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ اگر ہم ہر آیت کو الگ الگ یا بعض مقامات پر چند آیتوں کو ایک ساتھ لیکر غور کریں تو ہم قرآن کریم کے زیادہ گہرے مفاہیم تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں اور اسی کے ساتھ نظام حیات اور اسلامی قوانین بھی ہم پر زیادہ واضح انداز میں منکشف ہوتے ہیں، بجائے اسکے کہ ہم پورے قرآن میں نظم کی تلاش کرتے رہیں۔''

علاّمہ نقوی نے پہلی جلد میں تو واضح نہیں کیا ہے البتہ دوسری جلد کے لئے وعدہ کیا ہے کہ وہ اپنے اس نظریۂ پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے کہ کس طرح نظم کی تلاش میں نظام قربان ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن کریم کی یہ آیت: اللہ اس قوم کی حالت کبھی نہیں تبدیل کرتا ہے جب تک وہ لوگ خود اپنے (نفس کی) حالت کو نہیں بدل دیتے''۔(13.12) قرآن کی یہ مقدس آیت سماجی بدلاؤ کے ایک اہم ترین اصول کی جانب اشارہ کر رہی ہے اور انسانی سماج کے عروج و زوال کی پوری تاریخ کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ قرآن میں یہ آیۂ مبارکہ ان چند آیتوں کے بعد رکھی گئی ہے جس میں کفاّر مکہّ کا ذکر موجود ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ کوئی بھی نبی فلسفیوں کی طرح خالص مجرد اور تصوراتی انداز میں گفتگو نہیں کرتا اور اگر ایسا ہوتا تو اس کی تعلیمات زندگی کے سانچہ میں نہ ڈھل کے صرف کاغذوں کے ڈھیر تک محدود رہ جاتیں۔ وحی الٰہی کا طرز تکلم ہی یہ ہے کہ وہ اسی انداز اور زبان میں گفتگو کرتی ہے جس ماحول میں نازل ہوتی ہے، وہ انہیں شخصیات اور واقعات کا ذکر کرتی ہے جن سے قوم واقف

ہوتی ہے۔ مگر وہ شخصیات اور واقعات کا ذکر آفاقی حقیقتوں کی علامت کے طور پر کرتی ہے۔ مثال کے طور پر قرآن میں ''ابولہب'' صرف ایک شخص کا نام نہیں ہے بلکہ برائی کو بڑھاوا دینے اور حق کی راہ میں حائل ہو جانے والی ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جو ہر دور اور ہر سماج میں پائی جاتی ہو۔ وحی الٰہی کو اسی انداز میں سمجھا جانا چاہیئے۔

قرآن بے شک انہیں حقائق اور واقعات کا اظہار کرتا ہے جن سے مخاطب اوّل قوم پہلے سے شناسا ہوتی ہے مگر دیکھنا یہ چاہیئے کہ کیا اس دور کے عربوں کے مشرکانہ عقاید کی ردّ میں قرآن جو کچھ پیش کرتا ہے وہ دنیا کے دوسرے مشرکانہ عقاید اور انکی بدلی ہوئی شکلوں کے لئے بھی صحیح ہے یا نہیں۔

علاّمہ علی محمّد نقوی کی اس تفسیر کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے مطالعہ قرآن کے لئے نظامی طرز فکر کو خاص اہمیت دی ہے۔

مولانا موصوف نے اپنی تفسیر یں اس پہلو کو اجاگر کیا ہے کہ نظم قرآن کی رو سے اگر آیات مبارکہ کے عمیق ترین مفاہیم کو صرف کفار مکہ اور ان کے دور سے محدود کر دیا جائے تو یقیناً یہ اس آیات مبارکہ کی روح کے خون کر دینے کے مترادف ہو گا۔

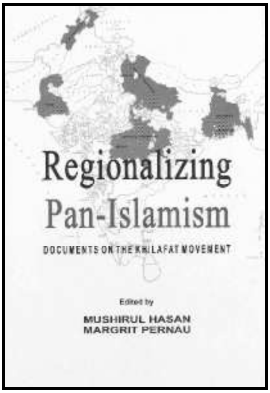

نام : **Regionalizing Pan-Islamism**

تالیف : Prof. Mushirul Hasan and Margrit Pernav

صفحات : ۴۶۷

ناشر : Manohar Publisers and Distributors

4753/23 Ansari Road, Darya Ganj,

New Delhi - 2

قیمت : ۱۰۹۰ روپیہ

ہندوستان میں برطانوی سامراج کے غلبہ کوشروع ہی سے ناپسندیدگی سے دیکھا گیا۔ یہ مخالفت مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی رہی ۔ اس کے خلاف وقتاً فوقتاً آوازیں اٹھتی رہیں جو بہ ظاہر ناکام رہیں۔لیکن اس مخالفت کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ برطانیہ کی سامراجی طاقت کے خلاف آہستہ آہستہ ایسا ماحول بنتا گیا کہ جس نے آخر کار ایک ملک گیرصورت اختیار کرلی اورجس کے سامنے ایک ایسی طاقت کو گھٹنے ٹیکنے پڑے جس کا یہ دعوٰی تھا کہ اس کی قلمرو میں سورج غروب نہیں ہوتا۔

پروفیسر مشیرالحسن، وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی اور مارگرٹ پرنوا، سابق ریسرچ فیلو، ساؤتھ ایشیا انسٹی ٹیوٹ، ہیدر ہمبرگ، نے اس کتاب میں خلافت تحریک سے متعلق ایسے اسناد و مدارک مرتب کیے ہیں جو ابھی تک منظرعام پرنہیں آئے تھے۔ اس تحریک نے ہندوستان میں برطانوی سامراج کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس تحریک میں بلالحاظ مذہب و ملّت سارا ہندوستان شامل تھا۔ جو اپنے ملک سے ایک بیرونی طاقت کے غلبہ تسلط کو بہر حال ختم کرنا چاہتا تھا۔کتاب میں ایک مفصّل مقدمہ کے علاوہ درجہ ذیل چھ ابواب ہیں:

۱۔ History of the Non-Co-operation and Khilafat Movements in Delhi

۲۔ The Khilafat Movement in the United Provinces (1919-1924)

۳۔ History of the Non-Co-operation and Khilafat Movement in the Central Province and Berar

۴۔ History of the Non-Co-operation and Khilafat Movements in Bengal

۵۔ Sindh C.I.D. Reports for 1921

۶۔ History of the Non-Co-operation and Khilafat Movements in the North-West Frontier Province

پروفیسر مشیرالحسن ایک صاحب نظر مورخ ہیں۔ آپ نے خاص طور پر انیسویں اور بیسویں صدی کے ہندوستان کی تاریخ پر گرانقدر تحقیقی کام کیا ہے۔ یہ کتاب بھی انیسویں اور بیسویں صدی میں ہندوستان میں عدم تعاون اور خلافت تحریکوں کی ایک بنیادی تاریخ ہے جو ایک مأخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ دونوں ہندوستان کی مشہور اور بہت موثر تحریکیں رہی ہیں۔ ہندوستان کے تقریباً تمام ہی بڑی سیاسی اور مذہبی شخصیتیں ان سے وابستہ تھیں۔ اس کتاب سے پہلی بار پتہ چلتا ہے کہ بڑے چھوٹے شہروں، قصبوں اورحتیٰ کہ دیہاتوں میں بھی ان تحریکوں سے وابستہ ایسے فعال حضرات تھے جنھیں تاریخ نے بھلا دیا تھا لیکن زیرتبصرہ کتاب نے بڑی تعداد میں ایسے رہنماؤں کے نام اور ان کے کارناموں کو آئندہ نسل کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ کتاب میں شامل اسناد و مدارک سے پتا چلتا ہے کہ سارے ہندوستان میں ان تحریکوں سے وابستہ سرفروشوں نے انہیں کامیاب بنانے کے لیے کیا طریقے اپنائے، کس قسم کی قربانیاں دیں اور دوسروں کو اپنی کوششوں سے جوڑنے کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی۔ اس طرح اس کتاب سے قاری کو دونوں تحریکوں سے متعلق غالباً پہلی بار ایسی اطلاعات حاصل ہوتی ہیں جو اس سے قبل دستیاب نہیں تھیں۔ مرتبین نے کتاب کے آخر میں بعض ایسے اشخاص کے احوال بھی لکھے ہیں جو ان تحریکوں سے وابستہ تھے اور جن کا ذکر اسناد ومدارک میں ملتا ہے۔ یہ احوال نہایت اجمالی ہیں کیونکہ غالبًا مرتبین اختصار سے کام لینا چاہتے تھے، جس کی وجہ سے بعض اشخاص کے بارے میں کچھ اہم اطلاعات بھی درج ہونے سے رہ گئی ہیں۔

یہ کتاب عدم تعاون اور خلافت تحریکوں کے گوناگوں پہلوؤں کو سمجھنے اور ہمارے ملک کی جنگ آزادی میں ان کی کارفرمائی کو اجاگر کرنے میں ایک بنیادی مأخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

نام : **دہلی کے مدارس و مکاتب اکیسویں صدی کے اوائل میں**
تالیف : پروفیسر محمد اختر صدیقی
صفحات : ۲۱۰
ناشر : جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۔ ۲۵

ہندوستان میں اسلامی مدارس کی ایک طویل اور شاندار تاریخ ہے۔
یہاں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ساتھ ہی مدارس قائم ہونے شروع ہوگئے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مسجد خود ایک مدرسہ ہوتی ہے، آج بھی بے شمار مساجد میں ایسے مدارس کام کر رہے ہیں جہاں ابتدائی، متوسط اور اعلیٰ تعلیم کا انتظام ہے۔ اس طرح ہر اس علاقہ میں جہاں مسلمان آباد ہوئے، وہاں مساجد میں مدارس اور الگ سے مدارس کا ایک جال ہندوستان میں پھیل گیا۔ ادھر چند برسوں سے مدارس پر خاص توجہ دی جا رہی ہے۔ اس کی ایک وجہ سیاسی بھی ہے۔ ہندوستان ہی میں کیا، ہمارے پورے برصغیر میں مدارس پر جو بے بنیاد الزامات لگائے جا رہے ہیں ان کی وجہ سے مدارس کی تاریخ لکھی جا رہی ہے، ان کے کارناموں کا خاص طور پر ہندوستان کی جنگ آزادی میں ان کے شاندار کارناموں اور ہر طرح کی سیاسی اور اقتصادی محرومیوں سے دوچار مسلمان بچوں کی تعلیم میں ان مدارس کی کارکردگی کو منظر عام پر لایا جارہا ہے۔ بعض مفکرین مدارس کے متعلق اپنی تحریروں میں، مدارس کے نصاب تعلیم میں تبدیلیوں کے بھی زبردست حامی ہیں۔ اس سلسلہ میں وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ مدارس کا نصاب تعلیم صدیوں پرانا ہے جو آج کی بدلتی دنیا کی ضرورتوں کو پورا نہیں کرتا۔ اس لئے مسلمان بچوں کو آج کی دنیا میں اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کیلئے ضروری ہے کہ نصاب تعلیم میں ردوبدل کیا جائے۔
ڈاکرمحمد اختر صدیقی صاحب نے زیر تبصرہ کتاب میں اکیسویں صدی کے اوائل میں دہلی کے مدارس کی ایک جامع تاریخ مرتب کی ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ مدارس پر بہت کچھ لکھے جانے کے باوجود سارے ہندوستان میں موجود ہزاروں مدارس و مکاتب کی اب تک کوئی مبسوط تاریخ

منظر عام پر نہیں آئی ہے ۔صدیقی صاحب نے اپنی اس کتاب میں اکیسویں صدی میں ہندوستان کی راجدھانی دہلی میں موجود مدارس کی تاریخ لکھی ہے اور یہ اپنی نوعیت کی غالباً پہلی کوشش ہے جسے سراہنا چاہیے ۔صدیقی صاحب نے موضوع سے متعلق اطلاعات حاصل کرنے کے لیے ساری دلی کا خود دورہ کیا ہے ۔ان کی مساعی کا یہ نتیجہ نکلا کہ دہلی میں درس و تدریس میں مشغول چھوٹے بڑے ۳۸۰ مکتب اور مدرسوں کی سرگرمیوں کا علم ہوگیا۔

صدیقی صاحب نے دہلی میں قدیم مدارس کا ذکر بھی کیا ہے ۔جن میں سب سے پہلا مدرسہ علاء الدین خلجی اور آخری مدرسہ غازی الدین اور رحیمیہ ہے۔

مصنف نے دہلی میں ہر مکتب فکر کے مدارس، ان کی ابتدا ،انکی تدریجی ترقی اور آزادی وطن کے بعد ان کی کیفیت وغیرہ سے بحث کی ہے۔ مدارس کی انتظامی حالت، ان کا نظام تعلیم، ان مدارس میں دستیاب مختلف سہولیتیں وغیرہ بھی کتاب میں زیر بحث آئی ہیں۔ یہ تمام کمالات بڑے سلیقہ اور مصنف کی اپنی رائے کے ہمراہ شامل کتاب ہیں۔

کتاب کے آخری باب میں ان مدارس کے جائے وقوع کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔اس وضاحت سے مدارس کی کارکردگی، ان کے نصاب تعلیم، ان کے اغراض و مقاصداور خود آج کے ماحول میں ان کی مناسبت وغیرہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

یہ کتاب دہلی کے مدارس پر مزید کام کرنے والوں کے لئے ایک مأخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں فراہم کردہ اطلاعات سے، ان مدارس کی مشکلات، ان میں مختلف نوعیت کے ایسے پہلوؤں کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو خاص طور پر ان مدارس کے ذمہ دار حضرات کی توجہ چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد اختر صدیقی نے کتاب کے آخر میں مدارس میں ہر سطح پر بہتر نتائج حاصل کرنے کے لئے جو مشورے اور تجاویز پیش کی ہیں، وہ اس موضوع پر ان کے ہمدردانہ اور منطقی طور پر غور وفکر کا نتیجہ ہیں۔ یہ مدارس و مکاتب مسلمانوں میں خاص طور پر محروم طبقہ کی جو خدمات انجام دے رہے ہیں، اس کے پیش نظر ان مدارس کے بارے میں خود حکومت کو بھی ہمدردانہ رویہ اختیار کرنا چاہیے۔

امید ہے کہ یہ کتاب دہلی کے قدیم وجدید مدارس کی مکمل و مستند تاریخ ترتیب دینے میں ایک اہم مآخذ ثابت ہوگی۔

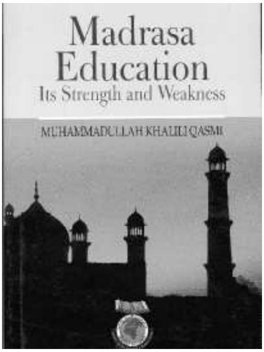

نام : **Madrasa Education -Its Strength and Weakness**

تالیف : Muhammadullah Khalili Qasmi

صفحات : ۴۶۷

ناشر : Markazul Ma'arif Education & Research Centre (MMERC), Partiksha Nagar Masjid, Patliputra Nagar, Oshiwara, New Link Road, Jogeshwari West, Mumbai - 400 102

قیمت : ۵۰۰ روپیہ

اس کتاب کی تدوین جناب محمد اللہ خلیلی قاسمی نے کی اور ممبئی سے ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی۔ کل صفحات ۲۱۲ ہیں۔ کتاب دیباچہ ، مقدمہ اور مختلف موضوعات کے تحت مدرسہ کے نظام تعلیم پر مشتمل ہے: کتاب میں کل دس ابواب ہیں: پہلا باب مدرسوں کا تاریخی خاکہ، دوسرا باب آزادی کی تحریک میں مدارس کا کردار، تیسرا باب مختلف عہد میں تعلیمی نظام ، چوتھا باب آج کے مدرسوں کا نظام تعلیم ، پانچواں باب مدرسوں کے نظام میں نئی تبدیلیوں کے سلسلہ میں سفارشات، چھٹا باب دنیاوی تعلیم اور مدارس کی تعلیم میں فرق، ساتواں باب نیا نصاب اور اس کے مسائل ، آٹھواں باب مدرسوں کی تجدید کاری ، نواں باب مدرسوں سے متعلق غلط فہمیاں اور دسواں باب مدرسوں کا زندگی کے دوسرے معاملات میں کردار۔

مولانا محمد بدرالدین اجمل القاسمی اپنے دیباچہ کو ان الفاظ میں شروع کرتے ہیں۔" افغانستان میں طالبان کی ایک قومی تحریک نے مدرسوں اور اس کے نصاب کو لوگوں کی نگاہوں کا نشانہ بنادیا ہے، لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں بلکہ ماضی میں مدارس اسی طرح کی تنقید کا نشانہ بنتے رہے ہیں۔ ، آج جن الزامات کو مدارس پر لگایا جارہا ہے وہ یہ ہیں: ۱۔ مدرسہ کا تعلیمی نظام ، عہد وسطیٰ کی روایت کا احیاء کررہا ہے ، جس کی وجہ سے مسلمان سیکولر تعلیمی نظام سے دور ہورہا ہے۔ ۲۔ مدرسہ کے تعلیمی نظام کا مرکز

مذہبی کٹر پن پر ہے۔ ۳۔مدرسہ کے تعلیمی نظام کا مرکز دینیات پر ہے اوراسے علوم معقولات سے دورکررہا ہے ۔ ۴۔مدرسہ کا نظام تعلیم، مسلمانوں کی علیحدہ پسندی کے خیالات کا احیاء کررہا ہے۔ ۵۔مدارس دہشت پسندی کی فیکٹریاں ہیں۔لیکن جن لوگوں نے مدرسہ کے تعلیمی نظام کا مطالعہ کیا ہے وہ اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ مدارس میں اسلامی علوم ، ادب اور فلسفہ کی تعلیم دی جاتی ہے ۔ آج جولوگ مدارس پر الزامات لگارہے ہیں کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ''انہیں مدارس نے جابرابن حیان ، ابوالقاسم الظہر وی ابن سینا، ابن خلدون جیسے حکماء و دانشور پیدا کئے جن کے کارناموں کی دھوم آج بھی ہے۔'' لیکن انہوں نے ایک سوال بھی اٹھایا ہے کہ آج علماء اور مسلم دانشور اس بات کوسوچیں کہ آج مدارس ایسے دانشور پیدا کرنے سے قاصر و عاجز کیوں ہیں؟ یہ سوال تحقیق طلب ہے'' لیکن انہوں نے خود اس نظام کے انحطاط کا الزام مغربی طاقتوں پر ڈالا ہے۔ قاسمی صاحب کا کہنا ہے کہ ''مغلوں کی انگریزوں کے مقابلہ میں شکست پھر یوروپین طاقتوں کے مقابلہ میں ترکی خلافت کا زوال پذیر ہونا، مدارس کے نظام تعلیم کے زوال کا سبب ہے۔ انگریزوں کے عہد میں ہماری ثقافت ، زبان اور تعلیمی نظام کو سخت نقصان پہونچا۔ انہوں نے مغربی تعلیمی نظام کو مسلمانوں پر تھوپا جسکے نتیجہ میں مسلمانوں کا اپنا تعلیمی نظام تباہی کا شکار ہوگیا۔''

مولانا بدرالدین اجمل القاسمی صاحب نے جن سوالات کو اٹھایاہے، ان میں سے کچھ کا جواب بھی دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آج مدرسے ابن سینا جیسے حکماء وفلسفی کیوں پیدانہیں کررہے ہیں؟ آٹھویں ، نویں اور دسویں صدی عیسوی میں جب مغربی طاقتوں کا وجود نہ تھا تو مسلم دنیا میں علوم معقولات کی زبردست مخالفت خود مسلمانوں نے کی اور تقلیدی فکر کوآگے بڑھانے کی بات کی۔خود ہندوستان میں دورسلطنت اورمغل عہد میں علوم معقولات اور علمائے معقولات کی مخالفت ہوئی۔ ۱۴ویں صدی سے ۱۶ صدی عیسوی تک مغربی طاقتوں کا ہندوستان میں نہ تو کوئی اثر تھا اور نہ ہی ان کا وجود تھا۔ سلطان محمد بن تغلق (1320۔1351) اورمغل بادشاہ اکبر (1556-1605) نے علوم معقولات کے احیاء کے لئے کام کیا، لیکن دونوں حکمرانوں کی مخالفت ہوئی۔ مولانا ضیاء الدین برنی نے محمد بن تغلق کی اور عبد القادر بدایونی اور شیخ احمد سرہندی نے اکبر کی مخالفت کی۔ آج بھی پاکستانی مورخین اکبر کی مختلف پالیسیوں کے خلاف لکھ رہے ہیں ۔آج ابن سینا کی کتابوں سے کتاب خانوں کوسجایا جارہا ہے اور

مسلمان اس کو دل سے لگارہے ہیں۔ کیا جب ابن سینا زندہ تھا تو اس کو چین سے بیٹھ کر کام کرنے دیا تھا؟ وہ اپنی جان بچانے کی خاطر مارا مارا پھرتا رہا۔ مولانا ضیاء الدین برنی کے مطابق ''محمود غزنوی نے کہا تھا کہ اگر ابن سینا اس کی سلطنت کی حدود میں آجائے تو وہ اس کی بوٹی بوٹی علیحدہ کرادے''۔ یہ رویہ کس چیز کی نشاندہی کرتا ہے؟ پھر مولانا قاسمی فرماتے ہیں کہ مغل حکومت کا زوال اور برٹش راج کا عروج مدرسہ کے نظام کے زوال کے سبب ہوا۔ اکبر نے علماء ومشائخ کو مدارس قائم کرنے اور لوگوں کو تعلیم دینے کے لئے مدد و معاش کے تحت زمینیں دیں تاکہ وہ پورے اطمینان سے اس تعلیمی نظام کا احیاء کرسکیں۔لیکن اکبر نے علماء کو یہ زمینیں صلاحیت کی بنیاد پر دی تھیں اور جب ایک عالم کا انتقال ہوجاتا وہ زمینیں حکومت کو واپس ہوجاتیں ۔اگر ان کا بیٹا بھی عالم ہوتا تب بعد میں وہ زمینیں بھی صلاحیت کی بنیاد پر اس کو دیدی جاتیں۔ مدد معاش کی زمین پر موروثی حقوق نہیں تھے اور اس کا مزاج عاریت کا تھا۔لیکن ۱۶۹۰ء میں اورنگزیب نے مدد معاش کی زمینوں کو عاریت سے موروثی حق میں تبدیل کردیا کہ چاہے اس عالم کا بیٹا قطعی نا اہل ہو اب وہ زمین اس کے عالم باپ کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے کو ہی ملے گی۔ جو حشر خلافت کا ہوا کہ ۶۶۱ میں معاویہ نے خلافت کو موروثی ملوکیت میں تبدیل کردیا اور اسلامی جمہوریہ کا نظام تباہ وبرباد ہوگیا یہ تو ایران میں امام خمینی نے اسلامی جمہوریہ کے تبدیل کرنے کے لئے تحریک چلائی، جس کے نتیجہ دنیا کے سامنے ہیں۔ ۱۹۷۹ء میں ایران میں شہنشاہیت کا خاتمہ اور اسلامی جمہوریہ کا قیام ممکن ہوسکا۔ ویسے تو ۲۰۰۶ ء تک بعض مسلم ممالک میں اب بھی موروثی بادشاہت موجود ہے۔تعلیمی نظام کا زوال تو اورنگزیب اور علماء کے فیصلہ مدد معاش کی زمینوں کے موروثی حق کے قیام کے بعد ہی شروع ہوگیا۔ کیونکہ ہم اپنی تاریخ اور اپنے کارناموں سے واقف نہیں، اس لئے ہر خرابی کا الزام مغربی طاقتوں پر ہی لگادیتے ہیں۔ ۶۶۱ میں جب موروثی ملوکیت مسلمانوں نے قائم کی تھی تو اس وقت مغربی طاقتوں کا وجود تک نہ تھا۔ لہٰذا مدرسہ کے تعلیمی نظام کے زوال کے ذمہ دار علماء اور اورنگزیب ہی تھے۔ انگریز حکمرانوں نے تو اس زوال پذیر تعلیمی نظام کو دفن کرنے میں مدد کی۔

جناب محمد اللہ خلیلی نے اپنے ابتدائی کلمات میں مدارس کے زوال کی ابتداء کو ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی راج کے قیام کو ٹھہرایا۔ ظاہر ہے کہ مدرسہ کے تعلیمی نظام میں مسائل تو پیدا ہوئے لیکن یہ کوئی نئے نہ تھے بلکہ یہ پہلے سے ہی موجود تھے۔ پھر انہوں نے لکھا ہے کہ اسی دور میں دیوبند میں یہ تعلیمی

درسگاہ قائم ہوئی جس نے بڑے کارنامے انجام دیئے۔ راقم الحروف دیوبند اسکول کے کارناموں کا قائل ہے، لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ انہوں نے ایک مثبت قدم ہندوستان کے تقسیم نہ ہونے کے سلسلہ میں تو اٹھایا اور پاکستان کے قیام کی مخالفت کی ،لیکن دوسری طرف انھوں نے مسلمانوں کوتقسیم کرنے کے لئے ایسے فتویٰ صادر کئے جس سے برٹش حکمرانوں کو بڑی مدد ملی کہ اب وہ ان کی بنیاد پر مسلمانوں میں تقسیم باآسانی پیدا کرسکیں گے۔ انہوں نے بھی لکھا ہے کہ طالبان تحریک کی وجہ سے مدارس بدنام ہوئے۔ اس کتاب کے باب بڑی اہمیت کے حامل ہیں اور مدارس کے تعلیمی نظام کے مختلف موضوعات پر سیرحاصل بحث کی گئی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سترھویں صدی عیسوی میں ملاعبد السلام لاہوری کے مدرسہ کے فارغ، احمد معمار نے تاج محل تعمیر کیا۔ اس طرح سترھویں صدی عیسوی کے مدارس کا تعلیمی نظام تو اس حدتک اہم تھا کہ اس کے فارغ نے تاج محل تعمیر کیامگر آج کے مدارس کے فارغ طلباء کو شاید اس کا علم بھی نہ ہو۔ اس کا مطلب ہوا کہ ہندوستان کے مدارس میں ہم مسلمانوں کے ہندوستان میں کارناموں کی تاریخ بھی نہیں پڑھاتے۔ ہندوستانی مورخین میں چاہے وہ منہاج الراج، ضیاء الدین برنی،عبدالقادر بدایونی اور ابوالفضل علامی یہ تمام علماء مدارس کے ہی فارغ التحصیل تھے۔ انہوں نے علم تاریخ کے حصول اور اس کی اہمیت پر بڑا زور دیا ہے۔ اور انہوں نے معرکۃ الآراء تاریخیں لکھی ہیں۔ ابو الفضل نے ہندوستان کا پہلا گزیٹیر تدوین کیا جس کو ہم ''آئین اکبری'' کے نام سے جانتے ہیں یہ لمحہ فکریہ ہے کہ مدرسہ کا فارغ سولہویں صدی میں گزیٹیر کی تدوین کررہا ہے اور آج کا فارغ گزیٹیر کی سمجھ میں ناواقف ہے۔ تو سوچنا یہ ہے کہ اس دور میں مدارس کا نصاب کیا تھا اور آج کیا ہے؟ اور اب ہمیں نصاب کے بارے میں غوروفکر کرنے کی ضرورت ہے۔

ثقافتی سرگرمیاں

بین الاقوامی سمینار
''صلح در ادبیات فارسی''
کلکتہ یونیورسٹی

کلکتہ یونیورسٹی کے ایک سو پچاس سالہ اور وہاں شعبہ فارسی کے ایک سو سال پورے ہونے پر ایک جشن کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقع پر ۲۰ مارچ ۲۰۰۶ء کو صبح ۱۱ بجے کلکتہ یونیورسٹی کے عربی ، فارسی ، اور سنسکرت شعبوں کی طرف سے ایک پر شکوہ جلسہ کا اہتمام کیا گیا۔ اسی مناسبت سے شعبۂ فارسی کی طرف سے ''صلح در ادبیات فارسی'' کے عنوان سے ایک سمینار کا انعقاد عمل میں آیا۔ سمینار کا افتتاحی جلسہ یونیورسٹی کے سن ٹیزی ہال میں منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں عربی، فارسی اور سنسکرت شعبوں کے صدور نے اپنے اپنے شعبوں کی مختصر تاریخ اور کارکردگی پر روشنی ڈالی۔ یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے اس جشن اور سمینار کے ذمہ دار حضرات کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ کلکتہ یونیورسٹی جس طرح سائنس اور انجینیرنگ کی تعلیم کو اہمیت دیتی ہے، اس طرح انسانی علوم بھی اس کی توجہ کا ہمیشہ سے مرکز رہے ہیں اور رہیں گے۔

اس جلسہ میں دوسرے حضرات کے علاوہ خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران ، نئی دہلی، کے مسئول محترم محمد حسین مظفری صاحب نے بھی تقریر فرمائی۔ آپ نے سب سے پہلے سمینار کے ذمہ داروں کا شکریہ ادا کیا اور سمینار منعقد کرنے پر انہیں مبارک دی اور ان کی کوششوں کو سراہا۔ آپ نے ہندوستان، ایران ، افغانستان اور وسط ایشیا کے درمیان تہذیبی رشتوں کو وسعت دینے میں کلکتہ کے اہم رول کا ذکر کیا۔ کلکتہ سے شائع ہونے والے اخبار حبل المتین کا خاص طور پر ذکر کیا جو فارسی میں شائع ہوتا تھا۔ آپ نے مزید فرمایا کہ فارسی زبان انسانی، معنوی اور تہذیبی اقدار کو رائج کرنے اور وسعت دینے کا ایک فصیح و بلیغ ذریعہ ہے، چوں کہ اس زبان کا ادب ان اقدار کا شروع ہی سے حامل رہا ہے۔

ان مراسم میں خانم کلثوم ابوالبشر، ڈھاکہ یونیورسٹی ، قاہرہ یونیورسٹی کے ایک معروف استاد اور

سفارت افغانستان سے جناب افسر رھبین نے شرکت کی۔ رھبین صاحب نے ہندوستان اور افغانستان کے قدیم تہذیبی رشتوں کا خصوصیت سے ذکر کیا۔

افتتاحی جلسہ کے بعد ITV کے ساتھ خانہ فرہنگ، نئی دہلی، کے مسئول محترم جناب مظفری نے ایک گفتگو کے دوران ایران وہند کے فارسی اساتذہ کے ایک دوسرے کے ملک آنے جانے کے سلسلہ میں معاہدوں پر روشنی ڈالی۔ آپ نے ہندوستان کے چار مختلف علاقوں میں فارسی اساتذہ اور طلبا کے لئے باز آموزی کی کلاسوں کے بارے میں وضاحت کی۔ یہ پروگرام خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران کی طرف سے باقاعدہ منعقد کیا جاتا ہے۔ آپ نے اس کے خوش آئند نتائج کا بھی ذکر کیا۔ مظفری نے ایک دوسرے سوال کے جواب میں کہ آیا امریکہ کی دھمکیاں ایرانیوں کو متاثر کررہی ہیں یا نہیں، فرمایا کہ ایرانی قوم کے عزائم اور حوصلہ آزادی، صلح وآشتی اور انسانی مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے اٹل ہیں۔ اس سلسلہ میں امریکہ کی دھمکیاں بے معنی ہیں۔

اس جلسہ کی کارروائی کلکتہ اور ہندوستان کے دوسرے ذرائع ابلاغ میں تفصیل سے شائع کی گئی ہے۔ کلکتہ کی آبادی گیارہ ملین سے زیادہ ہے۔ یہاں ۲۰۰ مساجد ہیں جن میں ٹیپو سلطان کی مسجد سب سے مشہور ہے۔ اسے ٹیپو کے لڑکے غلام محمد نے ۱۸۴۲ء میں تعمیر کرایا تھا۔ کلکتہ میں چار عظیم دانشگاہیں ہیں جن میں وشوابھارتی، شانتی نکیتن اور کلکتہ یونیورسٹی قابل ذکر ہیں۔

سمینار

طب یونانی میں مہارت وفروغ کے لئے فارسی زبان میں مہارت کی ضرورت

شیخ الجامعہ کا خطاب

عثمانیہ یونیورسٹی ،حیدر آباد

۱۵ر فروری ۲۰۰۵ء کو لائق علی خاں بھون آڈیٹوریم، سالار جنگ حیدر آباد میں خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران، نئی دہلی اور آل انڈیا طبی کانفرنس کی جانب سے ایک سمینار ''ہند وایران طبی اثاثہ'' کے موضوع پر منعقد کیا گیا۔جس میں پروفیسر محمد سلیمان صدیقی ، وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد، ڈاکٹر سید احتشام حسنین ، وائس چانسلر سنٹرل یونیورسٹی آف حیدر آباد، جناب آغا حسین روش، قونصل جنرل، جمہوری اسلامی ایران، حیدرآباد، ایران سے تشریف لائے ماہر طب ڈاکٹر مہدی محقق کے علاوہ بڑی تعداد میں مختلف یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور طبیب حضرات نے شرکت کی۔

مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے ناظم سمینار اور دور درشن کے سابق ڈائریکٹر جنرل جناب عابد صدیقی نے ہندو ایران روابط پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہند و ایران کے روابط پانچ ہزار سال پرانے ہیں اور اس مدت میں ان دونوں ملکوں نے ثقافتی ، اقتصادی وطبی میدان میں مشترکہ طور پر تحقیقی کام انجام دیا ہے جس میں طب یونانی قابل ذکر ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ عصر حاضر میں بھی اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ہندوستان اور ایران کے ماہرین طب مشترکہ تحقیقی کام انجام دیں اور یہ سمینار نہ صرف اس مشترکہ تحقیقی پروگرام کی ایک کڑی ہے بلکہ یہ طب یونانی کے درخشاں مستقبل کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔

ڈاکٹر غلام یزدی، ڈپٹی ڈائریکٹر آل انڈیا طبی کانفرنس(آندھراپردیش برانچ)نے مہمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ یونانی طریقہ علاج ایران سے نکل کر کئی ممالک سے گزرتا ہوا ہندوستان پہونچا تھا اور یہاں پر اس علاج کو زبردست فروغ حاصل ہوا۔ آج بھی ہمارے ملک میں یونانی طب کا ذخیرہ موجود ہے۔ امید ہے کہ قونصل جنرل، جمہوری اسلامی ایران، حیدر آباد کی کوششوں سے ہم

ایران میں طب یونانی کا ایک بڑا مرکز قائم کرنے میں کامیاب ہوں گے اور دونوں ممالک کے ماہرین طب مل کر اس میں تحقیقی کام انجام دیں گے۔

اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر سید حسنین احتشام، وائس چانسلر سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد نے کہا کہ ہمارا دور حیاتیاتی انقلابات کا دور ہے۔ آج ہم اس دور میں زندگی بسر کر رہے ہیں جہاں کلونگ کے ذریعہ حیوان کو وجود میں لایا جارہا ہے اور یہ عمل اس بات کی جانب اشارہ کرتا ہے کہ ماڈرن میڈیسن نے کتنی ترقی کرلی ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ اس طرح کے سائنٹفک سمینار سے طب یونانی کے طلبہ کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں مدد حاصل ہوگی۔

اس طبی سمینار کو خطاب کرتے ہوئے ایران سے تشریف لائے ماہر طب یونانی پروفیسر مہدی محقق جو ایران کے ایک نامور دانشور، مصنف، محقق بھی ہیں، نے اپنی تقریر میں طب یونانی کی تاریخ پر روشنی ڈالتے ہوئے ایران کے شہرہ آفاق فلاسفر ابوعلی سینا اور ذکریا رازی کو طب یونانی کا فاؤنڈر بتایا۔ ڈاکٹر محقق نے کہا کہ اگرچہ طب کے میدان میں بقراط اور جالینوس کی خدمات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس میدان میں ظہور اسلام کے بعد زیادہ ترقی ہوئی ہے اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ایران اور ہندوستان نے طب یونانی میں قابل ذکر کارنامے انجام دئے ہیں۔

حیدرآباد میں اسلامی جمہوریہ ایران کے قونصل جنرل جناب حسین روش نے اپنی تقریر میں کہا کہ انیسویں صدی تک ایران میں طب یونانی کا دبدبہ رہا ہے لیکن ۱۹ ویں صدی کے بعد ماڈرن میڈیسن کے وجود میں آنے کے بعد وہاں کے لوگوں کا زیادہ تر جھکاؤ جدید میڈیسن کی جانب ہے مگر اس کے باوجود ایران میں آج بھی اس طب کہنہ سے لوگ فائدہ اٹھارہے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ آج ایران میں تقریباً ۷۵۰۰ اقسام کی جڑی بوٹیاں ۶۰ ہزار ہیکٹر کی زمین پر پیدا کی جاتی ہیں جس سے ایران میں اس طب کے مقبولیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہم آج بھی ہندوستانی طب کہنہ پر ایران کے اثرات کا بھرپور مشاہدہ کرسکتے ہیں جس کی دلیل اس حکمت سے متعلق فارسی کتابیں ہیں۔

پروفیسر محمد سلیمان صدیقی، وائس چانسلر، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے ہندو ایران طبی اثاثہ کے فروغ کے لئے فارسی زبان میں ڈپلوما کورس برائے میڈیسن اینڈ فارماسیوٹیکل

شروع کرنے کا اعلان کیا۔ انہوں نے مزید کہا کہ طب یونانی کا کثیر ذخیرہ فارسی زبان میں موجود ہے لہٰذا اس سے استفادہ کے لئے ضروری ہے کہ ہمارے رسرچ اسکالرز فارسی زبان میں مہارت حاصل کریں۔

افتتاحیہ پروگرام کے بعد ۱۶ مقالہ نگاروں نے اپنے گرانقدر مقالے پیش کئے جن میں طب یونانی کی تاریخ ، اس میدان میں ہندو ایران کی مشترکہ تحقیق، حیدر آباد میں موجود طب یونانی کے لٹریچر، اس شعبہ میں ایرانی حکیموں کی خدمات، طب یونانی میں فارسی ادب کا حصہ وغیرہ جیسے عناوین کو موضوع تحقیق قرار دیا گیا تھا۔

علمی اجلاس کے خاتمہ کے بعد اختتامیہ جلسہ منعقد کیا گیا جس میں پروفیسر افضل محمد سابق وائس چانسلر، بی۔ آر۔ امبیڈکر آزاد یونیورسٹی، حیدرآباد، مسٹر جی آرگرگ کمیشنر (آئی اے ایس) ، جناب ظہیرالدین ایڈیٹر روزنامہ سیاست، حیدر آباد، احمد علی، ڈائریکٹر سالارِ جنگ موزیم، حیدر آباد، جناب حسین روش ،قونصل جنزل جمہوری اسلامی ایران حیدر آباد کے علاوہ ایران سے تشریف لائے مہمان خاص اور ماہر طب یونانی ڈاکٹر محقق نے اس سائنٹفک سمینار کی اہمیت اور افادیت پر اظہار خیال فرمایا اورانہوں نے یہ مشورہ دیا کہ اس میدان میں ہندو ایران کے ماہرین طب یونانی ملکر تحقیق کریں۔

قونصل جنزل اسلامی ایران حیدر آباد نے اس بات کا اعلان کیا کہ وہ بہت جلد حیدر آباد میں واقع طب یونانی کے اسپتال میں فارسی کی کلاسیز کا انعقاد کریں گے تا کہ طب یونانی کے اسکالرز اپنی فارسی کو مزید بہتر کرسکیں اور اپنے اسپتال کے کتابچہ میں موجود طب یونانی سے وابستہ فارسی کی کتابوں سے بھرپور استفادہ کرسکیں۔

پانچ روزہ بین الاقوامی سمینار

''حضرت امیر خسرو دہلوی''

جامعہ ملیہ اسلامیہ

حضرت امیر خسرو دہلوی پر شعبہ فارسی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی اور انجمن پژوھشگران فارسی کے اشتراک سے پانچ روزہ بین الاقوامی سمینار ۲۵ تا ۲۹ مارچ، ۲۰۰۶ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں منعقد ہوا۔ سمینار میں ایران، افغانستان، برطانیہ، بنگلہ دیش، پاکستان، امریکہ اور ہندوستان سے بڑی تعداد میں خسرو شناسوں نے شرکت کی۔ خوشی کی بات ہے کہ اس سمینار میں صرف ایران سے تقریباً پچاس اساتذہ شریک ہوئے اور ایران کے نائب صدر جمہوریہ نے بھی اس سمینار کو اپنی شرکت سے رونق بخشی۔

سمینار کا افتتاحی جلسہ ۲۵ مارچ کو ظہر کے بعد ڈاکٹر انصاری ہال، جامعہ ملیہ میں منعقد کیا گیا۔ اس جلسہ میں ہندوستان میں ایرانی سفیر جناب زرگر یعقوبی، ایران کے نائب صدر جمہوریہ، جناب مثالیٔ صاحب، جامعہ ملیہ کے سابق وائس چانسلر، سید ظہور قاسم، ایران کے استاد اور دانشور جناب ڈاکٹر محقق اقوام متحدہ میں افغانستان کے نمائندہ جناب ڈاکٹر ردان، افغانستان کے نائب وزیر فرہنگ سید فاضل، ایران کے معروف شاعر جناب علی معلم، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر پروفیسر مشیر الحسن اور انڈین کاؤنسل فار کلچرل ریلیشنز کے صدر جناب ڈاکٹر کرن سنگھ نے شرکت کی۔ امیر خسرو سے محبت کرنے والوں کی کثیر تعداد ہال میں موجود تھی۔

جلسہ کی ابتدا تلاوت کلام پاک سے ہوئی۔ سمینار کے ڈائریکٹر پروفیسر قمر غفار نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ انہوں نے کہا کہ دہلی کئی بار اجڑی لیکن اس کی رونق میں کبھی فرق نہیں آیا۔ دہلی کو بائیس خواجاؤں کی چوکھٹ کہا جاتا ہے۔ امیر خسرو ان میں سے ایک ہیں۔ یہ شاعروں، ادیبوں اور عرفا کا شہر ہے۔ امیر خسرو صرف شاعر نہیں تھے، وہ ادیب بھی تھے، عارف بھی اور موسیقی داں بھی۔

ڈاکٹر کرن سنگھ نے کہا کہ ایران وہند کے لوگ ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے دونوں کی تہذیبوں میں بہت سے عناصر مشترک ہیں۔ یہ تہذیبی اشتراک اس حد تک گہرا ہے کہ

کشمیر کو ایران صغیر کہا جاتا ہے ۔ امیر خسرو ہندوستان کے ایک عظیم شاعر ہیں۔ یہ محض ایک شاعر ہی نہیں بلکہ انہیں موسیقی داں ہونے کا امتیاز بھی حاصل ہے۔ یہ طوطی ہند ہیں اور ان کا کلام دلوں کو متاثر کرتا ہے۔

ڈاکٹر مہدی محقق نے انگریزی میں اپنی تقریر میں کہا کہ خسرو کی شخصیت میں بڑی گہرائی ہے۔ وہ متعدد کتابوں کے مصنف اور امیر حسن علاسجزی کے دوست ہیں۔ وہ جس ماحول میں پروان چڑھے، وہ اسلامی ماحول تھا۔ اسلام نے علم وتمدن کے دروازے سب پر کھول دئے ہیں، یہ علم ہندوؤں کا ہو، بودھوں کا یا مسلمانوں کا۔ ہندوستان میں تصوف فارسی زبان کے ذریعہ پہنچا اور پھر شیخ فرید الدین گنج شکر اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء جیسے عظیم صوفیا نے اسے ملک کے گوشہ گوشہ میں متعارف کرادیا۔ امیر خسرو کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ وہ قرآن وحدیث کے سایہ میں لکھتے تھے۔ بعض مقامات پر ان کا کلام قرآن کریم کی آیات اور احادیث نبوی کا عیناً ترجمہ نظر آتا ہے۔

آقای مشائی نے پہلے صدر جمہوریہ اسلامی ایران کے صدر محترم جناب ڈاکٹر احمدی نژاد کا پیغام پڑھا جس میں ہندو ایران کے ایک ہی نسل سے ہونے کا ذکر تھا۔ اس کے بعد امیر خسرو، مولانا روم اور نظامی کے کلام کا تقابلی مطالعہ پیش کیا اور وضاحت فرمائی کہ یہ نابغۂ روزگار ہستیاں ہم زبان بھی تھیں اور ایک ہی تہذیب وتمدن سے ان کا تعلق تھا۔

جمہوری اسلامی ایران کے صدر محترم کا پیغام پڑھنے کے بعد آقای مشائی نے اپنے علمی مقالہ میں جو عالمانہ انداز اور دلنشین زبان میں لکھا گیا تھا، امیر خسرو ، مولانا روم اور دیگر ایرانی شعرا وعلماء کے کلام میں ہم آہنگی کا ذکر کیا۔ آپ نے امیر خسرو سمینار کے منعقد کرنے والوں کی کوششوں کی تعریف کی۔ آپ نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں نہاد ریاست جمہوری اسلامی ایران کی مشارکت سے مستقبل نزدیک میں ''مرکز ایران شناسی'' قائم کرنے کی خوشخبری بھی دی۔

ڈاکٹر روان فرہادی نے اپنی فارسی اور انگریزی تقریر میں امیر خسرو کو ایران ، افغانستان اور ہندوستان میں ایک استاد وہیرو کے طور پر پہچانے جانے کا ذکر کیا۔ امیر خسرو حضرت نظام الدین اولیاء جیسے عارف کامل سے وابستہ اور درویشی کے راستہ پر چلتے رہے۔ خسرو نے فارسی کے معروف شعراء سنائی۔ خاقانی، نظامی اور سعدی کی پیروی کی ہے۔ خسرو نے نظامی گنجوی کے تتبع میں پانچ مثنویاں بھی نظم کی ہیں جو نہایت دلکش ہیں۔

عالی جناب زرگر یعقوبی نے اظہار تشکر کے بعد، حاضرین کو ایرانی سال نو کی مبارک باد پیش کی اور فرمایا:

امیر خسرو ہندوستان کے سب سے عظیم فارسی شاعر ہیں اور' طوطی ہند' ان کا لقب ہے جس کے وہ حقدار ہیں۔ ان کی حیثیت فارسی شاعری کی عظیم روایات، ایرانی تہذیب اور ہندوستان کی قدیم وعظیم تہذیب کے درمیان ایک مضبوط رشتہ کی ہے۔ اس طرح کے سمینار ہندوستان اور ایران کے درمیان نہایت قدیم وعلمی وادبی اور تہذیبی رشتوں کو مزید مستحکم بنانے میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

افغانستان کے آقای سید حسن فاضل نے بتایا کہ خسرو کو افغانستان میں بلخی سمجھا جاتا ہے۔ امیر خسرو نے ہندوستان اور افغانستان کے رشتوں کو استوار کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہم خسرو کو صرف ایک شاعر نہیں سمجھتے، بلکہ وہ ایک موسیقی داں بھی تھے۔ انہیں انشا نویسی میں بھی مہارت تھی جس کا ثبوت ان کی کتاب رسائل الاعجاز ہے۔

ایرانی شاعر آقای علی معلم نے ایران وہند کے ادبی وتہذیبی رشتوں کے بارے میں ایک طویل قصیدہ پڑھا جسے حاضرین نے بہت پسند کیا۔ آخر میں پروفیسر شریف حسین قاسمی، صدر انجمن پژوھشگران فارسی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور امیر خسرو بین الاقوامی سمینار کی غرض وغایت اور اہمیت پر اجمالی روشنی ڈالی۔ یہ جلسہ شام ساڑھے سات بجے اختتام کو پہنچا اور مہمانان گرامی رات کے کھانہ اور غزل خوانی کے پروگرام میں شرکت کے لئے خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران روانہ ہوگئے۔

امیر خسرو سمینار میں ۲۰ علمی جلسے منعقد ہوئے جن میں تقریباً ۶۰ ساٹھ علمی اور ادبی مقالات پڑھے گئے اور ان پر بحث بھی ہوئی۔ اس سمینار کا اختتامی جلسہ ۲۸ فروری کو ساڑھے پانچ بجے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں منعقد ہوا۔ اس میں رایزن فرہنگی جمہوری اسلامی، ایران جناب شفیعی شکیب، محترم شاہد مہدی، سابق وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ، جناب حسن فاضل، افغانستان، پروفیسر مہدی مظاہری، پرووائس چانسلر دانشگاہ آزاد اسلامی ایران، اور جناب سید حامد، چانسلر جامعہ ہمدرد، دکتر ہادی کیا سری، صدر انجمن ادبی ایران نے مہمانان خصوصی کے طور پر شرکت کی۔

جناب شفیعی شکیب نے بہار کی تعریف میں امیر خسرو کے ایک شعر سے اپنی تقریر شروع کی اور کہا کہ اس سمینار کا مقصد ایک ہندوستانی شخصیت کی قدردانی، اور اس کے ہنر وفن کو خراج عقیدت پیش

کرنا ہے۔ امیر خسرو حقیقت میں ہندوستان کے سب سے عظیم شاعر اور موسیقی داں ہیں اور ان کو بجاطور پر' سعدی ہند' اور' طوطی ہند' کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس طرح کے اجتماعات ساری دنیا خاص طور پر ایران، ہندوستان اور افغانستان اور ان علاقوں میں جہاں فارسی بولی اور سمجھی جاتی ہے، آپسی یگانگت اور مہر ومحبت کا باعث ہوتے ہیں۔ ان سے تہذیبی روابط میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور وہ مستحکم تر ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں مسلمان ۱۰۰۰ سال سے زیادہ عرصہ سے موجود ہیں اور ۸۰۰ سال تک یہاں فارسی زبان کا دور دورہ رہا ہے۔ اس طویل مدت میں فارسی زبان میں بے شمار کتابیں مختلف موضوعات پر لکھی گئیں ہیں جن میں سے بہت سی آج مطبوعہ اور غیر مطبوعہ شکل میں موجود ہیں۔ یہ ہمارا تہذیبی ورثہ ہیں۔ ان کی حفاظت ہمارا فرض اور ان کو آیندہ نسلوں تک پہنچانا ہمارا اہم کام ہے۔ ہندوستان میں فارسی کا زوال باعث فکر ہے۔ محققین اور فارسی اساتذہ اس امر پر زیادہ توجہ دیں کہ فارسی کا یہاں احیاء ہو۔ میں فارسی زبان وادب کی ترویج واشاعت کے لئے کام کرنے والوں کو یہ خوشخبری دینا چاہتاہوں کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد، خانہ فرہنگ ایران اور روابط فرہنگی ایران وہند کے پچاس سالہ جشن کے موقع پر زبان وادب فارسی کے تین ہندوستانی پاسداروں کو' جائزہ سعدی' پیش کیا جائے گا جو بعد میں بھی ہر سال دیا جاتا رہے گا۔ اپنی تقریر کے آخر میں آقای شکیب نے رسول اکرمؐ کی یوم رحلت کی مناسبت سے امیر خسرو کی نعت پیش کی۔

شاہد مہدی صاحب نے اس موقع پر کہا کہ خسرو صرف ان ممالک ہی میں نہیں جانے پہچانے جاتے ہیں اور معروف ہیں جہاں فارسی بولی اور سمجھی جاتی ہے جیسے ہندوستان ، ایران ، افغانستان ، پاکستان اور تاجکستان وغیرہ اور جہاں تہذیبیں بھی مشترک ہیں، بلکہ وہ ساری دنیا میں ایک زبان داں شاعر اور موسیقی کے ماہر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ آپ نے جامعہ ملیہ میں شعبہ مطالعات ایرانی کے قائم کیے جانے کا استقبال کیا۔

جناب ہادی سعیدی کیا سری نے کہا کہ اہل فن یہ مانتے ہیں کہ زبان ادب کی جلوہ گاہ ہے اور ادبیات شاعری سے زندہ رہتی ہے۔ ہم ہم زبان ہیں اور اس وجہ سے ایک ہی خانوادہ سے ہمارا تعلق ہے۔ ہماری زبان ہماری شاعری کی ممنون ہے اور ہم شاعری کے لطف آگین سحر سے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ امیر خسرو جیسے افراد کی زندگی پہلو دار ہوا کرتی ہے۔ امیر خسرو اپنی شاعری اور موسیقی کی وجہ سے منفرد شخصیت کے حامل ہیں۔

جناب حسن فاضل نے کہا کہ سمینار کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس میں جو مقالات پڑھے گئے ان میں خسرو کی زندگی اور کلام کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ہم افغانستان میں ۳۰ سال تک جنگ کا شکار رہے اور اب آہستہ آہستہ اس حالت سے باہر آرہے ہیں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اب سمیناروں اور کانفرنسوں کے انعقاد میں آپ سب کا ساتھ دیں گے۔ اس قسم کا ایک سمینار ہم بلخ میں کرنا چاہتے ہیں۔ امیر خسرو کا کلام پانچ ملکوں کے درمیان ایک پل اور رابطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر مظاہری نے فرمایا: دنیا اس وقت داستان نگاری کی طرف متوجہ ہے اور تہذیبی نقطہ نظر سے گفتگو کرنا اب حکومتوں کا کام بن کر رہ گیا ہے۔ میں یگانگت کی بات کرنا چاہتا ہوں ۔ ہندوایران کی تہذیب ایک ہے اس وجہ سے ان ملکوں میں گہرے روابط موجود ہیں۔ ہند اور ایران کے عارفانہ افکار کی دوسری مثال ملنی مشکل ہے۔ امیر خسرو ایک معروف شاعر ادیب اور موسیقی داں ہیں ان کی شخصیت کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ۔

جناب سید حامد نے اپنی تقریر میں کہا : خسرو کو ساری دنیا ایک شاعر اور موسیقی داں کی حیثیت سے جانتی ہے ۔ وہ فارسی کے شاعر تھے اور فارسی کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے بغیر اردو نہیں آتی۔ خسرو اس سرزمین میں فارسی کے محافظ ہیں۔ آپ نے اپنی تقریر خسرو اور غالب دہلوی کے نعتیہ کلام پر ختم کی۔

آخر میں پروفیسر قمر غفار نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد تمام مہمان رات کے کھانہ کے لئے سفارت افغانستان تشریف لے گئے اور اگلے دن ۲۹ ر فروری کو مہمانوں کو فتح پور سیکری اور تاج محل دکھانے کے لئے بسوں سے آگرہ لے جایا گیا۔

سہ روزہ بین الاقوامی سمینار

''طنز درادبیات فارسی''

دہلی یونیورسٹی

''طنز درادبیات فارسی'' کے موضوع پر شعبہ فارسی، دہلی یونیورسٹی میں ۱۴،۱۵ اور ۱۶ فروری، ۲۰۰۶ء کو ایک بین الاقوامی سمینار منعقد کیا گیا۔اس کا افتتاحی جلسہ ۱۴ فروری صبح ۱۱ بجے دہلی یونیورسٹی کے ٹیگور ہال میں قرآن الحکیم کی چند آیات کی تلاوت سے شروع ہوا۔ اس میں ایران ، افغانستان اور ہندوستان سے متعدد علمی اور ادبی شخصیتوں نے شرکت کی۔ دہلی یونیورسٹی کے مختلف شعبوں سے اساتذہ اور طلبا بھی کثیر تعداد میں شامل تھے۔ افتتاحی اجلاس میں سب سے پہلے فارسی شعبہ کی صدر پروفیسر نرگس جہاں نے حاضرین کا استقبال کیا اور شعبہ کا ایک اجمالی تعارف کرایا۔ اس جلسہ کی صدارت دہلی میں جمہوری اسلامی ایران کے رایزن فرہنگی جناب شفیعی شکیب نے فرمائی۔ جناب سید حامد صاحب چانسلر جامعہ ہمدرد جلسہ میں مہمان خصوصی کے طور پر شریک ہوئے۔ دہلی یونیورسٹی میں آرٹس فیکلٹی کی ڈین پروفیسر پانتا، نے بھی اس میں شرکت کی۔

جناب سید حامد صاحب کا فارسی زبان وادب سے گہرا تعلق ہے۔ آپ نے اسی زبان میں ایم ۔اے کیا تھا۔ آپ نے اپنی تقریر میں فارسی زبان اور اس کے ادب سے اپنے ۵۵ سال پرانے تعلق خاطر کا ذکر کیا اور فارسی زبان میں جو طنز ومزاح کے موضوع پر نظم ونثر میں لکھا گیا ہے اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ آپ نے سعدی ، حافظ ، خاقانی،ظہیر فاریابی اور غالب کے کلام میں طنز ومزاح کے عناصر کی نشاندہی کی۔

ہندوستان میں افغانستان کے رایزن فرہنگی، جناب افسر رہبین ، ایک معروف شاعر ہیں۔ آپ نے اپنی تقریر میں بتایا کہ فارسی میں جو ادب تخلیق ہوا ہے اس میں کسی نہ کسی حد تک طنزومزاح موجود ہے۔ ملانصرالدین کے لطایف ، گلستان سعدی کی بعض حکایات، اسرار توحید اور کلیلہ ودمنہ وغیرہ میں طنز بھی ہے اور مزاح بھی۔

شیراز یونیورسٹی کے معروف استاد اور محقق جناب ڈاکٹر منصور فسائی نے اس سمینار کو ہندوستان وایران کے درمیان ادبی تعلقات کے مزید استحکام کے لئے سنگ میل قرار دیا۔ آپ کے بقول طنز حالانکہ بڑا تلخ ہوتا ہے لیکن بہت شیریں انداز میں بیان کیا جاتا ہے تا کہ سننے اور پڑھنے والا اس سے بدحظ ہونے کے بجائے، لطف اندوز ہو۔

پروفیسر پانتا نے کہا کہ وہ فارسی زبان وادب سے زیادہ واقف نہیں ہیں لیکن انہوں نے سنا ہے کہ فارسی ایک شیریں زبان ہے اور میرے لیے باعث مسرت ہے کہ میں اس سمینار میں شرکت کررہی ہوں۔

پروفیسر ایمرٹیس، سید امیر حسن عابدی صاحب نے فارسی کے دو طنز یہ اشعار پڑھے اور فرمایا کہ ہندوستانی فارسی شعرا نے بھی کثرت سے طنزیہ شاعری کی ہے، یہاں تک ڈاکٹر معین نے اپنی فرہنگ میں طنز کی وضاحت کے ضمن میں ایک ہندوستانی فارسی شاعر کا شعر نقل کیا ہے۔

جناب شفیعی شکیب صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں اس سمینار کی تشکیل پر مبارک بادی اور طنز کے فلسفیانہ پہلو پر مفصل اور عالمانہ تبصرہ فرمایا۔ افلاطون اور ارسطو کے طنز کی حقیقت پر عقاید کی وضاحت کی اور بتایا کہ طنز اصل میں اصلاح معاشرہ کے لئے ایک موثر طریقہ کار ہے۔ طنز لکھنے والوں کا بنیادی مقصد یہ ہونا چاہیے انہیں چاہیۓ کہ وہ اپنے سماج کی سیاسی، سماجی اور حتیٰ دینی زندگی میں بے راہ رویوں کی اصلاح پر نظر رکھیں اور انہیں دور کرنے کی کوشش کریں۔ اس طرح طنز و مزاح کے ہرگز یہ معنی نہیں کہ دوسروں کے دینی اور اخلاقی عقاید کی توہین کی جائے۔ کوئی بھی حقیقی طنز پرداز ایسا نہیں کرتا۔ عظیم ادبا اور ہنرمندوں نے دوسروں کے دینی اور اعتقادی نظریات پر طنز سے اپنے دامن کو آلودہ نہیں کیا ہے۔ انقلاب اسلامی کی کامیابی کے بعد اوایل میں جب سلمان رشدی نے پیغمبر اسلامؐ کی ذات مقدس کے بارے میں نازیبا الفاظ استعمال کیے تو سارے عالم اسلام کی برگزیدہ ہستیوں نے اس کا سختی سے جواب دیا۔ اس کام میں غیر مسلم بھی شامل تھے۔ اسلامی انقلاب کے عظیم رہنما، حضرت امام خمینیؒ کا اس سلسلہ میں فتویٰ اپنی نوعیت کا پہلا فتویٰ نہیں تھا۔ آپ سے پہلے بعض اہل سنت علمانے بھی ایسے حالات میں ایسے فتاویٰ جاری کیے ہیں۔ حال ہی میں ڈنمارک کے ایک اخبار میں پیغمبر اسلامؐ کی مقدس شخصیت کی توہین کرنے کی جسارت کی گئی۔ اس کے خلاف بھی عالم اسلام میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ دینی امور ہمیشہ احترام کی نگاہ سے دیکھے جانے چاہییں۔

ہم ہندوستان میں ہیں، جہاں ہندو اور مسلمان اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہندوؤں کے بعض عقاید مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہیں ان میں سے بعض مسلمانوں کی نظر میں شرک آمیز ہیں، لیکن کسی مسلمان نے یہ جسارت نہیں کی کہ وہ ہندوؤں کے ایسے عقاید کے بارے میں توہین آمیز رویہ اختیار کرے۔ کسی مسلمان کو یہ حق نہیں کہ جب وہ ہندوؤں کے مندر میں داخل ہو تو وہاں موجود بتوں کی بے حرمتی کرے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ مسلمان ہندوؤں کے ان اعتقادات کو قبول کرتے ہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اعتقادات اور دوسروں کے اعتقادات کو برداشت کرنے کے درمیان ایک حدفاصل کھینچ دی گئی ہے۔ کسی لکھنے والے یا ہنرمند کو یہ حق نہیں کہ وہ دوسروں کے مذہبی مقدسات پر طنز کرے۔ یہ اظہار خیال کی آزادی نہیں۔

افتتاحی جلسہ کے آخر میں پروفیسر شریف حسین قاسمی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور اس سمینار کی اہمیت اور دور حاضر میں اس کی مناسبت پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ یہ جلسہ دوپہر ڈیڑھ بجے ختم ہوا جس کے بعد حاضرین کی ماحضر سے تواضع کی گئی۔

سمینار کے علمی جلسوں میں ایران اور ہندوستان کی مختلف دانشگاہوں سے مدعو اساتذہ نے فارسی میں طنز ومزاح کے مختلف پہلوؤں پر اپنے مقالات پیش کیے۔ ہر مقالہ پر سیر حاصل گفتگو بھی ہوئی۔

سمینار کا اختتامی جلسہ ۱۹ فروری، ۲۰۰۶ء کو چار بجے منعقد ہوا۔ اس جلسہ کی صدارت جناب محمد حسین مظفری، مسئول خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران، نئی دہلی، نے فرمائی۔ سفارت افغانستان، نئی دہلی سے جناب ڈاکٹر عباس بصیر صاحب اور جناب آقا کافی، سفارت جمہوری اسلامی ایران نے مہمانان خصوصی کے طور پر سمینار میں شرکت کی اور اظہار خیال فرمایا۔

سب سے پہلے پروفیسر نرگس جہاں نے اپنے شعبہ کی طرف سے سب مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور سمینار کی کامیابی پر خوشی کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر چندر شیکھر نے بتایا کہ سمینار میں انگریزی، اردو اور فارسی میں بیس مقالات پیش کیے گئے جو اپنے مطالب کے لحاظ سے نہایت اہم ہیں، اور فارسی میں طنز و مزاح کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

شیراز یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر ستگار نسائی نے سمینار کو ایک کامیاب کوشش سے تعبیر کیا اور کہا کہ سمینار اس موضوع پر ایک دوسرے عظیم تر سمینار کا پیش خیمہ ثابت ہوگا تاکہ اس موضوع سے متعلق دیگر امور بھی منظر عام پر آسکیں۔

معروف ایرانی استاد جناب ڈاکٹر رادفر صاحب نے اس جلسہ میں فرمایا کہ طنز ومزاح کے موضوع پر ہندوستان میں بہت مواد موجود ہے۔ ایران میں اس موضوع پر تقریباً چالیس کتابیں اور دوسو مقالے اب تک شائع ہو چکے ہیں جن پر بعد کے سمیناروں میں توجہ دی جانی چاہئے۔ ایران کے ایک دوسرے نامور استاد، جناب ڈاکٹر حقی صاحب نے سمینار کی کامیابی پر مبارکباد دی اور کہا کہ اس سمینار کی وجہ سے مختلف ممالک سے اساتذہ دہلی یونیورسٹی میں جمع ہوئے جو فارسی زبان وادب کی مزید ترویج واشاعت کے لئے فال نیک ہے۔

ڈاکٹر بصیر صاحب نے کہا کہ طنز ومزاح عظیم فارسی ادب کا ایک حصہ ہے جس کے تعارف اور قدر وقیمت کا پتہ لگانا ہمارا فرض ہے۔سفارت جمہوری اسلامی ایران سے جناب کافی صاحب نے اپنی تقریر میں کہا کہ طنز ومزاح وہ موضوع ہے جو اکیسویں صدی میں انسانی برداری پر جو دباؤ اور بے چینی طاری ہے، اسے ختم کرسکتا ہے ۔ہمیں اپنے سماج میں طنز سے مفید کام لینا چاہئے۔ اور دنیا کو اضطرابی کیفیت سے نجات دلانے کے لئے اس کا استعمال کرنا چاہئے۔

جلسہ کے آخر میں خانۂ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران کے مسؤل محترم آقای مظفری نے ایک اہم تقریر فرمائی۔ حاضرین کا شکریہ ادا کرنے کے بعد آپ نے فارسی ادب میں طنز ومزاح کی ایک اجمالی تاریخ بیان کی۔ آپ نے فرمایا ہمیں طنز و اہانت میں فرق کرنا چاہئے۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ مغرب میں آزادی بیان کے پردہ میں دوسروں کی اہانت اور ان سے نفرت کو فروغ دیا جارہا ہے جو کسی بھی صورت میں قابل قبول نہیں۔ طنز محض مذاق وہنسی کی چیز نہیں۔ اس میں ایک حقیقت پوشیدہ ہوتی ہے۔ طنز لکھنے والا ایک تلخ حقیقت کا پتہ چلاتا ہے اور اسے بیان کرتا ہے، لیکن شیریں زبان وبیان میں، طنز ہماری اس کڑوی دوا کی طرح ہے جو میٹھے لفافہ میں بیمار کو کھلایا جاتا ہے۔ طنز لکھنے والا صرف ہنسانا نہیں چاہتا بلکہ سچ یہ ہے کہ اگر طنز میں حقیقت ہو اور وہ شیریں بیانی کے ساتھ پیش کی جائے تو پڑھنے والا خود بخود مسکرادیتا ہے۔ طنز یہ کلام کا مقصد پڑھنے والے کو ہنسانا نہیں بلکہ سماج کی اصلاح ہے۔ طنز اور لمز میں ایک امتیازی خط کھینچنا چاہئے۔ لمز یہ کلام حقیقت سے دور ہوتا ہے اور اس کا کہنے یا لکھنے والا اپنی ذاتی جہالت اور علمی تاریکی بیان کرتا ہے اور اس تاریکی سے دنیا کو تاریکی میں غرق کردینا چاہتا ہے۔ یہ سب اہانت کا ذریعہ ہے۔ سچ یہ ہے کہ ایک ہنرمند طنز نگار ایک حقیقت کا پتا لگا کر اسے طنزیہ، رزمیہ اور کبھی مرثیہ و نقاشی وغیرہ کی شکل میں پیش کرتا ہے ۔ یہ مختلف اصناف

ہنر ایک حقیقت کو ظاہر کرنے کا وسیلہ ہیں۔ اس کے برخلاف لمزنگار حقیقت کو جانے بغیر اس نفرت کا اظہار کرتا ہے جو اس کی روح میں کارفرما ہوتی ہے۔

ظالم آن قومی کہ چشمان دوختند
زآن سخن ھا عالمی را سوختند

(ظالم ہے وہ قوم جو اپنی آنکھیں بند کرلیتی ہے، حقیقت دیکھتی ہی نہیں، اور اپنی بے معنی باتوں سے دنیا کو جلادیتی ہے)

یہ کوئی ہنرمندی نہیں ۔ بے ہنر لکھنے والے سوائے جہالت اور نفرت کے کسی دوسری خصوصیت کے حامل نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اپنے وجود میں موجود نفرت اور کینہ کو دوسروں تک منتقل کرنا ہنر ہے۔ اس وجہ سے ہمیں طنز و لمز میں فرق کرنا ہوگا۔ جو کام مغرب میں ہورہا ہے، اسی نوعیت کا کام ہے ۔ وہاں نفرت اور اہانت کی ایسی آگ لگادی گئی ہے جو جلدی بجھنے والی نہیں۔ وہ دنیا جہاں کفر آمیز عقاید کا احترام کیا جائے، انسانی اور مقدس اقدار کی بے حرمتی اور اہانت قابل اعتراض ہے۔ یہ جلسہ چھ بجے اپنے اختتام کو پہنچا۔

سہ روزہ بین الاقوامی سمینار

''حدیث ہند در ادبیات فارسی''

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

''حدیث ہند در ادبیات فارسی'' کے عنوان سے شعبہ فارسی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے زیر اہتمام ایک تین روزہ بین الاقوامی سمینار کا انعقاد عمل میں آیا۔ یہ شعبہ خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران ، نئی دہلی کے تعاون سے ہر سال ایک سمینار منعقد کرتا ہے جس میں ایران ، افغانستان ، بنگلہ دیش وغیرہ سے فارسی اساتذہ شرکت کرتے ہیں۔

اس سمینار کا افتتاحی جلسہ ۱۲ فروردین، ۱۳۸۵ر مطابق ۱ اپریل ،۲۰۰۶ء کو ساڑھے دس بجے صبح شروع ہوا۔ اس میں جمہوری اسلامی ایران کے ہندوستان میں رایزن فرہنگی، جناب شفیعی شکیب نے بھی شرکت کی۔ آپ کے علاوہ اس جلسہ میں علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر، جناب نسیم احمد، UGC کے سابق صدر، پروفیسر ستیش چندر، معروف دانشور جناب ڈاکٹر شمس الرحمان فاروقی، پروفیسر ویاس اور ایران کے ڈاکٹر محمود عابدی نے بھی شرکت کی۔

سب سے پہلے پروفیسر آذر میدخت صفوی، ڈائریکٹر سمینار نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا اور لرستان میں زلزلہ سے ہونے والی تباہی پر اظہار افسوس کیا۔ آپ نے ہندوستان اور ایران کے درمیان تہذیبی رشتوں کا ذکر بھی کیا اور مزید کہا کہ ایسے جلسے ان روابط کو مزید مستحکم بنانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ میری آرزو ہے کہ ہماری اس قسم کی کوششیں ہمیں فارسی کی پہلے کی طرح خدمت کرنے کے مواقع فراہم کریں گے۔

ڈاکٹر شمس الرحمان فاروقی صاحب نے ہندوستانی اور ایرانی سماج میں مشترک عناصر کی طرف اشارہ کیا۔ آپ نے کہا کہ ہندوستانیوں نے ایران سے فارسی زبان وادب کے معاملہ میں بہت کچھ سیکھا ہے ۔عرفی شیرازی ، صایب تبریزی ، ابوطالب، کلیم کاشانی ہندوستان آئے اور جدید تراکیب

وتشبیہات اپنے ساتھ لائے ۔ ان کے بارے میں خان آرزو اور دیگر علمانے تفصیلی بحث کی ہے۔اور اقرار کیا ہے کہ ایرانی شعرا واد با زبان وادب کے میدان میں ہم سے بہتر ہیں۔ بڑی تعداد میں ایرانی یہاں آئے اور یہیں کے ہورہے ۔ انہوں نے سبک ہندی میں شاعری کی اور ہندوستانی شعرا پر اپنے گہرے اثرات چھوڑے۔

ڈاکٹر ستیش چندر نے کہا: فارسی زبان وادب نے ہندوستانی تہذیب پر قابل قدر اثرات ڈالے ہیں۔ فارسی زبان اور ایرانی تہذیب کو جانے بغیر ہندوستانی تاریخ وتہذیب کا ادراک ممکن نہیں ہے۔ ہندوستانی زبانیں مثلاً پنجابی، ہندی، بنگالی،اور اردو وغیرہ نے بڑی تعداد میں فارسی زبان کے الفاظ کو اپنایا ہے اور بہت سے ہندوستانی شاعر اور ادبا جیسے امیر خسرو، اپنی زبان سے بہتر فارسی جانتے تھے اور ان حضرات نے ہندوستان میں فارسی کی آبیاری میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔

جناب شفیعی شکیب نے ایرانی نئے سال کی مبارکباد پیش کی ۔ لرستان میں زلزلہ سے متعلق حاضرین کی ہمدردانہ جذبات کا شکریہ ادا کیا۔آپ نے کہا کہ امام حسنؑ کی شہادت اور پیغمبر اسلامؐ کا یوم رحلت ، امام رضا کی شہادت کی تاریخ اس بار ۱۳۸۵ھ ش کے شروع میں پڑے ہیں۔ یہ مسلمانوں پر خدا کی مہربانی ہے کہ وہ اسلام کی اعلیٰ تعلیمات پر توجہ دیں، پہلے سے زیادہ۔ فارسی ہندوستان میں صرف سرکاری زبان نہیں رہی بلکہ یہ علمی ، تاریخی و دینی اور شعرو شاعری اور عرفان وتصوف کی زبان بھی رہی ہے۔اور ایرانی وہندی تہذیبوں کو ہم آہنگ کرنے کا ایک عامل ووسیلہ بھی رہی ہے۔

فارسی زبان اس ملک کے دانشمندوں کی زبان تھی ، اسے ہمیں دوبارہ سے عام کرنا چاہئے۔ ڈاکٹر کرن سنگھ نے امیر خسرو سمینار کے افتتاحی جلسہ میں کہا تھا کہ تصوف عشق کی آواز ہے۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ صرف تصوف ہی نہیں بلکہ فارسی زبان بھی عشق ومحبت اور انسانوں کے انسانوں سے رشتوں کو مستحکم تر کرنے کی زبان ہے۔ اس میں پاک اور نورانی دل سے نکلنے والے افکار پیش کیے گئے ہیں۔ آپ نے مولانا روم کی مثنوی میں رومیوں اور چینیوں کی داستان کی طرف اشارہ کیا اور کہا کہ ایرانیوں اور ہندوستانیوں نے اپنے دلوں کو ایک دوسرے کے سامنے رکھ کر انہیں آئینہ کی طرح جلادی ہے تاکہ وہ ایک دوسرے کی روحانی عظمتوں کا نظارہ کرسکیں۔ دونوں تہذیبیں کہیں بھی ایک دوسرے سے متصادم نہیں چوں کہ تہذیبیں انسان کی روح اور جان سے جنم لیتی ہیں۔ ایرانیوں نے اپنی مذہبی

تہذیب پیغمبر اسلامؐ سے، جو سارے عالم کے لئے باعث فخر ہیں، اخذ کی ہے: اسے انہوں نے براہ راست عربوں اور عظیم مسلمانوں سے حاصل کی ہے۔

پروفیسرو یاس نے کہا: دونوں ایرانی اور ہندوستانی تہذیبیں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور ایک دوسرے سے متاثر بھی ہوئی ہیں۔خود اردو فارسی سے پیدا ہوئی ہے۔ ہم یہ کوشش کرتے ہیں کہ بزم ادب فارسی اور مشاعرہ وغیرہ کا اہتمام کریں تاکہ اس کے ذریعہ سے فارسی زبان وادب کا تعارف کرائیں اور اس کو رونق بخشیں ۔ فارسی کا ہماری تہذیب میں ایک خاص مقام ہے اور اس کا جاننا انسانی عظمت سے آشنا ہونا ہے۔

پروفیسر سید امیر حسن عابدی نے فرمایا: ایران وہند کی زمین الگ الگ ہے لیکن ان کا آسمان ایک ہے اور ان کے رہنے والوں کا دل ایک ہے۔آپ نے ہندوستان میں تصوف پر فارسی میں پہلی کتاب کشف المحجوب کی تالیف کا ذکر کیا۔ فارسی کے ہر روز جوان سے جوان تر ہونے والے شاعر مولانا روم ہیں۔آپ نے بیشتر افکار ہندوستانی مفکرین سے اخذ کیے ہیں۔ دنیا کے تمام دانشمند ایک دل ، ایک زبان اور ایک فکر کے سامنے سرِتسلیم خم کردیتے ہیں۔

اسی جلسہ میں محترم شفیعی شکیب نے ایرانی پارلیمنٹ کے اسپیکر، ڈاکٹر حداد عادل کی طرف سے ۸۵۰۰ ڈالر کا ایک چیک مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر، جناب نسیم احمد کو پیش کیا۔ یہ رقم فارسی زبان کی لیب کی تیاری کے لئے دی گئی ہے ۔ حاضرین نے اس پیشکش کا پر جوش استقبال کیا اور سب نے حکومت ایران کا شکریہ ادا کیا۔حکومت ایران کا یہ ایک بڑا کارنامہ ہے جو ہندوستان میں فارسی کی ترویج ،تحفظ اور ترقی میں مددگار ثابت ہوگا۔یہ مراسم دوپہر ڈیڑھ بجے اختتام پذیر ہوئے۔